جامعہ کی ۱۰۵ویں یومِ تاسیس کے موقع پر

رسالہ جامِعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ
منزل بہ منزل

جامِعہ ملّیہ اسلامیہ کا ادبی و علمی ترجُمان

وائس چانسلرز
جامعہ ملیہ اسلامیہ

Prof. Mazhar Asif
2024-Cont.

Prof. Najma Akhtar
2019-2023

Prof. Talat Ahmad
2014-2018

Mr. Najeeb Jung
2009-2013

Prof. Mushirul Hasan
2004-2009

Mr. Syed Shahid Mahdi
2000-2004

Lt Gen (Retd) M.A. Zaki
1997-2000

Prof. Bashiruddin Ahmad
1992-1996

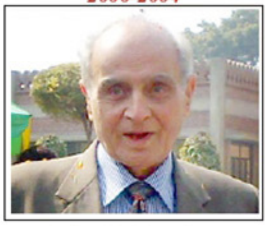

Dr. Syed Zahoor Qasim
1989-1991

Prof. Ali Ashraf
1983-1989

Mr. Anwar Jamal Kidwai
1978-1983

Prof. Masud Husain Khan
1973-1978

Prof. Mohammad Mujeeb
1948-1973

Dr. Zakir Husain
1926-1948

Abdul Majeed Khwaja
1923-1925

Maulana Mohammad Ali Johar
1920-1923

چانسلرز
جامعہ ملیہ اسلامیہ

Dr. Syedna Mufaddal Saifuddin
2024-Con.

Dr. Najma A. Heptullah
2017-2023

Lt Gen (Retd) M.A. Zaki
2012-2017

Mr. Fakhruddin T. Khorakiwala
2002-2011

Janab Khurshid Alam Khan
1995-2001

Janab S.M.H. Burney
1990-1995

Janab Khurshid Alam Khan
1985-1990

Justice Mohd. Hidayatullah
1969-1985

Dr. Zakir Husain
1963-1969

Abdul Majeed Khwaja
1936-1962

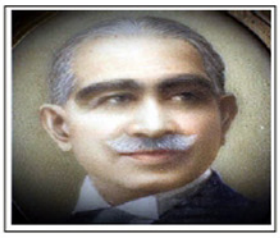

Dr. Mukhtar Ahmad Ansari
1928-1936

Hakim Ajmal Khan
1920-1927

جامعہ کی ۱۰۵ویں یومِ تاسیس کے موقع پر

رسالہ

جامعہ

خصوصی اشاعت

جامعہ ملّیہ اسلامیہ
منزل بہ منزل

مدیر اعلیٰ

پروفیسر حبیب اللہ خاں

مدیر

پروفیسر کوثر مظہری

نائب مدیر

تجمل حسین خاں

رسالہ جامعہ

Resala-e- Jamia

ISSN 2278-2095

Peer Reviewed

جلد:—۱۲۲،۱۲۳ شمارہ:—۱۰،۱۱،۱۲،۱،۲،۳ اکتوبر—دسمبر ۲۰۲۵ء تا جنوری-مارچ ۲۰۲۶ء

زرِ اشتراک

■ اس شمارے کی قیمت -/300 روپے	(بیرونِ ممالک) 12 امریکی ڈالر
■ سالانہ -/380 روپے	(بیرونِ ممالک) 40 امریکی ڈالر
■ حیاتی رکنیت -/5000 روپے	(بیرونِ ممالک) 400 امریکی ڈالر

نوشاد عالم
تصحیح وتزئین

راشد احمد
پرنٹنگ اسسٹنٹ

فیضی گرافکس
کور ڈزائن

ملنے کا پتــا: ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۔۲۵ ۱۱۰۰

Website: https://jmi.ac.in/zhiis E-mail:zhis@jmi.ac.in

طابع وناشر: اعزازی ڈائرکٹر، ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۔۲۵

مطبوعہ : لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی ۔۱۱۰۰۰۲

نوٹ: مقالہ نگاروں کی رائے سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

مجلسِ مشاورت

پروفیسر مظہر آصف (صدر)

- لیفٹیننٹ جنرل محمد احمد ذکی (ریٹائرڈ)
- سید شاہد مہدی (آئی اے ایس، ریٹائرڈ)
- نجیب جنگ (آئی اے ایس، ریٹائرڈ)
- پروفیسر طلعت احمد
- پروفیسر نجمہ اختر

مجلسِ ادارت

- پروفیسر محمد شاہد حسین
- پروفیسر محمد محفوظ خاں
- پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین
- پروفیسر ارجمند آرا
- پروفیسر جلال حفناوی (مصر)
- پروفیسر متھن کمار
- پروفیسر محمد کاظم
- ڈاکٹر محسن علی
- پروفیسر شہزاد انجم
- پروفیسر محمد سرور الہدیٰ
- پروفیسر ابوبکر عباد
- پروفیسر یوسف عامر (مصر)
- پروفیسر احمد محمد عبدالرحمٰن قاضی (مصر)
- پروفیسر محمد قطب الدین
- پروفیسر سید کلیم اصغر

جامعہ ملیہ اسلامیہ
کے
معماران

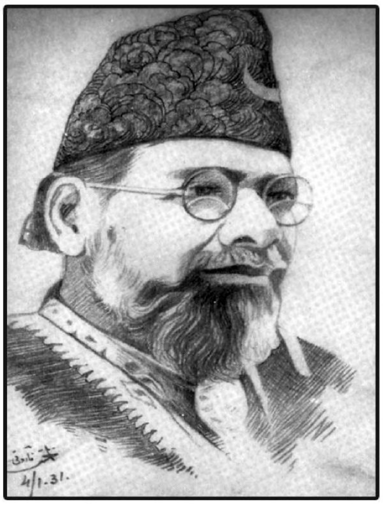

مولانا محمد علی جوہر

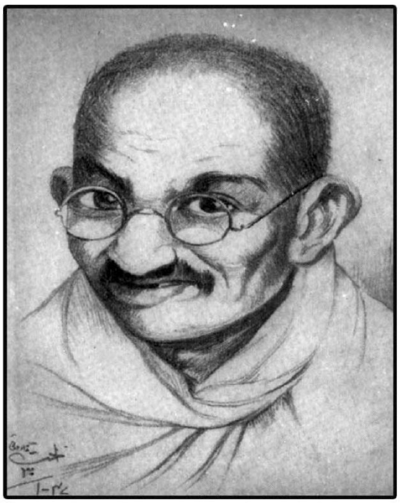

مہاتما گاندھی

حکیم اجمل خاں

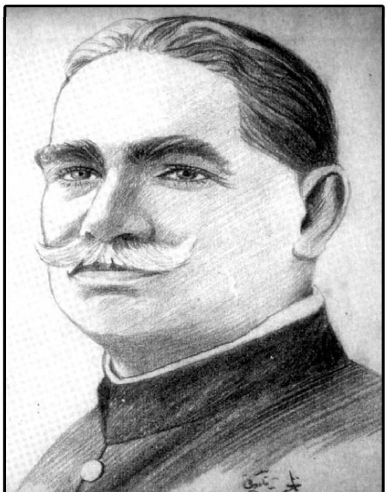

ڈاکٹر سید مختار احمد انصاری

(پنسل اسکیچ: اختر حسن فاروقی)

عبدالمجید خواجہ

سیٹھ جمنالال بجاج

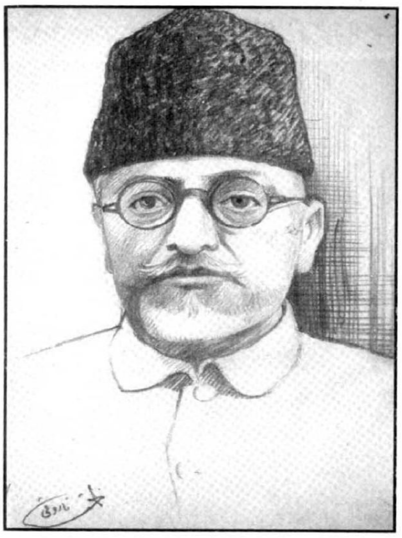

مولانا ابوالکلام آزاد

پنڈٹ جواہر لال نہرو

(پنسل اسکیچ: اختر حسن فاروقی)

جامعہ ملیہ اسلامیہ
کے
اربابِ حل وعقد

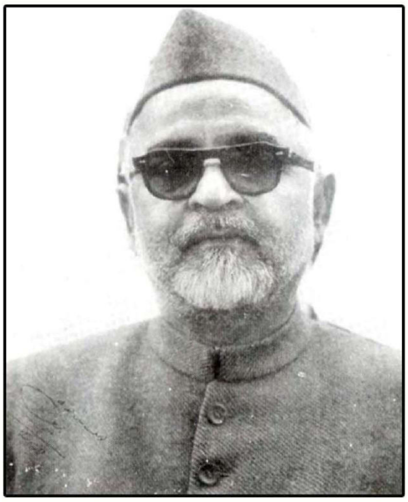

ڈاکٹر ذاکر حسین

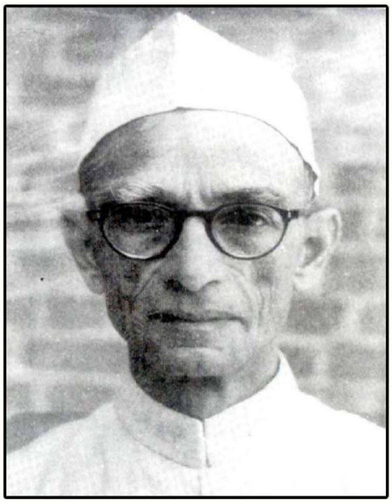

پروفیسر محمد مجیب

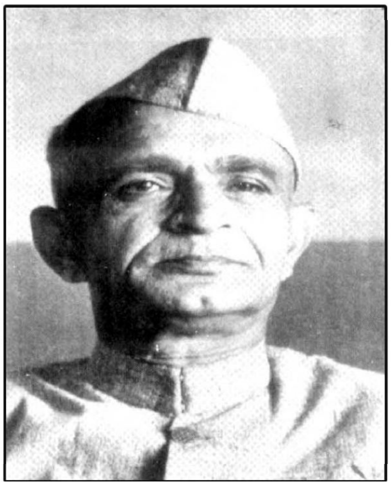

ڈاکٹر سید عابد حسین

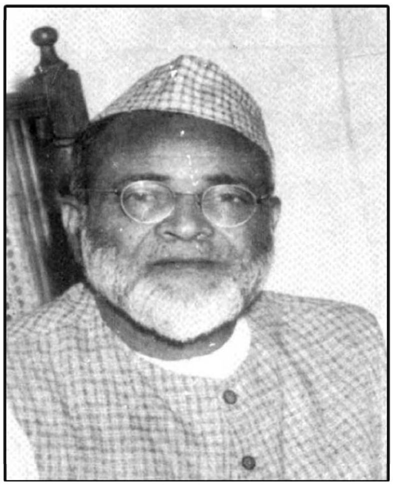

شفیق الرحمٰن قدوائی

ترتیب

○ اداریہ	پروفیسر کوثر مظہری	۱۱
○ جامعہ ملیہ اسلامیہ خطبۂ صدارت [۲۹/اکتوبر ۱۹۲۰ء]	شیخ الہند مولانا محمود حسن	۱۵
○ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا ترانہ	محمد خلیق صدیقی	۲۵
○ جامعہ ملیہ اسلامیہ کیا ہے؟	ذاکر حسین	۲۷

- جامعہ ملیہ اسلامیہ
  علی گڑھ سے دہلی تک — شیخ محمد اکرام — ۳۳

- جامعہ ملیہ اسلامیہ
  پس منظر، قیام اور ذاکر صاحب — پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی — ۴۵

- جامعہ ملیہ اسلامیہ
  کے
  بانیِ اول — مولانا عبدالماجد دریابادی — ۷۹

- جامعہ ملیہ اسلامیہ
  اور
  گاندھی جی — پروفیسر محمد مجیب، ترجمہ: ضیاء الحسن فاروقی — ۸۵

- جامعہ ملیہ اسلامیہ
  اور
  محمد علی مرحوم — ڈاکٹر قاضی عبدالحمید زبیری — ۹۳

- جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پہلے 'شیخ الجامعہ' — حنیف نقوی — ۱۰۳
- جامعہ ملیہ اسلامیہ اور محمد اقبال — عبداللطیف اعظمی — ۱۱۱
- جامعہ ملیہ اسلامیہ تعلیمی شناخت — معین الدین — ۱۲۳
- جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قدیم شعبے — غلام حیدر — ۱۳۷
- جامعہ ملیہ اسلامیہ افراد و نظریات — خالدہ ادیب خانم، ترجمہ: مسعود الحق — ۲۲۹

- جامعہ ملیہ اسلامیہ
  اہلِ شوق کی بستی — پروفیسر سید اطہر رضا بلگرامی — ۲۵۱

- جامعہ ملیہ اسلامیہ
  چند باتیں کچھ یادیں — محمد سالم قدوائی — ۲۶۵

- جامعہ ملیہ اسلامیہ
  خوش گوار یادیں — پروفیسر مجیب اشرف — ۲۹۵

- جامعہ ملیہ اسلامیہ
  ایک خاموش دیدہ ور — ڈاکٹر عرفات ظفر — ۳۱۵

◆

- شعری دریچہ — اکرم نقّاش — ۳۳۱

- یادِ ماضی کے نقش
  ایران میں چار سال — اختر حسین رائے پوری — ۳۳۹
  [قسط وار]

اداریہ

طوفان بن کے اٹھیے جہانِ خراب میں
ہستی کو اک شرارۂ رقصاں بنایئے
دوڑایئے وہ روح کہ ہر ذرہ جاگ اٹھے
اجڑے ہوئے وطن کو گلستاں بنایئے
پھر دیجیے نگاہ کو پیغامِ جستجو
منزل سے کیوں نظر کو گریزاں بنایئے

محمد علی جوہر

یہ اشعار **مولانا محمد علی جوہر** کی غزل سے ماخوذ ہیں۔ ان شعروں میں **جوہر** نے جس ذہنی وقلبی اضطراری کیفیت کو ظاہر کیا ہے، اس میں ایک پیغام بھی ہے اور سفرِ حیات پر گامزن ہونے سے پہلے نگاہِ جستجو کو تیز کرنے کا اشارہ بھی۔ یہ شاعری محض

ازروئے شعر گفتن نہیں، بلکہ انسانی زندگی کے مقصد کے حصول کی نشان دہی بھی کرتی ہے اور ہم سب جانتے ہیں کہ **محمد علی جوہر** کا مقصدِ حیات کیسا بامعنی اور درخشاں تھا۔ ان میں وطن کی بھی فکر تھی اور قوم وملت کو زبوں حالی سے باہر نکالنے کا جذبہ بھی کارفرما تھا۔

محمد علی جوہر کی قیادت میں ایک ایسا انگریز مخالف طبقہ سامنے آیا اور پھر علی گڑھ میں ایک مسلم نیشنل یونیورسٹی کے قیام کا منصوبہ بھی بن گیا۔ ہم سب جانتے ہیں کہ اس نومولود یونیورسٹی کے جلسلے کی صدارت اسیرِ مالٹا **حضرت شیخ الہند** نے فرمائی۔ ان کا خطبۂ صدارت، مفسرِ قرآن **مولانا شبیر احمد عثمانی** نے پیش کیا کہ **شیخ الہند مولانا محمود حسن** علالت سے گزررہے تھے۔ توجہ طلب بات یہ ہے کہ جب ان سے درخواست کی گئی کہ آپ کو علی گڑھ تشریف لاکر جلسے کی صدارت کرنی ہے تو انھوں نے باوجود علالت کے یہ فقرہ ادا کیا: ***''اگر میری صدارت سے انگریز کو تکلیف ہوگی تو میں ضرور شریک ہوں گا۔''*** اس فقرے میں انگریزی حکومت سے جو شدید مخالفت کی لہریں ہیں وہ محسوس کی جاسکتی ہیں۔ یہی نیشنل یونیورسٹی بعد میں **مولانا آزاد** کی تجویز پر جامعہ ملیہ اسلامیہ سے موسوم

ہوئی۔ **حضرت مولانا شیخ الہند** کو اندازہ تھا کہ یونیورسٹی کا قیام تو آسان ہے لیکن اسے خوش اسلوبی سے ترقی کی راہوں پر گامزن رکھ پانا بہت آسان نہیں ہے۔ اس لیے انھوں نے اپنے اس خطبے میں جگہ جگہ پُرخار راستے پر چلنے اور بدنی، مالی اور جانی مشکلات سے نبرد آزما ہونے کی بات بھی کی ہے۔

بہرحال، **جامعہ ملیہ اسلامیہ** وجود میں آگئی اور علی گڑھ سے دھلی منتقل ہوگئی۔ سرد وگرم ہواؤں سے گزرتے ہوئے زمانے کی خوش نوائیوں اور کج ادائیوں کا سامنا کرتے ہوئے آج جامعہ ایک ایسے چمن میں تبدیل ہوگئی ہے جس کے مختلف النوع پھولوں سے مشامِ جاں معطر ہورہا ہے۔ اور ہندوستان ہی نہیں پورے عالم میں اس کی فتوحات کی گونج سنی جارہی ہے۔

آج اس جامعہ کی باگ ڈور ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں ہے جس کی فکری اساس میں زبان، علوم وفنون اور کلچر کی شعاعیں موجزن ہیں۔ شیخ الجامعہ **پروفیسر مظہر آصف** نے جب سے **زمامِ جامعہ** اپنے ہاتھ میں لی ہے، پوری جامعہ تحرک پذیر ہوگئی ہے۔ **جامعہ برادری** میں ان کے تئیں ایک ایسا جذبۂ محبت اور برادرانہ ہم آمیزی کا رنگ پیدا ہوگیا ہے جس کی دل کشی اور دل

پذیری دیکھتے ھی بنتی ھے۔ ایسے میں آج کی جامعہ میں جو فضا سازی ہو رہی ھے اس کے دوررس مثبت نتائج نظر آرھے ھیں۔ جوش، جذبہ، لگن، خلوص یہ وہ الفاظ ھیں جو آج کی جامعہ سے پوری طرح تطابق رکھتے ھیں۔ نئی راھیں ھموار ھوتی جارھی ھیں اور رھروانِ منزل رواں دواں ھیں۔ **بھزاد لکھنوی** کا ایك شعر یاد آتا ھے:

اے جذبۂ دل گر میں چاہوں ہر چیز مقابل آجائے
منزل کے لیے دو گام چلوں اور سامنے منزل آجائے

رسالۂ جامعہ کا یہ شمارہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد سے لے کر اس کے آج تك کے سفر کو محیط ھے۔ ھر زمانے میں ضرورت ھے کہ نئی نسل کو جامعہ کی تاریخ آموختہ کی طرح یاد دلائی جائے تاکہ ھمارے اکابر اور **بانیانِ جامعہ** کی قربانیوں اور جاں فشانیوں کی ایك تصویر نوواردانِ جامعہ کے سامنے آسکے۔

تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

پروفیسر کوثر مظہری

جامعہ ملیہ اسلامیہ

خطبۂ صدارت

[۲۹/اکتوبر ۱۹۲۰ء]

شیخ الہند مولانا محمود حسن

برطانیہ نے بیسویں صدی کے شروع میں **خلافتِ عثمانیہ ترکی** کو کمزور اور پھر ختم کرنے کی خوفناک سازشیں شروع کردی تھیں، جب اس کے آثارِ بد ظاہر ہونا شروع ہوئے تو متحدہ ہندوستان میں **خلافت** کی حمایت میں **تحریکِ خلافت** اور اس کو مؤثر بنانے کے لیے **انگریزوں** کے خلاف **تحریکِ ترکِ موالات** شروع ہوئی۔ **شیخ الہند،** جون ۱۹۲۰ء میں جب مالٹا کی اسیری سے رہا ہوکر ہندوستان پہنچے تو مولانا نے اس تحریک کی حمایت میں فتویٰ دیا جو نقشِ حیات [جلد: دوم]ص: ۶۷۴ پر ہے۔ انہی ایام میں مولانا **مفتی محمد کفایت اللہ صاحب دہلوی** کی تحریک پر خلافت کمیٹی نے **شیخ الہند** کا خطاب دیا۔ اس کے بعد تو یہ مبارک لقب موصوف کی پہچان ہی بن

گیا۔سرسید کی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اُس وقت انگریزوں کی مکمل حمایت میں تھی، مگر اسی یونیورسٹی میں مولانا محمد علی جوہر اور ان کے ہم نواؤں کی قیادت میں ایک طبقہ انگریز کی غلامی سے بیزار تھا، اس نے تحریکِ خلافت میں بھرپور حصہ لیا اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی اعلیٰ قیادت سے حضرت شیخ الہند کے فتوے کی بنیاد پر تحریکِ ترکِ موالات کی حمایت کا مطالبہ کیا، مگر اس یونیورسٹی کی انتظامیہ نے اس سے انکار کر دیا، یہ اختلاف یہاں تک بڑھا کہ مولانا جوہر کی قیادت میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اس انگریز دشمن طبقے نے انگریز کے اثرات سے پاک متوازی طور پر 'مسلم نیشنل یونیورسٹی علی گڑھ' کے قیام کا فیصلہ کیا اور اس کے تاسیسی اجلاس ی صدارت کے لیے شیخ الہند کو دعوت دی۔مولانا نے باوجود علالت ونقاہت کے یہ کہہ کر دعوت قبول فرمائی: "اگر میری صدارت سے انگریز کو تکلیف ہوگی تو میں اس جلسے میں ضرور شریک ہوں گا" چنانچہ مولانا علی گڑھ تشریف لے گئے اور صدارت فرمائی۔خطبۂ صدارت موصوف کی طرف سے مولانا شبیر احمد عثمانی نے پڑھا۔شیخ الہند اس کے بعد علی گڑھ سے دھلی تشریف لے گئے اور ایک ماہ بعد دارِفانی سے کوچ کر گئے۔اس نئی مسلم نیشنل یونیورسٹی کے چانسلر حکیم محمد اجمل خاں اور وائس چانسلر مولانا محمد علی جوہر بنائے گئے، بعد میں مولانا ابوالکلام آزاد نے اس کا نام 'جامعہ ملیہ اسلامیہ' تجویز کیا اور پھر یہ اسی نام ہی سے معروف ومشہور ہوئی۔اسی مناسبت سے بہت سے مقامات پر شیخ الہند کے ذیل کے خطبۂ صدارت کی نسبت جامعہ ملیہ اسلامیہ کی

تاسیس کی طرف کردی گئی ہے۔ ۱۹۲۵ء میں یہ نئی یونیورسٹی، علی گڑھ سے دہلی منتقل ہوگئی۔ اس تفصیل کا ذکر اس لیے کیا جارہا ہے کہ علی گڑھ یونیورسٹی کا نام آتے ہی ذہن فوراً سرسید کی قایم کردہ یونیورسٹی کی جانب جاتا ہے اور ساتھ ہی یہ کہ **شیخ الہند** کی میزبان یہی **سرسید** مسلم یونیورسٹی علی گڑھ تھی، حالانکہ ایسا ہرگز نہیں، بلکہ **شیخ الہند** تو سرسید یونیورسٹی کے باغیوں کی سرپرستی اور ان کی نئی یونیورسٹی کی تاسیس کے لیے گئے تھے اور یہی لوگ **حضرت** کے میزبان تھے۔ لیکن بہرحال یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس نئی مسلم نیشنل یونیورسٹی میں **مولانا محمد علی جوہر** کے ساتھ جو طبقہ تھا وہ بھی اصلاً **سرسید** کی یونیورسٹی علی گڑھ ہی سے تھا، اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ **شیخ الہند** نے جذبۂ حریت وسیاستِ شرعیہ کے اعتبار سے دیوبند اور علی گڑھ میں سیاسی قبلہ کی وحدت پیدا کردی تھی، جس کے نتیجے میں جدید طبقے کی ایک تعداد نے تحریکِ آزادی میں بھرپور حصہ لیا اور علما کے قرب کی وجہ سے بہت سے **'مسٹر'** **'مولانا'** بن گئے۔ تفصیل: علمائے حق [جلد: اول] اور نقشِ حیات [جلد: دوم] کے آخر میں ملاحظہ کریں۔ یہ خطبۂ صدارت علمائے حق [جلد اول] ص: ۳۷۱ میں ہے۔ یہ کتاب: علمائے ہند کا شاندار ماضی' کی پانچویں وچھٹی جلد ہی علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے [حصہ: اول ودوم] سے معروف ہے۔ قارئین محسوس کریں گے کہ آج تقریباً صدی بعد بھی **شیخ الہند** کے ارشادات مخلصین کے لیے رہبر ورہنما ہیں کہ باطل کی سرکوبی اور حق کی سربلندی کے لیے اخلاص وتقویٰ کے ساتھ اجتماعیت، شجاعت وحکمت کا ہونا بھی ضروری ہے۔

○

حامدًا و مصلیاً: امابعد! جلسوں کی عام روش کا اقتضا یہ ہے کہ میں سب سے پہلے اس عزتِ صدارت پر، جو ایک نہایت ہی سرفروشانہ ایثار و شجاعانہ جدوجہد کرنے والی جماعت کی طرف سے مجھ کو مرحمت ہوئی ہے، شکر گزاری اور منت پذیری کا اظہار کروں، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ شکریہ چند وقیع اور شاندار الفاظ سے ادا نہیں ہوسکتا اور نہ مجھ کو محض رسمی اور مصنوعی ممنونیت کی نمایش اس بھاری ذمہ داری کے بوجھ سے سبکدوش کرسکتی ہے جو فی الحقیقت آپ نے اس عزت افزائی کے ضمن میں مجھ پر عائد کی ہے، دو چار پھڑ کتے ہوئے جملے بلاشبہ عارضی طور پر مجلس کو محظوظ کرسکتے ہیں، مگر میں خیال کرتا ہوں کہ میری قوم اس وقت فصاحت و بلاغت کی بھوکی نہیں ہے اور نہ اس قسم کی عارضی مسرتوں سے اس کے درد کا اصلی درماں ہوسکتا ہے۔ اس کے لیے ضرورت ہے ایک قایم و دایم جوش کی، نہایت صابرانہ ثابت قدم کی، دلیرانہ مگر عاقلانہ طریق عمل کی اور اپنے نفس پر پورا قابو پانے کی۔ غرض ایک پختہ کار بلند خیال اور ذی ہوش **محمدی** بننے کی۔ میں ہرگز آپ کے لکچراروں اور فصیح اللسان تقریر کرنے والوں کی تحقیر نہیں کرتا ہوں، کیونکہ میں خوب جانتا ہوں کہ جو چیز سوئے ہوئے دلوں کا دروازہ کھٹکھٹاتی ہے اور زمانے کی 'ہوا' میں اول تموّج پیدا کرتی ہے وہ یہی دعوتِ حق کا غلغلہ ڈالنے والی زبان ہے، ہاں! اس قدر گزارش کرتا ہوں کہ تاوقتیکہ متکلم اور مخاطب کے دل میں سعیِ جمیلہ کا سچا جذبہ، اس کے اخلاق میں شجاعانہ استقامت و ایثار، اس کے جوارح میں قوتِ عمل، اس کے ارادوں میں پختگی اور چستی نہ ہو، محض گرم جوش تقریریں کسی ایسے کٹھن اور بلند پایہ مقصد میں آپ کو کامیاب نہیں کرسکتیں: **و کیف الوصول إلٰی سعاد و دونها قلل الجبال و دونهن حتوف.**

اے حضرات! آپ خوب جانتے ہیں کہ جس وادیِ پُرخار کو آپ برہنہ پا ہو کر قطع کرنا چاہتے ہیں وہ مشکلات اور تکالیف کا جنگل ہے، قدم قدم پر وہاں صعوبتوں کا سامنا ہے، طرح طرح کی بدنی، مالی اور جاہی مکروہات آپ کے دامنِ استقلال کو الجھانا چاہتے ہیں، لیکن **حُفَّتِ الجَنَّةُ بِالمَكَارِهِ** کے قائل کو اگر آپ **خدا** کا سچا **رسول** مانتے ہیں (اور ضرور مانتے ہیں) تو یقین رکھیے! کہ جس صحرائے پُرخار میں آپ گامزن ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں اس کے راستے پر جنت کا دروازہ بہت ہی نزدیک ہے۔ کامیابی کا آفتاب ہمیشہ مصائب و آلام کی گھٹاؤں کو پھاڑ کر نکلا ہے اور اعلیٰ تمناؤں کا چہرہ سخت سے

سخت صعوبتوں کے جھرمٹ میں سے دکھائی دیا ہے:

أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تَدْخُلُواْ الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُم مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْاْ مِن قَبْلِكُم مَّسَّتْ ضَرَّاء وَزُلْزِلُواْ حَتَّى يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِيْنَ آمَنُواْ مَعَهُ مَتَى نَصْرُ اللّهِ أَلا إِنَّ نَصْرَ اللّهِ قَرِيْب. (سورۃ البقرہ:۲۱۴)

ترجمه: کیا تم کو خیال هے که تم جنت میں جا گھسوگے اور تمهیں اس طرح کے حالات پیش نه آئیں گے جو که تم سے پهلے لوگوں کو پیش آئے؟ ان کو سختیاں اور اذیتیں پهنچیں اور وہ اس قدر جھڑجھڑائے گئے که پیغمبر اور اس کے ساتھ مومنین بول اُٹھے که خدا کی مدد کهاں هے؟ یاد رکھو که خدا کی مدد نزدیك هے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تَدْخُلُواْ الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّهُ الَّذِيْنَ جَاهَدُواْ مِنكُمْ وَيَعْلَمَ الصَّابِرِيْن. (سورۃ آلِ عمران:۱۴۲)

ترجمه: کیا تم نے یه خیال کیا هے که تم جنت میں داخل هوجائو گے بدون (بغیر) اس کے که الله جانچ کرے تم میں سے مجاهدین اور صابرین کی؟

ایک اور مقام پر ارشاد ہوا ہے:

أَلَم ٥ أَحَسِبَ النَّاسُ أَن يُتْرَكُوا أَن يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ ٥ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِن قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكَاذِبِيْن. (سورۃ العنکبوت:۳-۱)

ترجمه: کیا لوگ یه سمجھے هوئے هیں که محض 'آمَنَّا' کهنے پر وہ چھوڑ دیے جائیں گے؟ حالانکه هم

نے ان سے پہلے لوگوں کی آزمایش کی ہے، تو ضرور
ہے کہ اللہ پرکھے گا سچے اور جھوٹے لوگوں کو۔

یہ حق تعالیٰ جل شانہ کی سنت مستمرہ ہے جس میں کسی قسم کی تبدیلی وتغیر گوراہ نہیں، کوئی قوم اللہ جل شانہ کی محبت اوراس کے راستے پر چلنے کی مدعی نہیں ہوئی جس کو امتحان وآزمایش کی کسوٹی پر نہ کسا گیا ہو، خدا کے برگزیدہ اور اولوالعزم پیغمبر جن سے زیادہ خدا کا پیار کسی پر نہیں ہوسکتا، وہ بھی مستثنیٰ نہیں رہے، بیشک ان کو مظفر ومنصور کیا گیا، مگر کب؟! سخت ابتلا اور زلزالِ شدید کے بعد، وہ خود فرماتے ہیں: ”حَتَّـى إِذَا اسْتَيْأَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّواْ أَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُواْ جَاءهُمْ نَصْرُنَا فَنُجِّيَ مَن نَّشَاء وَلاَ يُرَدُّ بَأْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْن.“ (یوسف:۱۱۰) پس اے فرزندانِ توحید! میں چاہتا ہوں کہ آپ انبیا ومرسلین اوران کے وارثوں کے راستے پر چلیں اور جو لڑائی اس وقت شیطان کی ذریت اور خدائے قدوس کے لشکروں میں ہو رہی ہے اس میں ہمت نہ ہاریں اور یاد رکھیں کہ شیطان کے مضبوط سے مضبوط آہنی قلعے خداوند قدیر کی امداد کے سامنے تارِ عنکبوت سے بھی زیادہ کمزور ہیں:

الَّـذِيْنَ آمَنُواْ يُقَاتِلُونَ فِيْ سَبِيْلِ اللّهِ وَالَّذِيْنَ كَفَرُواْ يُقَاتِلُونَ
فِيْ سَبِيْـلِ الطَّـاغُـوتِ فَـقَـاتِلُواْ أَوْلِيَاء الشَّيْطَانِ إِنَّ كَيْدَ
الشَّيْطَانِ كَانَ ضَعِيْفاً. (النساء:۷۶)

ترجمہ: ایمان دار تو خدا کے راستے میں لڑتے ہیں
اور کافر شیطان کے راستہ میں، پس تم شیطان کے
مددگاروں سے لڑو، بلاشبہ شیطان کی فریب کاری
محض لچر پوچ ہے۔

میں نے اس پیرانہ سالی اور علالت ونقاہت کی حالت میں (جس کو آپ خود مشاہدہ فرمارہے ہیں) آپ کی دعوت پر اس لیے لبیک کہا کہ میں اپنی ایک گم شدہ متاع[۱] کو یہاں پانے کا امیدوار ہوں۔ بہت سے نیک بندے ہیں جن کے چہروں پر نماز کا نور اور ذکر اللہ کی روشنی جھلک رہی ہے، لیکن جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدارا! اُٹھو اور اس امتِ مرحومہ کو کفار کے نرغے سے بچاؤ، ان کے دلوں پر خوف وہراس مسلط ہوجاتا ہے، خدا کا نہیں، بلکہ چند ناپاک ہستیوں کا اور ان کے سامانِ حرب وضرب کا، حالانکہ ان

کوتو سب سے زیادہ جاننا چاہیے تھا کہ خوف کھانے کے قابل اگر کوئی چیز ہے تو وہ **خدا** کا غضب اور اس کا قاہرانہ انتقام ہے اور دنیا کی متاعِ قلیل خدا کی رحمتوں اور اس کے انعامات کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہیں رکھتی، چنانچہ اس قسم کے مضمون کی طرف **حق تعالیٰ جل شانہ** نے ان آیات میں ارشاد فرمایا ہے:

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ قِيلَ لَهُمْ كُفُّواْ أَيْدِيَكُمْ وَأَقِيمُواْ الصَّلاَةَ وَآتُواْ الزَّكَاةَ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّهِ أَوْ أَشَدَّ خَشْيَةً وَقَالُواْ رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ لَوْلا أَخَّرْتَنَا إِلَى أَجَلٍ قَرِيبٍ قُلْ مَتَاعُ الدَّنْيَا قَلِيلٌ وَالآخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقَى وَلاَ تُظْلَمُونَ فَتِيلاً. أَيْنَمَا تَكُونُواْ يُدْرِككُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنتُمْ فِي بُرُوجٍ مُّشَيَّدَةٍ. (النساء:-۷۷-۷۸)

ترجمہ: کیا تم نے ان لوگوں کی طرف نظر نہیں کی جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ روکو اور نماز پڑھتے رہو اور زکوٰۃ دیتے رہو، پھر جب ان پر جہاد فرض کیا گیا تو یکایک ان میں ایک فریق ڈرنے لگا آدمیوں سے، خدا کے برابر یا اس سے بھی زیادہ اور کہنے لگا اے ہمارے پروردگار! آپ نے ہم پر جہاد کیوں فرض کیا؟ اور کیوں تھوڑی مدت ہم کو اور مہلت نہ دی؟ کہہ دو کہ دنیا کا فائدہ تھوڑا ہے اور آخرت اس شخص کے لیے بہتر ہے، جس نے تقویٰ اختیار کیا اور تم پر ایک تاگے کے برابر بھی ظلم نہیں کیا جائے گا، جہاں کہیں بھی تم ہو موت تم کو آدبائے گی، اگرچہ تم نہایت مستحکم قلعوں میں ہو۔

اے نونہالانِ وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غم خوار (جس سے میری

ہڈیاں پگھلی جارہی ہیں) مدرسوں، خانقاہوں میں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں۔[۲] تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا اور اسی طرح ہم نے ھندوستان کے دو تاریخی مقاموں (دیوبند اور علی گڑھ) کا رشتہ جوڑا، کچھ بعید نہیں کہ بہت سے نیک نیت بزرگ میرے اس سفر پر نکتہ چینی کریں اور مجھ کو اپنے مرحوم بزرگوں کے مسلک سے منحرف بتائیں، لیکن اہلِ نظر سمجھتے ہیں کہ جس قدر میں بظاہر علی گڑھ کی طرف آیا ہوں اس سے کہیں زیادہ علی گڑھ[۳] میری طرف آیا ہے:

دوش دیدم کہ ملائك در مے خانہ زدند گلِ آدم
بسرشتند و بہ پیمانہ زدند ساکنانِ حرم سرّ عفاف
ملکوت بہ امن راہ نشیں بادۂ مستانہ زدند شکر ایزد کہ
میان من و او صلح فتاد حوریاں رقص کناں ساغر
شکرانہ زدند جنگ ہفتاد و دو ملت ھمہ را عذر بنہ
چوں نہ دیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند.

آپ میں سے جو حضرات محقق اور باخبر ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ میرے اکابر سلف نے کسی وقت بھی کسی اجنبی زبان سے سیکھنے یا دوسری قوموں کے علم وفنون حاصل کرنے پر کفر کا فتویٰ نہیں دیا، ہاں! یہ بے شک کہا گیا کہ اگر انگریزی تعلیم کا آخری اثر یہی ہے جو عموماً دیکھا گیا ہے کہ لوگ نصرانیت کے رنگ میں رنگے جائیں یا ملحدانہ گستاخیوں سے اپنے مذہب اور مذہب والوں کا مذاق اُڑائیں یا 'حکومتِ وقتیہ' کی پرستش کرنے لگیں تو ایسی تعلیم پانے سے ایک مسلمان کے لیے جاہل رہنا ہی اچھا ہے، اب از راہِ نوازش آپ ہی انصاف کیجیے کہ یہ تعلیم سے روکنا تھا یا اس کے اثرِ بد سے اور کیا یہ وہی بات نہیں جس کو آج **مسٹر گاندھی** اس طرح ادا کررہے ہیں:

ان کالجوں کی اعلیٰ تعلیم بہت اچھی، صاف اور
شفاف دودھ کی طرح ھے جس میں تھوڑا سا زھر
ملا دیا گیا ھو۔

باری تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے میری قوم کے نوجوانوں کو توفیق دی ہے کہ وہ اپنے نفع وضرر کا

موازنہ نہ کریں اور دودھ میں جو زہر ملا ہوا ہے اس کو کسی 'بھپکے' کے ذریعہ سے علاحدہ کرلیں، آج ہم وہی بھپکا نصب کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں اور آپ نے مجھ سے پہلے سمجھ لیا ہوگا کہ وہ 'بھپکا' **مسلم نیشنل یونیورسٹی** ہے۔ مطلق تعلیم کے فضائل بیان کرنے کی ضرورت اب میری قوم کو نہ رہی، کیونکہ زمانے نے خوب بتلا دیا ہے کہ تعلیم سے ہی بلند خیالی اور تدبر اور ہوش مندی کے پودے نشو ونما پاتے ہیں اور اس کی روشنی میں آدمی نجاح وفلاح کے راستے پر چل سکتا ہے، ہاں! ضرورت اس کی ہے کہ وہ تعلیم مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہو اور اغیار کے اثر سے بالکل آزاد ہو...... کیا باعتبارِ عقائد وخیالات کے اور کیا باعتبارِ اخلاق واعمال کے اور کیا باعتبارِ اوضاع واطوار کے (ان سب میں) ہم غیروں کے اثرات سے پاک ہوں۔ ہماری عظیم الشان قومیت کا اب یہ فیصلہ نہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنے کالجوں سے بہت سستے داموں پر غلام پیدا کرتے رہیں، بلکہ ہمارے کالج نمونہ ہونے چاہئیں **بغداد** اور **قرطبہ** کی **یونیورسٹیوں** اور ان **عظیم الشان مدارس** کے جنھوں نے یورپ کو اپنا شاگرد بنایا، اس سے بیش تر کہ ہم اس کو اپنا استاد بناتے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ **بغداد** میں جب **مدرسۂ نظامیہ** کی بنیاد ایک اسلامی حکومت کے ہاتھوں رکھی گئی ہے تو اس دن علما نے جمع ہوکر علم کا ماتم کیا تھا کہ افسوس آج سے علم حکومت کے عہدے اور منصب حاصل کرنے کے لیے پڑھا جائے گا...... تو کیا آپ ایک ایسی **یونیورسٹی**[۴] سے فلاحِ قومی کی امید رکھ سکتے ہیں جس کی امداد اور نظام میں بڑا زبردست ہاتھ ایک غیر اسلامی حکومت کا ہو۔ ہماری قوم کے سربرآوردہ لیڈروں نے سچ تو یہ ہے کہ امتِ اسلامیہ کی ایک بڑی اہم ضرورت کا احساس کیا ہے...... بلاشبہ مسلمانوں کی درس گاہوں میں جہاں علومِ عصریہ کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہو، اگر طلبہ اپنے اصول وفروع سے بے خبر ہوں اور اپنے قومی محسوسات اور اسلامی فرائض فراموش کردیں اور ان میں اپنی ملت اور اپنے ہم قوموں کی حمیت نہایت ادنیٰ درجہ پر رہ جائے تو یوں سمجھو کہ وہ درس گاہ مسلمانوں کی قوت کو ضعیف بنانے کا ایک آلہ ہے، اس لیے اعلان کیا گیا ہے کہ ایک **آزاد یونیورسٹی**[۵] کا افتتاح کیا جائے گا جو گورنمنٹ کی اعانت اور اس کے اثر سے بالکل علاحدہ اور جس کا تمام تر نظامِ عمل اسلامی اور قومی محسوسات پر مبنی ہو۔ مجھے ان لیڈروں سے زیادہ ان نونہالانِ وطن کی ہمتِ بلند پر آفرین اور شاباش کہنا چاہیے، جنھوں نے اس مقصد کی انجام دہی کے لیے اپنی ہزاروں امیدوں پر پانی پھیر دیا اور باوجود ہر قسم کے طمع اور خوف کے وہ '**موالاتِ نصاریٰ کے ترک**' پر مضبوطی

اور استقلال کے ساتھ قایم رہے اور اپنی عزیز زندگیوں کو ملت اور قوم کے نام پر وقف کر دیا۔ شاید **ترکِ موالات** کے ذکر پر آپ اس مسئلے کی تحقیق کی طرف متوجہ ہو جائیں اور ان عامۃ الورود سوالات اور شبہات کے دلدل میں پھنسنے لگیں جو اس بہت ہی اہم و اعظم مسئلے کے متعلق آج کل عموماً زبان زد ہیں، اس لیے میں آپ سے اجازت چاہتا ہوں کہ آپ تھوڑا سا وقت مجھ کو اس تحریر کے سنانے کے لیے عنایت فرمائیں جو میں نے بعض مسائل دریافت کیے جانے پر دیوبند سے تیار کر کے بھیجی تھی۔[۶] اب میری یہ التجا ہے کہ آپ سب **حضرات بارگاہِ رب العزت** میں نہایت صدقِ دل سے دعا کریں کہ وہ ہماری قوم کو رسوا نہ کرے اور ہم کو حکومت کا تختۂ مشق نہ بنائے اور ہمارے اچھے کاموں میں ہماری مدد فرمائیں۔ **وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَصَلَّى اللّٰهُ عَلَى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَآلِهٖ وَأَصْحَابِهٖ أَجْمَعِيْنَ.**

آپ کا خیر اندیش

محمود عفی عنہ

۱۶؍صفر ۱۳۳۹ھ مطابق ۲۹؍اکتوبر ۱۹۲۰ء

حواشی

۱۔ **شیخ الہند** کی 'گم شدہ متاع' سے مراد شجاعت و جذبۂ حریت اور سیاسی شعور کی بیداری تھی، دراصل **مولانا** مسلمانوں میں خصوصاً صلحا و علما میں اعمالِ صالحہ کے ساتھ جذبۂ حریت کی سرشاری بھی دیکھنا چاہتے تھے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب (م،ع)

۲۔ ......اس لیے کہ **شیخ الہند** نے ان لوگوں کی '**علی برادران**' کی قیادت میں **تحریکِ خلافت** میں جانثاری ملاحظہ فرمائی تھی۔

۳۔ ......اس لیے کہ علی گڑھ کے ان لوگوں نے **انگریز** کے تسلط سے آزاد یونیورسٹی قایم کرنے کا فیصلہ کیا اور **تحریکِ ترکِ موالات** میں حصہ لیا۔

۴۔ ......یہ اشارہ ہے سر سید یونیورسٹی علی گڑھ کی طرف۔

۵۔ ......مراد مسلم نیشنل یونیورسٹی علی گڑھ ہے، جو بعد میں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تبدیل ہوگئی۔

۶۔ تحریکِ ترکِ موالات کے متعلق **شیخ الہند** کا فتویٰ نقشِ حیات [جلد: دوم] ص: ۶۷۴، میں ملاحظہ فرمائیں، جس کی تائید بعد میں پانچ سو علما نے فرمائی تھی۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ
کا
ترانہ

محمد خلیق صدیقی

دیارِ شوق میرا دیارِ شوق میرا
شہرِ آرزو میرا شہرِ آرزو میرا

ہوئے تھے آ کے یہیں خیمہ زن وہ دیوانے　　اٹھے تھے سن کے جو آواز رہبرانِ وطن
یہیں سے شوق کی بے ربطیوں کو ربط ملا　　اسی نے ہوش کو بخشا جنوں کا پیراہن
یہیں سے لالۂ صحرا کو یہ سراغ ملا　　کہ دل کے داغ کو کس طرح رکھتے ہیں روشن

دیارِ شوق میرا شہرِ آرزو میرا

یہ اہلِ شوق کی بستی یہ سر پھروں کا دیار　　یہاں کی صبح نرالی، یہاں کی شام نئی
یہاں کی رسم و رہ مے کشی جدا سب سے　　یہاں کے جام نئے، طرحِ رقص جام نئی
یہاں پر تشنہ لبی مے کشی کا حاصل ہے　　یہ بزمِ دل ہے یہاں کی صلائے عام نئی

دیارِ شوق میرا شہرِ آرزو میرا

یہاں پہ شمع ہدایت ہے صرف اپنا ضمیر　　یہاں پہ قبلہ ایمان کعبہ دل ہے
سفر ہے دین یہاں، کفر ہے قیام یہاں　　یہاں پہ راہ روی خود حصولِ منزل ہے
شناوری کا تقاضہ ہے نو بہ نو طوفاں　　کنار موج میں آسودگی ساحل ہے

دیارِ شوق میرا شہرِ آرزو میرا

صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجندر پرساد، امیر جامعہ عبدالمجید خواجہ (دائیں) اور جامعہ کے وائس چانسلر پروفیسر محمد مجیب (بائیں) کے ہمراہ چالیس ویں سال گرہ کا افتتاح کرنے کے لیے یکم جنوری ۱۹۶۰ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ، اوکھلا، نئی دہلی پہنچے۔

وزیراعظم پنڈت جواہرلال نہرو ۱۰؍نومبر ۱۹۶۰ء کو نئی دہلی کے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی چالیس ویں سال گرہ تقریبات کے افتتاح کے موقع پر خطاب کرتے ہوئے۔ پیچھے بیٹھے ہوئے ڈاکٹر شریمالی (دائیں) اور وائس چانسلر پروفیسر محمد مجیب (بائیں)

جامعہ ملیہ اسلامیہ

کیا ہے؟

ذاکر حسین

یورپ اورامریکہ میں جہاں تعلیم کاایک بندھاٹکانظام موجود ہے وہاں یہ بھی ہے کہ بعض لوگ نئے نئے تعلیمی تجربے کرتے ہیں۔ پرانے نظام کی خرابیوں اور کمزوریوں کی چھان بین کرتے ہیں اور ان کے سُدھارنے کی تدبیریں سوچتے ہیں۔سوسائٹی اوراس کی نائب یعنی حکومت ان کی مدد کرتی ہے اور ان کی بتائی ہوئی تجویزوں پرغور کرتی ہے۔ یہ نہ سمجھیے گا کہ پرانی تعلیم کے سربراہ کار،ان تجویزوں کوجلد قبول کر لیتے ہیں۔سب کہیں انسان کا قاعدہ ہے کہ اپنی غلطی کو بڑی مشکل سے مانتا ہےاور ایک ڈگر کو چھوڑ کر دوسری راہ پر بڑی دیر میں چلتا ہے۔یورپ اور امریکہ میں بھی پہلے تو لوگ نئے مدرسوں پر ہنستے ہیں مگر جب عام رائے انھیں پسند کرنے لگتی ہے تو پھر پرانے مدرسوں کو بھی آہستہ آہستہ اپنا طریقہ بدلنا پڑتا ہے۔اب رہا ہمارا ہندوستان سو یہ تو یورپ سے کہیں بڑھ کر لکیر کا فقیر ہے۔ یہاں تو ہر نئی چیز کفر اور بغاوت سمجھی جاتی ہے۔اب سے سوا سو سال پہلے جب انگریزی تعلیم رائج کی گئی تو ایک مدت تک اس کی مخالفت ہوتی رہی مگر اب وہی تعلیم دھرم بن گئی ہے اور اس سے ایک قدم ہٹنا بھی

مہاپاپ ہوگیا ہے، اسی لیے یہاں لوگوں کی ہمت نہیں پڑتی کہ نئے تعلیمی تجربے کریں۔ پھر بھی تھوڑے دنوں سے کچھ سرپھرے لوگوں نے اس قسم کے تجربے شروع کیے ہیں جن میں سے ایک **جامعہ ملیہ اسلامیہ** بھی ہے۔ آج میں آپ کو **جامعہ ملیہ** کا کچھ حال بتانا چاہتا ہوں۔ پہلے یہ سن لیجیے کہ ہمارے ملک کی موجودہ تعلیم میں وہ کون سی خامیاں ہیں جن کی وجہ سے اس نئے **مدرسہ** کی ضرورت سمجھی گئی۔ پھر یہ سنیے گا کہ یہ **مدرسہ** کیا ہے، کیا کرنا چاہتا ہے اور کیا کر رہا ہے؟

یہ مشہور اور سچی بات ہے کہ موجودہ **انگریزی تعلیم** حکومت نے اپنی انتظامی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے شروع کی تھی۔ اس کا مقصد صرف اتنا تھا کہ دفتروں میں کام کرنے کے لیے **انگریزی** پڑھے ہوئے لوگ مل جائیں۔ آگے چل کر اس تعلیم کا معیار بڑھ گیا، اور ہر قسم کے مفید علوم پڑھائے جانے لگے مگر کبھی اس کی کوشش نہیں کی گئی کہ ملکی اور قومی ضرورتوں کا لحاظ رکھ کر تعلیم کا ایسا نصاب بنایا جائے جو ہماری زندگی اور ہماری تہذیب کے لیے مناسب ہو۔ **قومی تعلیم** کا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ بچوں اور نوجوانوں میں انسانی تہذیب کی بہترین صفات اپنے خاص قومی رنگ میں پیدا کرے اور دوسرا کام یہ ہے کہ انھیں سوسائٹی کی خدمت کے لیے ہر قسم کے مفید پیشے سکھائے اور روزی کمانے کے قابل بنائے۔ پہلے کام کی طرف تو کبھی توجہ کی ہی نہیں گئی اور دوسرے کی طرف بھی بس اتنی کہ طالبِ علم نوکری کے لیے تیار کیے جائیں۔

غرض ہماری تعلیم تہذیبی تعلیم نہیں بلکہ صرف پیشے کی تعلیم ہے اور وہ بھی صرف ایک پیشے یعنی نوکری کی، اس لیے ظاہر ہے کہ ادھوری اور چھچھوری تعلیم ہے۔ تعلیم اور تربیت کے طریقے کو دیکھیے تو وہ بھی پرانا نکما طریقہ ہے جس میں استاد شاگردوں کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا نہیں سکھاتا بلکہ انگلی پکڑ کر چلاتا ہے۔ تعلیم اس طرح ہوتی ہے کہ استاد کتاب کا سبق پڑھوا کر خود عبارت کا مطلب سمجھا دیتا ہے اور تربیت اس طرح کہ سزا یا تنبیہ کے ڈر سے بچہ شرارت سے باز رکھا جاتا ہے یعنی اسے یقین دلایا جاتا ہے کہ استاد اس سے زیادہ شریر اور طاقت ور ہے اور شرارت کرنے کا حق صرف اسی کو ہے جو طاقت ور ہو تعلیم کا سارا بوجھ حافظے پر پڑتا ہے جس سے ذہن میں سوچنے کی قوت نہیں پیدا ہوتی اور تربیت کا دارومدار خوف پر ہے جس سے بچے ڈرپوک اور دبّو بن جاتے ہیں اور سزا سے بچنے کے لیے جھوٹ بولنا سیکھتے ہیں۔ آزادی اور ذمہ داری کا احساس ان میں پیدا نہیں ہونے پاتا۔ سب سے بڑی خرابی موجودہ تعلیم کی یہ ہے کہ تعلیم کا ذریعہ اپنی زبان نہیں بلکہ غیر زبان ہے۔ اس ذہنی غلامی کی مثال انسانوں کی دنیا میں صرف **ہندوستان** میں اور حیوانوں کی دنیا میں صرف طوطے میں نظر آتی ہے۔

اس تعلیم نے سو سال میں ملک کی جو حالت کردی ہے اس سے ممکن ہے کہ کچھ لوگ مطمئن ہوں مگر ملک کے چند بڑے رہنما اس قدر مایوس ہوئے کہ انھوں نے ایک نیا تجربہ مسلمانوں کو قومی تعلیم دینے کا شروع کیا اور ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد ڈالی۔ ۱۹۲۵ء میں **حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم** اور **ڈاکٹر انصاری صاحب مرحوم** جامعہ کو علی گڑھ سے دلّی لے آئے۔

جامعہ ملیہ کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی آئندہ زندگی کا ایک ایسا نقشہ تیار کرے جس کا مرکز مذہبِ اسلام ہو اور اس میں ہندوستان کی قومی تہذیب کا وہ رنگ بھرے جو عام انسانی تہذیب کے رنگ میں کھپ جائے۔ اس کی بنیاد اس عقیدے پر ہے کہ مذہب کی سچی تعلیم ہندوستانی مسلمانوں کو وطن کی محبت اور قومی اتحاد کا سبق دے گی۔ اور ہندوستان کی آزادی اور ترقی میں حصہ لینے پر آمادہ کرے گی اور آزاد ہندوستان دوسرے ملکوں کے ساتھ مل کر دنیا کی زندگی میں شرکت اور امن وتہذیب کی مفید خدمت کرے گا۔ تنگ نظری اور تعصب کے اس دور میں یہ تصور محض خواب وخیال معلوم ہوتا ہے مگر دنیا کی تاریخ میں بہت سے **شیخ چلّی** ایسے ہی خواب دیکھتے آئے ہیں اور ہمت وخلوص، محنت اور استقلال کی برکت سے ان کے خواب حقیقت کا جامہ پہنتے رہے ہیں۔ اگر ہم میں یہ صفات تھوڑی بہت بھی موجود ہیں تو ہمارا یہ خواب بھی سچا ہو کر رہے گا۔ مجھے اعتراف ہے کہ جامعہ کے کارکنوں کے ذہن میں یہ نقشہ ابھی دھندلا ہے اور اسے واضح اور معین کرنے کے لیے وہ دوسروں کے مشورے اور اپنے مشاہدے اور تجربے سے مدد لے رہے ہیں۔ راہِ طلب میں بھٹکنا، ٹھوکریں کھانا اور سنبھلنا، غلطی کرنا اور سیکھنا یہی انسانی ترقی کا راز ہے۔

جامعہ کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی آئندہ زندگی کے اس نقشے کو سامنے رکھ کر ان کی تعلیم کا ایک مکمل نصاب بنائے اور اس کے مطابق ان کے بچوں کو جو مستقبل کے مالک ہیں، تعلیم دے، علم محض روزی کی خاطر جو ہمارے ملک کی جدید تعلیم کا اصول ہے اور علم محض علم کی خاطر جو قدیم تعلیم کا اصول تھا، جامعہ دونوں کو بہت تنگ اور محدود سمجھتی ہے۔ وہ علم کو زندگی کی خاطر سکھانا چاہتی ہے جس کے وسیع دائرے میں مذہب، حکمت اور صنعت، سیاست اور معیشت سبھی کچھ آجاتا ہے۔ وہ اپنے طلبہ کو اس قابل بنانا چاہتی ہے کہ قومی تہذیب اور عام انسانی تہذیب کی ہر شاخ کی قدر وقیمت کو سمجھ کر سیکھیں اور اپنی قابلیت کے مطابق اس کی کسی ایک شاخ میں اس طرح سے کام کریں کہ ان کا کام کسی نہ کسی

حدتک مجموعی زندگی کے لیے مفید ہو۔ یہ مانی ہوئی بات ہے کہ ھندوستان میں اس وقت روزی کمانے کا سوال سب سے زیادہ ضروری ہے۔ جامعہ ملیہ اس ضرورت کو محسوس کرتی ہے اور اپنے طلبہ میں یہ صلاحیت پیدا کرنا چاہتی ہے کہ ہر جائز طریقے سے روزی کما سکیں، مگر اس کا اصول یہ ہے کہ انسان روزی کو زندگی کا، اجرت کو خدمت کا تابع سمجھے اور اپنا اصل مقصد یہ جانے کہ قومی تہذیب اور انسانی تہذیب کا مفید رکن بنے، یعنی سوسائٹی میں اپنے لیے کوئی مناسب جگہ ڈھونڈھ لے جہاں وہ اپنی قوتوں سے پورا کام لے سکتا ہو، اور مفید خدمت کر سکتا ہو، اور اسی کے ساتھ اتنا کما سکتا ہو کہ اس کی اور اس کے خاندان کی سب ضرورتیں پوری ہو جائیں۔ جامعہ کی عام تعلیم کی تین منزلیں ہیں:

- **ابتدائی منزل چھے سال کی**
- **ثانوی منزل چھے سال کی**
- **اعلیٰ یا سندی منزل دو سال کی**

چار سال کی **ثانوی تعلیم** کے بعد **جامعہ جونیر** کا اور پھر دو سال کے بعد **جامعہ سینیر** کا امتحان ہوتا ہے۔ پہلا **میٹریکولیشن** کے اور دوسرا **انٹرمیڈیٹ** کے مساوی ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے ختم ہونے کے بعد **بی اے** کا امتحان ہوتا ہے اور کامیاب امیدواروں کو سند دی جاتی ہے۔ ابتدائی منزل کا نصاب جو کئی سال کے تجربے کے بعد بنایا گیا ہے شائع ہو چکا ہے اور **ثانوی** اور **اعلیٰ منزل** کا اب شائع ہونے والا ہے۔ یہاں نصاب کی تفصیل کی گنجائش نہیں مگر اس کے دیکھنے سے آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ اس کے اہم اجزا تین ہیں:

- **مذھب کی تعلیم**
- **فطرت کا مطالعه**
- **اور انسانی زندگی کا مطالعه**

ایمان اور عقیدے، عقل و فہم کی تربیت کے ساتھ ادب اور مصوری کے ذریعہ سے تخیل اور جذبات کی تربیت اور دست کاری کے ذریعہ سے ہاتھ اور نظر کی تربیت کی کوشش کی جاتی ہے۔ عملی اخلاقی تربیت اور جسمانی تربیت میں **مدرسہ** کے استاد، **بورڈنگ ھاؤس** کے اتالیق اور لڑکوں کے سرپرست مل کر کام کرتے ہیں۔ **مدرسہ** کی طرف سے لڑکوں کی تعلیم، صحت اور اخلاقی حالت کی رپورٹ ہر مہینے لڑکوں کے سرپرستوں کو بھیجی جاتی ہے اور خط کتابت کے ذریعہ ان سے مشورہ ہوتا رہتا ہے۔

ابتدائی تعلیم **کنڈرگارٹن کلاس** سے شروع ہوتی ہے جس میں مفید کھیلوں اور مشغلوں کو حواس

اور ذہن کی تربیت بنایا جاتا ہے۔اس کے بعد **پروجیکٹ میتھڈ** یعنی منصوبی طریقے سے کام لیا جاتا ہے اور ثانوی منزل میں **اسائن منٹ میتھڈ** یعنی انفرادی طریقہ کا تجربہ کیا جارہا ہے۔افسوس ہے کہ اس مختصر تحریر میں تعلیم کے ان طریقوں کو سمجھانے کی گنجائش نہیں ہے مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ تعلیم کے جدید ترین طریقے ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ نہ تو استاد علم کو زبردستی شاگردوں کے حلق میں ٹھونسے اور نہ گھول کر پلائے بلکہ ان کے دل میں علم کی سچی بھوک پیدا کردے اور ان کے لیے غذا مہیا رکھے تا کہ وہ اپنے ہاتھ سے اپنا پیٹ بھر سکیں۔استاد کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ طالبِ علم کو جاننے کا، جانے ہوئے کو سمجھنے کا اور سمجھے ہوئے کو برتنے کا شوق ہو جائے۔اسی طرح **جامعہ** کی تربیت کا اصول یہ ہے کہ لڑکوں میں اخلاقی آزادی اور ذمہ داری کا احساس پیدا ہو۔وہ اپنے آپ کو ایک برادری کا رکن سمجھیں اور جہاں تک ہو سکے اس کی خدمت کا بوجھ اٹھائیں تا کہ انھیں خود ہی قانون اور قاعدے کی ضرورت اور اس کی پابندی کی مصلحت محسوس ہو،اور استاد کو جبر کرنا یا سزا دینا نہ پڑے۔

چنانچہ **بورڈنگ ہاؤس** کا سارا انتظام متعدد مانیٹروں کے سپرد ہے جنھیں طلبہ اپنی جماعت میں منتخب کرتے ہیں۔یہ مانیٹر تھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعد بدلے جاتے ہیں اور قریب قریب سب لڑکوں کو کسی نہ کسی حیثیت سے ذمہ داری کے عہدے پر کام کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔رہنے سہنے کی طرز میں انتہائی سادگی اور کفایت جو صحت،صفائی اور سلیقے کے ساتھ نبھ سکے برتی جاتی ہے۔جو لوگ **جامعہ** کے بورڈوں کی صاف ستھری زندگی دیکھتے ہیں اور پھر انھیں معلوم ہوتا ہے کہ یہاں خرچ اور **مدرسوں** کے مقابلہ میں کتنا کم ہے تو حیران رہ جاتے ہیں۔**غریب ہندوستانیوں کو کم خرچ میں اچھی تعلیم دینے کا سوال ہمارے ملک کے تعلیمی** مسئلے کا نچوڑ ہے،مگر افسوس ہے کہ نہ ہمارا **محکمۂ تعلیم** اس کی طرف توجہ کرتا ہے اور نہ وہ لال بجھکڑ جو ہماری تعلیم کی پہیلی کو بوجھنے کے لیے باہر سے بلائے جاتے ہیں۔**جامعہ ملیہ** نے اپنے طور پر اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں بڑی حد تک کامیاب ہوئی ہے۔

جامعہ ملیہ میں اول سے آخر تک تعلیم کا ذریعہ سوائے **انگریزی** کے اور سب مضامین میں **اردو زبان** ہے۔غیر زبان میں تعلیم دینا طلبہ کے ساتھ اتنا بڑا ظلم ہے کہ اس سے ان کی دماغی قوتوں کا اور ان کے وقت کا اتنا خون ہوتا ہے کہ کم سے کم دیسی زبانوں کو ذریعہ تعلیم بنانے میں سب حامیانِ تعلیم اور محبانِ وطن کو **جامعہ ملیہ** کا ساتھ دینا چاہیے۔

علم کی عام اشاعت کے لیے جامعہ نے اردو اکادمی اور دار الاشاعت مکتبہ جامعہ کے نام سے قایم کیا ہے جس نے ملک میں اچھی شہرت حاصل کر لی ہے اور ایک مطبع بھی بڑے پیمانے پر کھولا ہے جس کا کام بہت پسند کیا جاتا ہے۔

عام تعلیم کے بعد جامعہ اپنے طلبہ کے لیے مفید پیشوں کی تربیت کا انتظام کرنا چاہتی ہے۔ ان لوگوں کو جنھوں نے صرف اسکول کی تعلیم پائی ہے۔ **نجاری، جلد سازی، ڈیری فارمنگ اور کیمیاوی صنعتیں** یعنی **صابن سازی** وغیرہ سکھائی جائے گی اور کالج کے فارغ التحصیل طلبہ کے لیے تجارت اور **اخبار نویسی** کے مدرسے ہوں گے مگر جو خاص کام جامعہ اپنے سند یافتہ طالب علموں سے لینا چاہتی ہے یہ ہے کہ وہ معلّمی کی تربیت حاصل کر کے تعلیمی مجاہدوں کی حیثیت سے ملک میں ابتدائی تعلیم کی اصلاح اور اشاعت کی کوشش کریں۔ ان سب کاموں کو شروع کرنے کے لیے دو چیزوں کا انتظار ہے۔ ایک تو سرمائے کی فراہمی کا اور دوسرے جامعہ کی عمارت کی تیاری کا جو نئی دہلی کے قریب جامعہ نگر اوکھلے میں بن رہی ہے۔ اس عمارت کا ایک حصہ بن کر تیار ہو گیا ہے اور جامعہ کے **اقامتی ابتدائی مدرسہ** کو اس میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ باقی عمارت بھی خدا نے چاہا تو بہت جلد مکمل ہو جائے گی۔

جامعہ کے تخیل اور اس کی موجودہ حالت کا یہ مختصر خاکہ پیش کرنے کے بعد میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جامعہ کا خرچ کیوں کر چلتا ہے۔ کئی سال سے جامعہ کو بھوپال اور حیدر آباد سے معقول امداد ملتی ہے اور حال میں دلّی کی میونسپلٹی نے بھی پانچ سو روپے ماہانہ کی گرانٹ منظور کی ہے۔ مگر جامعہ کے اخراجات کا بہت بڑا حصہ ان چندوں سے پورا ہوتا ہے جو **حلقہ ہمدردانِ جامعہ** کے ممبر عطا کرتے ہیں۔ اس حلقے میں اب تک پانچ ہزار حامیانِ تعلیم شریک ہو چکے ہیں اور اس کے ممبروں کی تعداد روز بہ روز بڑھ رہی ہے۔ یہی حضرات اپنی گاڑھی کمائی کا ایک حصہ قوم کے بچوں کی تعلیم کے لیے دیتے ہیں، جامعہ کے حقیقی سرپرست ہیں۔ مستقل سرمایہ جامعہ کا نہ ہے اور نہ کبھی ہوگا۔ اس کا سرمایہ اس کے کارکنوں کی ہمت اور ایثار اور قوم کی عام ہمدردی ہے۔ ممکن ہے کہ آپ اسے کافی نہ سمجھتے ہوں مگر میرے نزدیک تو یہ لازوال سرمایہ ہے۔ اگر جامعہ ملک و قوم کی کسی ضرورت کو پورا نہیں کرتی تو وہ نہیں چلے گی اور نہ وہ اس کی مستحق ہوگی۔ لیکن اگر وہ کوئی مفید خدمت کر رہی ہے تو قانونِ قدرت اسے زندہ رکھے گا اور دنیا کی کوئی طاقت اسے فنا نہیں کر سکے گی۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ
علی گڑھ سے دہلی تک

شیخ محمد اکرام

ہندوستان کے تعلیمی اداروں میں ایک نہایت دلچسپ ادارہ جامعہ ملیہ اسلامیہ (دہلی) ہے، جس کی بنیاد ۱۹۲۰ء میں **مولانا محمد علی** مرحوم نے چند دوسرے بزرگوں کی رفاقت میں ڈالی تھی۔ اس زمانے میں خلافت اور عدمِ تعاون کی تحریکیں زوروں پر تھیں۔ چنانچہ قوم کے تعلیمی اداروں کو سرکاری گرانٹ اور سرکاری تعلقات سے آزاد کرانے کی کوشش شروع ہوئی۔ **مولانا محمد علی** علی گڑھ گئے۔ بہت سے طلبہ اُن کے ہم خیال تھے، لیکن **کالج** کے اربابِ حل وعقد کہتے تھے کہ جب تک مسلمانوں کا ایک معقول حصہ سرکاری ملازمت کا خواہاں ہے، اس وقت تک گورنمنٹ سے قطع تعلق عملی حیثیت سے **کالج** اور قوم کے لیے مفید نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ انھوں نے بڑی ہمت اور استقلال سے نئی تحریک کا مقابلہ کیا۔ **مولانا محمد علی** علی **گڑھ کالج** کو تو آزاد بنانے میں کامیاب نہ ہوئے لیکن جو طلبا ان کی حمایت میں **کالج** سے علاحدہ

ہوئے تھے،انھیں لے کرانھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد ڈالی، جوقایم تو علی گڑھ میں ہوئی،لیکن ۱۹۲۵ء میں دھلی منتقل ہوگئی، جہاں **حکیم اجمل خاں** مرحوم اور **ڈاکٹر مختار احمد انصاری** کی مدد اور **ڈاکٹر ذاکر حسین** شیخ الجامعہ کے حسنِ تدبیر اور انتظامی قابلیت سے اس نے دن دونی رات چوگنی ترقی شروع کردی۔

جامعہ ملیہ کی تاسیس کچھ ایسے حالات میں ہوئی ہے اور اس کی عملی صورت میں کئی باتیں علی گڑھ کالج سے اس قدر مختلف ہیں کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ جامعہ، علی گڑھ کے خلاف ردِ عمل کی حیثیت رکھتی ہے اور اُسے **سرسید** کا ایک مخالف ادارہ سمجھنا چاہیے۔ حقیقتاً ایسا نہیں۔ اگر علی گڑھ یونیورسٹی کی موجودہ صورت کو دیکھا جائے اور **سرسید** کے اُن اداروں اور منصوبوں سے اس کا مقابلہ کیا جائے، جو ابتدا میں علی گڑھ کے متعلق اُن کے دل میں تھے تو خیال ہوتا ہے کہ علی گڑھ عملی حیثیت سے **سرسید** کے زرّیں خواب کی ایک نہایت معمولی سی تعبیر ہے اور کئی ایسی ضروری باتیں تھیں، جن کے **سرسید** دل سے خواہاں تھے، لیکن وہ علی گڑھ کو نصیب نہ ہوئیں۔ **سرسید** جس درس گاہ کا خواب دیکھ رہے تھے، اس کے متعلق انھوں نے خود کہا تھا:

> فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا، نیچرل
> سائنس بائیں ہاتھ میں اور **لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّد**
> **رَّسُولُ اللّٰہ** کا تاج سر پر۔

وہ مغربی علوم کے ساتھ ایمانِ کامل اور صحیح مذہبی تربیت کو ضروری سمجھتے تھے۔ لیکن اس میں انھیں پوری کامیابی نہ ہوئی اور علی گڑھ کالج میں کئی ایسے دور آئے، جب مذہبی نقطۂ نظر سے اس کی شہرت قابلِ رشک نہ تھی۔ اِسی طرح **سرسید** علی گڑھ کو قوم کے عام علمی احیا کا ایک مرکز بنانا چاہتے تھے، لیکن جیسا کہ ہم آگے چل کر بتائیں گے، علی گڑھ کالج نے نہ تو کوئی **حالی** یا **شبلی** پیدا کیا اور نہ کوئی قابلِ ذکر علمی روایات قایم کیں۔ اس طرح اور کئی باتیں ہیں جن میں **سرسید** کے ارادے کچھ تھے اور عملاً کچھ اور ہوا۔ ایک مفکر کے تخیل اور اسی تخیل کی عملی صورت میں بالعموم بڑا فرق ہوتا ہے اور یہ فرق یہاں بھی نمایا ہے، لیکن **سرسید** کی خواہشوں اور علی گڑھ کی عملی صورت میں زیادہ فرق غالباً اس وجہ سے ہوا کہ علی گڑھ کالج کا سب سے اہم عملی مقصد ایسے طلبا کی نشو ونما ہوگیا، جو فتح مند قوم کے علوم وفنون اور زبان حاصل

کر کے ملکی حکومت میں حصہ لے سکیں اور سرسید کے جو مقاصد اس اہم ترین مقصد کے متبائن تھے، پسِ پشت ہو گئے۔ یہ صحیح ہے کہ سرسید سمجھتے تھے کہ سرکاری ملازمت کو زندگی کی معراج سمجھ لینے سے قوم کی نجات نہیں ہو سکتی۔ اور **سید محمود** کے حالات میں لکھا ہے:

> جب ان کا تقرر ہائی کورٹ کی ججی پر ہوا ہے
> تو سرسید نے بار ہا یہ بات کہی کہ میرا جو
> اصل مقصد سید محمود کی تعلیم سے تھا، وہ
> حاصل نہیں ہوا۔ سید محمود ملازمت کے صیغے
> میں چاہے اور کتنی ہی ترقی کریں، مگر قوم کو
> جس قسم کے تعلیم یافتوں کی ضرورت ہے، اس
> میں سید محمود سے کچھ مدد نہیں پہنچ سکتی۔

لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ اس احساس کے باوجود سرسید نے نہ صرف **سید محمود** کو ملازمت قبول کرنے سے نہ روکا بلکہ **کالج** کے طلبہ کی تربیت بھی ان اصولوں پر گوارا کی، جن کی پیروی سے وہ بیش تر سرکاری ملازمت یا زیادہ سے زیادہ عام قومی رہنمائی کے ہی اہل ہو سکتے تھے۔ **نواب محسن الملک** کے زمانے میں یہ رجحان اور بھی قوی ہو گیا۔ **نواب صاحب** میں بڑی خوبیاں تھیں۔ وہ بڑے ذہین اور عملی جزئیات کے مردِ میدان تھے۔ جو کام وہ اپنے ہاتھ میں لیتے، اُسے بخیر وخوبی سرانجام دیتے، لیکن ان کی نظر بلند نہ تھی اور **کالج** کو سرکاری ملازمت کے لیے وقف کرنے کا جو عمل (سرسید کی مایوسیوں کے باوجود) سرسید کی زندگی میں شروع ہو گیا تھا، اسے انھوں نے بڑی ترقی دی اور ابتدائی بلند مقاصد نظر سے بالکل اوجھل ہو گئے۔

سرکاری ملازمت کو **علی گڑھ** کا اہم ترین عملی مقصد بنانے کا بُرا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں ایک پست درجے کی مادیت اور شیئیت پسندی پیدا ہو گئی، جو نہ صرف طلبہ کی مذہبی ترقی اور روحانی تربیت کے لیے ناساز گار تھی بلکہ جس نے ان کی اصل دنیوی ترقی پر بھی اثر ڈالا۔ دنیا میں ترقی کے لیے تین چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ صحتِ جسمانی، ہوش وخرد اور کیرکٹر۔ صحیح کامیابی کے لیے تینوں چیزیں درکار ہیں، لیکن کیرکٹر کی ضرورت سب سے زیادہ اگر عزائم بلند نہ ہوں یا بلند ارادوں کی تکمیل کے لیے شوق، محنت،

مستعدی، قربانی، ارادے کی پختگی، ایمانِ کامل اور طبیعت پر قابو نہ ہو تو قوی ہیکل جثّوں اور تیز طرار دماغوں سے فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا۔ علی گڑھ میں یہی ہوا۔ حقیقی یا خیالی ضروریات نے مطمحِ نظر کو محدود کردیا اور روحانی کمزوری سے کیرکٹر پست ہوگئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جدید اور باقاعدہ تعلیم کے باوجود، نہ صرف مذہبی نقطۂ نظر سے بلکہ دنیوی اور ظاہری کامیابی کے لحاظ سے بھی طلبۂ علی گڑھ اس بلندی پر نہ پہنچے، جو علی گڑ کالج کے دقیانوسی اور قدیم الخیال لیکن روحانی طور پر بلند اور کیرکٹر کے لحاظ سے پختہ کار بانیوں نے حاصل کی تھی۔

جن لوگوں نے مسجدوں کی چٹائیوں پر بیٹھ کر تعلیم پائی تھی، ان میں تو **سرسید**، **محسن الملک** اور **وقارالملک** جیسے مدبر اور منتظم پیدا ہوگئے۔ جو لوگ **انگریزی** سے قریب قریب ناواقف تھے اور جن کے لیے تمام **مغربی ادب** ایک گنج سربستہ تھا، انھوں نے **نیچرل شاعری** اور ایک **جدید ادب** کی بنیاد ڈال دی اور آبِ حیات، سخن دانِ فارس، مقدمۂ شعر وشاعری، مسدّسِ حالی جیسی کتابیں تصنیف کرلیں۔ لیکن جن روشن خیالوں نے **کالج** کی عالیشان عمارتوں میں تعلیم حاصل کی تھی اور جن کی رسائی مغرب کے بہترین اساتذہ اور دنیا بھر کے علم وادب تک تھی۔ وہ مطمحِ نظر کی پستی اور کیرکٹر کی کمزوری سے فقط اس قابل ہوئے کہ کسی معمولی دفتر کے کل پُرزے بن جائیں یا اپنے بانیوں کے خیالات اور ان کی عظمت کا کوئی اندازہ کیے بغیر جو باتیں ان کے مخالف کہہ رہے تھے (جو خود مکتبوں اور مسجدوں کے پروردہ تھے) انھی کو زیادہ آب وتاب اور رنگ وروغن دے سکیں۔

مادیت اور شیئیت پسندی کا جو اثر طلبہ پر ہوا، وہی علی گڑھ کے اساتذہ پر ہوا۔ علمی زندگی کی ضامن فقط دو چیزیں ہوتی ہیں۔ یا تو قوم کے پاس اس قدر دولت ہو کہ وہ اہلِ علم اور اصحابِ تصنیف کی اس طرح خدمت کرسکے، جس طرح مغربی ممالک میں ہورہی ہے اور یا اہلِ علم وفن سے اتنی دلچسپی ہو کہ دنیوی معاملات میں وہ قوتِ لایموت پر اکتفا کرکے اور مادی سربلندی سے آنکھیں بند کرکے اپنے آپ کو علم وفن کے لیے وقف کردیں۔ ہمارے ملک میں جن لوگوں نے علم وفن میں نام پیدا کیا ہے، ان کا عمل دوسرے طریقے پر رہا ہے۔ جب **حالی** کے نام **حیدرآباد** سے سو روپے کی پنشن جاری ہوگئی تو انھوں نے سرکاری ملازمت کو خیرباد کہا اور سمجھ لیا کہ یادگارِ غالب اور حیاتِ جاوید، کے لیے اپنے آپ کو وقف کرنا چاہیے۔ خواہ اس کے لیے **مشهدی لُنگی** چھوڑ کر ململ کا صافہ کیوں نہ باندھنا

پڑے۔ **اقبال** کی نسبت بھی مشہور ہے کہ جب ان کے پاس مہینے میں بیرسٹری سے ایک محدود رقم جمع ہوجاتی تو پھر وہ کوئی قانونی کام نہ لیتے اور اپنا باقی وقت علومِ اسلامی کے مطالعہ، غور وفکر اور تصنیف وتالیف میں گزارتے۔ علم وفن کی نسبت قدیم اور جدید نقطۂ نظر میں جو فرق ہے، اُسے **آزاد** نے **فردوسی** اور اس کے ساتھیوں کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا ہے:

> ان صاحبِ کمالوں کے حال کتابوں میں دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اس زمانہ میں لوگوں کو عیش وعشرت پھول پان کا شوق ہے اور پڑھنا لکھنا فقط کمانے کھانے کے لیے سیکھتے ہیں۔ اسی طرح اگلے لوگوں کو خواہ شہر، خواہ دیہات، علم وکمال کا عشق دلی ہوتا تھا۔ روزگار کی طرف زیادہ خیال نہ کرتے تھے۔ دولتِ دنیا کو کچھ مال نہ سمجھتے تھے۔ اگر اسی عالم میں کسی بادشاہ، امیر، وزیر سے قسمت موافق ہوگئی تو زہے قسمت! نہیں تو تصنیف اور رفاہِ خلق اور نامِ نیک کو حاصلِ زندگانی سمجھتے تھے۔

لیکن علی گڑھ میں ان صاحبِ کمالوں کا سکہ نہ چلا۔ وہاں مادیت اور ظاہر پسندی کا دور دورہ تھا۔ اساتذہ میں علمی اہلیت اور فنی قابلیت تو ساری تھی، لیکن ان کی نگاہیں بلند نہ تھیں۔ انھوں نے یہ تو نہ کیا کہ دولتِ دنیا میں سے مختصر سے مختصر پر کفایت کریں، اور اپنے علمی شوق کی تکمیل، تصنیف وتالیف اور نامِ نیک کو حاصلِ زندگی سمجھیں۔ ان کے نزدیک علم وفن کھانے کمانے کا ذریعہ تھا۔ اس لیے بالعموم یہی خواہش ہوتی کہ علمی زندگی پر مُردنی چھا جائے تو کوئی ہرج نہیں، لیکن مادی زندگی کی بہار ضرور لوٹی جائے۔ جو لوگ اس قابل تھے کہ اگر وہ بلند نظری کو کام میں لاتے تو شہرتِ دوام اور قومی خدمات میں **حالی** اور **آزاد**، **شبلی** اور **نذیر احمد** کو کہیں پیچھے چھوڑ جاتے۔ ان کا منتہائے زندگی یہ ہوگیا کہ کسی طرح ظاہری ٹھاٹھ

اور خوش معاشی میں وہ ایک سیکنڈ گریڈ ڈپٹی کلکٹر کا مقابلہ کرسکیں۔

علی گڑھ کے پروفیسروں میں علمی قابلیت، مذاق کی شستگی اور نیک ارادوں کی کمی نہیں، لیکن جب خیالات کا رُخ پھر گیا اور ہمتیں پست ہوگئیں تو یہ خوبیاں بے کار ثابت ہوئیں۔ اور اساتذہ کا وقتِ عزیز ڈرائنگ روم کی تزئین، خوش معاشی، ضیافت بازی، کلب بازی، گپ بازی (اور ہاں، پارٹی بازی) کی نذر ہونے لگا۔ اس فضا میں علمی زندگی کا فروغ پانا محال تھا۔ چنانچہ ان پرفیسروں کی ساری صلاحیتوں کے باوجود ان میں شاید ہی کوئی ایسا ہو، جو ہمارے علمی محسنوں کی صف میں شبلی اور سرسید نہیں، سلیمان ندوی اور مولوی عبدالحق کے قریب ہی جگہ پانے کا مستحق ہو۔

مادی نقطۂ نظر کے فروغ سے نہ صرف یہ ہوا کہ اساتذہ اور طلبہ ایسے علمی کاموں کی تکمیل سے معذور ہوگئے، جنھیں پورا کرنے کی خاطر ایثار وقربانی اور مستعدی کی ضرورت تھی بلکہ خیالات میں ایک عجب طرح کی ڈھلمل یقینی یعنی روحانی کمزوری اور ذہنی بزدلی آگئی۔ سرسید کا خیال تھا کہ علی گڑھ والے ان کے کام کو جاری رکھیں گے۔ وہ ہندوستان کی شاندار روایات کے وارث ہوں گے اور مسلمانوں پر جو اعتراض ہوتے ہیں، ان کا دنداں شکن جواب دیں گے، لیکن یہاں یہ عالم تھا:

در بغل تیر و کمال بخُشتۂ نخچیر شدیم!

کسی طرف سے مسلمانوں یا علی گڑھ کے خلاف کوئی آواز اٹھے۔ اس پر لبیک کہنے والے سب سے پہلے علی گڑھ سے نکلیں گے:

سرِتسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے

جہاں تک مسلمانوں، مسلمان بادشاہوں یا اسلام کے خلاف اعتراضات کا تعلق ہے ان کے جواب میں کوئی قابلِ ذکر کتاب، علی گڑھ کالج کے بانیوں کی نسل ختم ہوجانے کے بعد علی گڑھ سے آج تک شائع نہیں ہوئی بلکہ حالت یہ ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم کسی مسلمان بادشاہ مثلاً سلطان محمود غزنوی یا اورنگ زیب کے خلاف کچھ لکھے تو علی گڑھ کے خوش خو اور خوش اخلاقوں کا یہی جواب ہوتا ہے:

مجھے تو خُو ہے کہ جو کچھ کہو، بجا کہیے!

بلکہ وہ تو کہیں گے کہ نہ صرف محمود اور عالم گیر تعصب کے پتلے تھے بلکہ مسلم حکومت کا مؤسسِ اعلیٰ سلطان

محمد غوری بھی ایک اناڑی جرنیل اور بھونڈا سپاہی تھا اور یہ نقطہ نیرنگیِ قدرت کا کرشمہ ہے کہ وہ ایک سلطنت کی بنیاد ڈال گیا!

یہی اسلوبِ خیال علی گڑھ کا علی گڑھ تحریک کے متعلق ہے۔ **سرسید** کے کیرکٹر یا ان کے خیالات کے متعلق کہیں سے کوئی اعتراض ہو۔ معترض کی ہاں میں ہاں ملانے والے سب سے پہلے یہیں سے اٹھیں گے۔ علی گڑھ تحریک کی شکست کو جس رنگ اور روغن اور آب وتاب سے علی گڑھ کے ایک نوخیز طالبِ علم سجاد نے علی گڑھ میگزین، میں بیان کیا تھا۔ معارف اور الہلال، کے فائل اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہیں اور **سرسید**، **محسن الملک**، **وقار الملک** کے خیالات کے خلاف جو محکم دلائل **سید طفیل احمد منگلوری ثم علی گڑھی** اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کے بعض دوسرے سرگرم اراکین کی تحریروں میں ملیں گے، وہ شاید ہی کہیں اور آپ کی نظر سے گزریں۔

یہی حال مذہب کا ہے۔ آپ علی گڑھ کے ان دو ایک روشن خیالوں کو جانے دیجیے جن کی نسبت ایک زمانے میں کہا جاتا تھا کہ وہ سرے سے مذہب کے مخالف اور خدا کے وجود کے علانیہ منکر ہیں اور جن کے بیانات سن کر خیال آتا تھا کہ اگر یہ بزرگ اس قدر آزادہ رو اور ترقی پسند ہیں تو وہ ایک ایسے ادارے کی ٹکڑ گدائی کی ذلّت کس طرح گوارا کرتے ہیں، جو (سرکاری اور مشنری کالجوں کے مقابلے میں) فقط اس لیے وجود میں آیا کہ وہاں دنیوی تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم کا بھی انتظام ہو اور **نیچرل سائنس** کے ساتھ ساتھ **کلمۂ توحیدِ الٰہی** کی تعلیم بھی ہوتی رہے۔ (لطف یہ ہے کہ چونکہ ان حضرات کے یہ خیالات کسی محکم تیقّن پر مبنی نہ تھے بلکہ روحانی کمزوری اور ذہنی پراگندگی کا کرشمہ تھے) اس لیے جب یونیورسٹی کے حکام نے اساتذہ کے عقائد کی تحقیق شروع کی تو یہ لوگ اس دورِ احتساب میں اپنے آزاد خیالات پر قایم نہ رہ سکے۔ اور **آمَنتُ بِاللّٰہِ وَمَلَائِکَۃِ وَکُتُبِہٖ وَرُسُولِہٖ** پر دستخط کرنے والوں میں پیش پیش تھے۔

لیکن اگر آپ ان بزرگوں کا معاملہ ان کے ضمیر اور احساسِ فرض پر چھوڑ دیں اور ارکانِ مذہب کی ظاہری پابندی کو بھی ایک لمحے کے لیے نظر انداز کر دیں تب بھی علی گڑھ کی فضا میں اندر ہی اندر ایک عام ایمانی کمزوری اور روحانی کم ہمتی کا سُراغ ملے گا۔ آپ بعض مستثنیات کو چھوڑ کر

وہاں کے قابل اور ذہین اساتذہ اور تیز اور ہونہار طلبا کی باتیں سنیں اوران کے ذہنی رجحانات کا تجزیہ کریں تو آپ کو احساس ہوگا (اگر وہ قومی نوحہ خوانی، پرانا اور رسمی لبادہ پہن لیں) کہ اُن کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ آپ انھیں کسی طرح دقیانوسی، قدامت پسند مسلمان نہ سمجھ لیں۔یعنی علی گڑھ:

کالج ہے، امام باڑہ تو نہیں ہے

شاید یہ اسلوبِ خیال کسی عمیق نفسیاتی حقیقت پر مبنی ہے۔یعنی جس طرح **سید سلیمان ندوی** اور دوسرے **ندویوں** کی بڑی خواہش ہوتی ہے کہ اگر چہ ندوہ **قدیم** اور جدید کا جامعہ گنی جاتی ہے، لیکن وہ کوئی ایسی بات نہ کہیں جس پر دیوبند میں ذرا بھی اعتراض کی گنجائش ہو۔اور اس طرح اب وہ قدیم کی حمایت اور رجعت پسندی میں دیوبند سے بھی بڑھ گئے ہیں۔اسی طرح علی گڑھ والوں کے تحت الشعور میں بھی یہ جذبہ شدت سے کارفرما ہے کہ اگر چہ ان کے ادارے کی بنیاد مذہبی جماعت بندی پر ہے، لیکن ان سے کوئی ایسا قول یا فعل سرزد نہ ہو جس پر **سرکاری کالجوں یا ترقی پسند حلقوں** میں حرف گیری ہو سکے اور جس کی بنا پر وہ قدامت پرست اور فرسودہ خیال سمجھے جائیں۔

بہرکیف اس کا سبب کچھ بھی ہو لیکن وہ ایمانِ کامل، مسلمان ہونے پر وہ خاموش، لیکن محکم افتخار، ہندوستان میں شاندار روایات کا وارث ہونے کا وہ فخر اور تحریکِ علی گڑھ کے اصولوں کی درستی کا وہ یقین، جو **سرسید** اور علی گڑھ کے دوسرے بانیوں کا طرۂ امتیاز تھا، علی گڑھ کی نئی پود میں نہ آیا۔

مطمحِ نظر کو محدود اور سرکاری ملازمت کو علی گڑھ کا اہم ترین عملی مقصد بنانے سے وہاں کئی ایسی روحانی، ذہنی اور مادی خرابیاں پیدا ہو گئیں اور **کالج** اپنے چند اہم مقاصد پورا کرنے سے اس حد تک قاصر رہا کہ خود علی گڑھ میں یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ یہ **کالج** ہی قوم کے تمام امراض کا علاج نہیں اور قومی اصلاح و ترقی کے لیے ایک ایسا تعلیمی ادارہ قایم ہونا چاہیے، جس کا بنیادی مقصد اور دستور العمل **علی گڑھ کالج** سے مختلف ہو۔چنانچہ خود **علی گڑھ کالج** کے سیکرٹری اور **سرسید** کے خلیفۂ ثانی **نواب وقار الملک** نے ۱۹۱۲ء میں اُن مسلمانوں کے واسطے جو سرکاری ملازمتوں کے خواست گار نہیں۔ایک جداگانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ قایم کرنے کی اسکیم پیش کی۔**نواب صاحب** کی خواہش تھی کہ یہ نئی یونیورسٹی گورنمنٹ کے اثرات سے آزاد ہو۔اس میں ذریعۂ تعلیم **اردو** ہو، لیکن **انگریزی** ایک لازمی

مضمون کے طور پر شاملِ درس رہے اور طلبا کی تعلیم میں مذہبی تربیت اور کفایت شعاری کی تعلیم کو خاص اہمیت ہو۔ **نواب وقارالملک** اپنے خیالات کو عملی جامہ نہ پہنا سکے، لیکن جامعہ ملیہ اسلامیہ کے متعلق انھوں نے جو مفصل مضمون لکھا تھا اُسے پڑھ کر اس بات کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ اُن کی اسکیم اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کی عملی صورت میں کوئی خاص فرق نہیں۔ اور یہ حقیقت بھی بہت اہم ہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنا میں سب سے اہم حصہ اس بزرگ (**مولانا محمد علی**) کا ہے، جو علی گڑھ کا اولڈ بوائے تھا اور جس کا بیان ہے کہ تقریباً جو کچھ میں نے حاصل کیا ہے، وہ اسی علی گڑھ کا طفیل ہے۔

ان اسباب کی بنا پر ہم جامعہ ملیہ اسلامیہ کو سرسید کی دلی خواہش کی تکمیل سمجھتے ہیں۔ ان کی کوششوں کے خلاف ردِعمل نہیں سمجھتے۔ جامعہ اس بنیادی الجھن (سرکاری ملازمت کی تلاش) سے آزاد ہے، جس کی وجہ سے علی گڑھ کے کئی اہم مقاصد پورے نہ ہو سکے اور امید ہے کہ جامعہ میں ان مقاصد کی تکمیل احسن طریقے سے ہوگی، لیکن اس عملی فرق کے باوجود یہ نہیں کہا جا سکتا کہ سرسید کو یہ مقاصد عزیز نہ تھے۔ یا ان کے مقاصد کی تکمیل سرسید کے مقاصد کی مخالفت ہے۔

ایک لحاظ سے ہم جامعہ ملیہ اسلامیہ کو سرسید کے خواب کی ایک تعبیر سمجھتے ہیں، لیکن اس سے کارکنانِ جامعہ کے کام کی قدر و منزلت کم نہیں ہو جاتی۔ ایک تعلیمی اسکیم مرتب کرنا آسان ہوتا ہے اور اسے عملی جامہ پہنانا بہت مشکل۔ اس کے علاوہ جامعہ میں کئی امتیازی باتیں ایسی ہیں، جن کی اہمیت شاید سرسید نے نظری طور پر بھی محسوس نہ کی ہو۔

ہم سایہ قوموں کی ترقی کے اسباب پر غور کیا ہے۔ اسے اس ترقی کا ایک اہم باعث تعلیم یافتہ افراد کا ایثار نظر آئے گا۔ اِن قابلِ عزت لوگوں نے کثیر رقمیں خرچ کر کے ہندوستان اور یورپ کی بہترین یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کی ہے۔ اس کے بعد نہایت معمولی مشاہیروں پر قومی خدمت کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر رکھی ہیں۔ حالاں کہ انھیں اعلیٰ سے اعلیٰ ملازمتیں مل سکتی تھیں۔ ہندو یونیورسٹی (بنارس) ڈی اے وی کالج (لاہور) سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی[۲] (پونا) میں اس ایثار و قربانی کی بیسیوں مثالیں موجود ہیں۔ مسلمانوں میں اس صفت کا جس کے بغیر قومی ترقی کی امید ایک خیالِ خام ہے، اب تک

فقدان رہا ہے، لیکن خدا کا شکر ہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اساتذہ اور دوسرے کارکنوں نے اُن میں بھی اس کے نمونے پیش کر دیے ہیں اور شاید انھیں دیکھ کر دوسروں کو بھی ان کی پیروی کی ترغیب ہو۔

جامعہ کی تیسری اہم خصوصیت **صنعت وحرفت** کی تعلیم ہے۔ **جامعہ** نے سرکاری ملازمت کو اپنے طلبہ کا نصب العین نہیں بنایا، لیکن طلبہ کے اقتصادی مستقبل کا سوال حل کیے بغیر کوئی درس گاہ زندہ نہیں رہ سکتی۔ اربابِ **جامعہ** اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ چنانچہ انھوں نے دست کاری کو طلبہ کے لیے حصولِ معاش کا ذریعہ بنایا ہے۔ اور مختلف مفید پیشوں کی تعلیم کا انتظام کیا ہے۔

جامعہ کی درسی خصوصیات میں شاید سب سے مفید یہی ہے۔ آج تعلیم عام ہونے کی وجہ سے ملازمت کا حصول اس قدر مشکل ہو گیا ہے کہ اگر ملازمت کے علاوہ حصولِ معاش کے دوسرے ذریعوں پر توجہ نہ کی گئی تو قوم کا اقتصادی مستقبل تاریک ہو جائے گا۔ خدا کا شکر ہے کہ ارکانِ **جامعہ** اس پر روز بروز توجہ کر رہے ہیں۔ اور **نجّاری، قفل سازی، پارچہ بانی، ڈیری فارمنگ** اور **کیمیاوی صنعتوں** میں ایسے طلبہ کی نشوونما کر رہے ہیں جو اپنے فن میں اجتہاد اور کمال پیدا کر سکیں اور بشرطِ ضرورت معقول روزی کما لیں۔

جامعہ کی ایک اور قابلِ ذکر خصوصیت یہاں کی علمی زندگی ہے۔ قوم کی اہم ترین تعلیمی درس گاہ ہونے کے باوجود **علی گڑھ** اشاعتِ علم وادب کا مرکز نہ ہو سکا اور وہاں **تصنیف وتالیف** کا کوئی ادارہ قایم نہ ہوا۔ **جامعہ** کی اس طرف خاص طور پر متوجہ ہے۔ وہاں ایک **اردو اکادمی** قایم ہوئی ہے، جسے **ڈاکٹر عابد حسین صاحب** جیسے صاحبِ نظر بزرگ کی راہنمائی حاصل ہوئی اور پچھلے چند سالوں میں **دارالاشاعت جامعہ** سے بہت سی قابلِ قدر کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ ان کتابوں میں سے کئی بچوں کے لیے کئی **افسانے** اور **ناول** اور بعض سوانحی اور علمی ہیں۔ ان کے متعلق ایک جاذبِ نظر بات یہ ہے کہ **جامعہ** نے بہترین غیر مسلم اہلِ قلم اور قائدین کے خیالات **اردو** میں منتقل کیے ہیں۔ مسلمانوں نے اپنے انتہائی عروج کے زمانے میں ہندو عُلما سے کسبِ فیض کرنے میں کوئی خفت محسوس نہ کی۔ **دورِ عباسیہ** میں **سنسکرت** کتب کے ترجموں کا خاص اہتمام تھا لیکن جب **پٹھانوں** اور

تاتاریوں کا عروج ہوا تو جہاں عام علمی زندگی میں تقلید اور جمود کا دور دورہ ہوا، وہاں **ہندوؤں** سے علمی تعلقات کا سلسلہ بھی کمزور ہو گیا اور **فیروز شاہ تغلق**، **اکبر** وغیرہ کی شخصی دلچسپی کے باوجود اسلامی حکومت کی آٹھویں اور نویں صدی عیسوی میں **ہندوؤں** کی اتنی کتابیں **فارسی** میں ترجمہ نہ ہوئی ہوں گی جتنی **عربوں** نے پچاس سال میں **عربی** میں کیں۔ یہ عدم توجہی آج بھی جاری ہے، لیکن خدا کا شکر ہے کہ کم از کم ایک ادارہ (**دارالاشاعت جامعہ**) تو ایسا ہے جو برادرانِ وطن کی نشاۃ ثانیہ کے نتائجِ فکر **اردو** زبان میں منتقل کرنا گناہ نہیں سمجھتا۔

حواشی

۱۔ مضامین محمد علی —ڈاکٹر **ذاکر حسین** صاحب نے خود علی گڑھ کالج چھوڑتے وقت علی گڑھ کے متعلق جس عقیدت کا اظہار کیا ہے، اسے دیکھنے کے لیے پروفیسر **رشید احمد صدیقی** کا مضمون 'مرشد' (مضامینِ رشید ،ص:۱۱) ملاحظہ ہو۔

۲۔ **شبلی** غالباً سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی سے متاثر ہوئے تھے۔ ایک خط میں خان بہادر مولوی **بشیر الدین** کو ندوہ جانے کے متعلق لکھتے ہیں:

> میں ہندوستان میں اکثر ہندوؤں کے امتیاز نفس کے
> واقعات پڑھا کرتا اور ہر دفعہ مجھے ایک نیا جوش پیدا
> ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک دفعہ اتنا اثر ہوا کہ.... بالآخر
> میں نے دلیری کرکے استعفادے دیا اور چلا آیا۔

۱۲؍نومبر ۱۹۵۹ء کو نئی دهلی کے جامعه نگر، اوکھلا میں جامعه ملیه اسلامیه کی پهلی عمارت

جامعہ ملیہ اسلامیہ

پس منظر، قیام اور ذاکر صاحب

پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی*

ہندستان میں مسلمانوں کی تعلیم کی تاریخ سے جو لوگ واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ مسلمان **انگریزی حکومت** کے بنائے ہوئے نظامِ تعلیم سے کبھی بھی مطمئن نہ تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کے بچوں اور نوجوانوں کی تعلیم ان کے اپنے ہاتھ میں ہو۔ ایک عرصے تک سیاسی زوال کی لائی ہوئی سماجی و معاشی تباہ کاریوں، نفسیاتی الجھنوں اور طبیعت میں غم و غصہ اور احساسِ شکست و محرومی کا بار لیے وہ وقت کی راہوں میں بھٹکتے رہے۔ ۱۸۵۷ء کے خونیں واقعات اور سلطنتِ مغلیہ کے آخری تاجدار کی جلاوطنی کے بعد انھیں حالات سے سمجھوتہ کرنے پر مجبور ہونا پڑا، اگرچہ ان کا ایک طبقہ اب بھی اس پر راضی نہ تھا۔

سرسید نے ایم اے او کالج قایم کیا اور اس سے مسلمانوں میں جدید تعلیم کا خاصا چرچا ہوا، لیکن یہ کالج **سرسید** کے خواب کی ادھوری تعبیر تھی، اور آخر تک انھیں اس کا احساس رہا کہ کالج

* سابق ڈائرکٹر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ

سے تو محض ایک وقتی ضرورت کو پورا کرنا مقصود تھا، اور جن حالات میں کالج قایم ہوا تھا ان میں اس سے زیادہ وہ اور کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے۔

سرسید درحقیقت مسلمانوں کی تعلیم کو حکومت کی مداخلت سے آزاد دیکھنا چاہتے تھے، کیوں کہ وہ بھی اس بات کو خوب سمجھتے تھے کہ جب تک مسلمانوں کی تعلیم خود اُن کے اپنے ہاتھ میں نہ ہوگی، انھیں پورا فائدہ نہ پہنچے گا۔ ۱۸۷۳ء میں **سید محمود** نے مسلمانوں کی تعلیم سے متعلق جو اسکیم شائع کی تھی وہ ان کے والد **سرسید احمد خاں** کے خیالات کی آئینہ دار تھی، اسکیم میں بیان کیا گیا تھا:

> جب تک ہم ایسی حاجتوں کی نسبت بھی جو ہماری ذاتی باتوں سے متعلق ہیں (جیسی کی تعلیم) گورنمنٹ پر بھروسہ کریں گے تو درحقیقت ہم اس شے کے حاصل کرنے کی توقع کرتے ہیں جس کا حاصل کرنا بالکل ناممکن ہے، سب سے عمدہ مدارس تعلیم علوم کے یورپ میں بالکلیہ یا قریب اس کے اس ملک کی گورنمنٹ کی مداخلت اور انتظام سے علاحدہ ہیں... یہ بات قریباً ناممکن ہے کہ برٹش گورنمنٹ ہماری حاجتوں کو جو تعلیم وتربیت سے تعلق رکھتی ہیں پورا پورا سمجھے یا ان کا کامل طور سے بندوبست کرسکے۔[۱]

اسی طرح کی بات، علاوہ اپنے لکچروں میں کہتے کہ **سرسید** نے ۱۸۸۲ء میں ایجوکیشن کمیشن میں شہادت دیتے ہوئے بھی کہی تھی۔[۲] **سرسید** کے رفقا بھی اسی نصب العین کے حامل تھے، **سرسید** کی وفات (۱۸۹۸ء) کے بعد مسلم یونیورسٹی کی تحریک کا آغاز ہوا جو رفتہ رفتہ ترقی کرتی گئی، ۱۹۱۱ء کا سال آتے آتے اس منصوبے میں امید سے زیادہ پیش رفت ہو چکی تھی۔ اُدھر کالج بھی ترقی کرتا جا رہا تھا، اور وہ اپنی شہرت اور حیثیت کی ایسی منزل پر پہنچ رہا تھا کہ اسے آسانی سے

یونیورسٹی بنایا جاسکتا تھا۔ اس وقت عام خیال یہ تھا کہ مسلم یونیورسٹی ایک آزاد الحاقی یونیورسٹی اور اپنے انتظام میں گورنمنٹ کی مداخلت سے بالکل آزاد ہوگی، لیکن جلد ہی یعنی وسط ۱۹۱۲ء تک یہ بات صاف ہوگئی کہ حکومت ایسی یونیورسٹی دینے کے لیے آمادہ نہیں ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس سے مسلمانوں میں بڑا اضطراب پیدا ہوا، اور ملک میں ایک ایجی ٹیشن کی فضا بننے لگی۔ اسی زمانے میں **نواب وقار الملک** نے جو اب اپنی علالت کے سبب کالج کے سیکرٹری نہیں رہے تھے اور تبدیلِ آب و ہوا کے لیے دھرہ دون گئے ہوئے تھے، ایک تعلیمی اسکیم تیار کی جس میں ایک جدید تخیل جامعہ ملیہ اسلامیہ کا پیش کیا۔ یہ اسکیم بڑی مفصل تھی اور اس کے آخری حصے میں **تعلیم و تربیت**، **طرزِ تعلیم** اور **نصابِ تعلیم** وغیرہ کی طرف بھی واضح اشارے کیے گئے تھے، اس حصے کے شروع میں انھوں نے لکھا تھا کہ اب جبکہ یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ برٹش گورنمنٹ مسلمانوں کو ایسی یونیورسٹی دینا چاہتی ہے جیسی انھیں منظور نہیں تو پھر سرسید کے اعلیٰ وارفع مقاصد کے پیشِ نظر میری تجویز ہے:

> اب ہم کو اپنی تعلیم کا پروگرام بدل دینا چاھیے۔ یعنی اب تک جو یہ خیال تھا کہ علی گڑھ کالج ترقی کرکے 'آل انڈیا مسلم یونیورسٹی' بن جائے گا اور اس یونیورسٹی کے ذریعے سے ہم اپنی ہر قسم کی قومی تعلیمات کا انتظام کرسکیں گے، اس کی جگہ اب ہم کو یہ کرنا چاھیے کہ تمام ہندستان کے مسلمانوں کے واسطے اپنی ایک علاحدہ 'جامعہ اسلامیہ' (قومی دارالعلوم) خود قایم کریں اور جو سرمایہ مسلم یونیورسٹی کے واسطے جمع ہوا ھے اور ہورھا ھے وہ اس جامعہ اسلامیہ کے سپرد کیا جائے جو باستثنائے ضروری اخراجات متعلق تعمیرات کے

باقی فنڈ کا صرف منافع خرچ کرنے کی مجاز ہو
اور اصل فنڈ کو محفوظ رکھے۔[۳]

عام طور پر اس وقت مسلمانوں میں جامعہ اسلامیہ کے اس تخیل کا خیر مقدم کیا گیا، اور علی گڑھ کی 'ینگ ٹرکس' جماعت نے جس کے فعال اراکین میں **عبدالرحمٰن بجنوری**، **تصدق احمد خاں شروانی**، **راجا غلام حسین** اور **سید محمود** وغیرہ تھے، **بیگم بھوپال** کی سرپرستی میں دھرہ دون میں ایک ادارہ سلطانیہ کالج کے نام سے قایم کرنے کی تیاریاں بھی شروع کردیں۔ یہ منصوبہ بارآور نہیں ہوا، اور ہو بھی نہیں سکتا تھا کہ **بیگم بھوپال** انگریز حکومت کی مرضی کے بغیر اتنا اہم قدم اٹھا نہیں سکتی تھیں۔ لیکن اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ مسلمانوں میں ایک آزاد تعلیمی ادارے کا تخیل کس قدر مقبول ہے۔

۱۳-۱۹۱۲ء میں مسلم یونیورسٹی تحریک کے محاذ پر مسلمانوں کی ناکامی کا ایک سیاسی سبب یہ بھی تھا کہ **سر سید احمد خاں** کی وفات کے بعد ایم اے او کالج کے طلبہ و سیکرٹری اور کالج کے یورپین اسٹاف کے مابین جو اختلاف شروع ہوگیا تھا وہ رفتہ رفتہ اور گہرا ہوتا گیا، مسلمانوں میں جدید تعلیم کی اشاعت سے ذہنی بیداری اور قومی خودداری کا احساس پیدا ہوا۔ **انگریزوں** کے احساسِ برتری اور مسلمانوں کے اس جذبے میں تصادم کہ علی گڑھ کالج کے معاملات میں اُن کا عمل دخل زیادہ ہو، حالات کا منطقی نتیجہ تھا۔ ۱۹۰۷ء میں طلبہ کی جو اسٹرائک ہوئی اس کے اسباب کی تحقیقات کے لیے ایک کمیشن مقرر ہوا تھا، اس کی رپورٹ میں یہ کہا گیا تھا کہ طلبہ کے جذبات اور کردار کو ۱۹۰۰ء ہی سے بعض ایسے اسباب نے مجروح اور متاثر کرنا شروع کردیا تھا کہ اس طرح کی اسٹرائک کوئی ایسا تعجب خیز واقعہ نہ تھا، ان اسباب میں یورپین اسٹاف کا رویہ خاصی اہمیت رکھتا تھا۔ اس سلسلے میں خاص طور پر **کورنا**، **گارڈنر براؤن** اور **ٹول** (جو بعد میں کالج کے پرنسپل ہوئے) سازشیں کرنے اور بے چینی پھیلانے میں پیش پیش تھے۔ پرنسپل **آرچ بولڈ** سے غلطی یہ ہوئی کہ وہ انہی تینوں **انگریز** اساتذہ سے مشورہ کرتے تھے، اور یہ تینوں پکے سامراجی تھے اور عام ہندوستانیوں، طلبہ اور مسلم نوجوانوں کو پسند نہ کرتے تھے، مثلاً کمیشن کی رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ ایک **انگریز** ٹیچر نے ایک طالبِ علم کے سرپرست پر دولتی چلادی تھی، **بیگم محمود** اور **زین العابدین** کے چوکیداروں کے ساتھ ایک **یورپین** استاد نے بدسلوکی کی تھی جو کھلے بندوں

کالج اور ٹرسٹیز سے اپنی نفرت کا اظہار کرتا تھا۔ **کورنا** کلاس روم میں احمقانہ اور جارحانہ باتیں کیا کرتا تھا، مثلاً ایک بار اس نے **سلطان ترکی** کا ذکر کیا اور کہا: "اگر میرا بس چلتا تو میں سلطان عبدالحمید کو اپنا پنکھا قلی بناتا۔" **مسٹر ٹول** سے اگر طلبہ اور ان کے ہندستانی رفیقِ کار ملنے کے لیے ان کی رہایش گاہ پر جاتے تو انھیں گھنٹوں برآمدے میں انتظار کرنا پڑتا۔[۴]

کمیشن کے سامنے **گارڈنر براؤن** اور **ٹول** نے یہ بیان دیا تھا کہ ملک کے سیاسی حالات اور اخبارات نے جو **کانگریس** کی سیاسی آئیڈیولوجی کی حمایت کرتے تھے، اور جسے **اسٹوڈنٹس یونین** کی تائید بھی حاصل تھی، طالبِ علموں کے ذہن کو مسموم کیا ہے، **براؤن** اور **ٹول** نے یہ بات بھی زور دے کر کمیشن سے کہی تھی کہ طلبہ نے **کانگریس** سے مالی امداد کی درخواست بھی کی ہے۔ کمیشن نے ان دونوں باتوں کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا اور اپنی رپورٹ میں ان کی تردید کی۔[۵] لیکن، بہرحال یہ حقیقت ہے کہ اس زمانے میں طالبِ علموں کے ذہن پر **انڈین نیشنل کانگریس** کی قومی سرگرمیوں کا گہرا، اثر پڑ رہا تھا، **ڈاکٹر سید محمود** کے بقول جو ۱۹۰۷ء کی اسٹرائک میں کالج سے نکالے گئے تھے، بہت سے طالبِ علم پوشیدہ طور پر **کانگریس** کے حامی اور ہمدرد تھے، **عبدالرحمٰن بجنوری**، **تصدق احمد خاں شروانی**، **نثار احمد خاں شروانی**، **فدا حسین خاں شروانی** اور **غلام حسین** کالج میں **نیشنلزم** کے روحِ رواں تھے۔ ۱۹۰۳ء میں ایک خفیہ سوسائٹی بنائی گئی تھی جس میں حکومتِ وقت کے خلاف مضامین پڑھے جاتے تھے اور تقریریں ہوتی تھیں، ۱۹۰۵ء میں بنارس میں **کانگریس** کا جو سالانہ اجلاس ہوا تھا اس میں **سید محمود** اور ان کے کئی دوست شریک ہوئے تھے۔ ۱۹۰۶ء میں طلبہ اپنے کمروں میں **سلطانِ ترکی**، **جرمن شہنشاہ**، **گوکھلے** اور ایسی دوسری شخصیتوں کی تصویریں جو **انگریزوں** کی مخالف تھیں، آویزاں کرتے تھے۔[۶] ان تمام باتوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ۷-۱۹۰۶ء میں علی گڑھ کالج کی سیاسی فضا کیسی تھی، قیاس کہتا ہے کہ اس سیاسی فضا کے پیچھے دیگر عوامل کے علاوہ، ایک عامل ۵-۱۹۰۴ء کی روس اور جاپان کی جنگ میں ایک چھوٹے سے ایشیائی ملک یعنی جاپان کے ہاتھوں مغرب کے ایک بڑے سامراجی ملک روس کی شکستِ فاش بھی تھی۔ اس جنگ میں جاپان کی فتح نے ایشیائی ملکوں کے احساسِ کمتری کو دور کیا اور اِن کے باشعور طبقے میں سیاسی بیداری کی لہر تیز تر ہوگئی۔

۱۹۰۸ء میں ترکی میں انجمن اتحاد و ترقی کی قیادت میں ینگ

ٹرکس انقلاب ہوا، اور جلد ہی ہندستان میں انقلابی پارٹیوں اور مسلمانوں پر یہ بات واضح ہوگئی کہ اس انقلاب کا جھکاؤ جرمنی کی طرف ہے جو ایشیا اور افریقہ میں انگلستان کو پیچھے ڈھکیل کر آگے آنا چاہتا ہے۔ **سلطان ترکی** چونکہ **خلیفۃ المسلمین** بھی تھا، اس لیے مسلمانوں کو ترکی اور ترکوں سے ایک خاص مذہبی اور جذباتی تعلق تھا، انقلاب سے پہلے **سلطان عبدالحمید** نے **اتحاد اسلامی** (پین اسلامزم) کا جو نعرہ دیا تھا وہ ایک سیاسی نعرہ تھا۔ **برطانوی سامراج** کے خلاف **سلطنتِ عثمانیہ** کے حق میں عالمِ اسلام کو متحد کرنے کا، اور ینگ ٹرکس کی **انگریز** دشمنی بھی واضح تھی۔ اِدھر علی گڑھ میں **برطانوی سامراج** کی مضرت رسانیوں سے مسلم نوجوان باخبر ہوتے جارہے تھے، انیسویں صدی کے اواخر میں **شبلی نعمانی** کی تحریروں اور **مولانا حالی** کی مسدس نے مسلمانوں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر سمجھایا تھا کہ تم خود ایک شان دار تہذیب کے وارث ہو جس نے دنیا کو اعلیٰ تمدنی زندگی اور جمہوری سیاست کے گُر سکھائے ہیں، اس لیے تمھیں **مغربی تمدن** سے مرعوب نہ ہونا چاہیے، تمھیں چاہیے کہ تم **برطانوی سامراج** کے خلاف صف آراء ہو جاؤ اور نوجوان **ترکوں** (ینگ ٹرکس) کی طرح اپنے ہم وطنوں سے اتحاد کرکے **قومی آزادی** کی سبیل نکالو۔ عام مایوسی اور بے بسی کی فضا میں **شبلی** نے مسلمانوں کو فتح اور کامرانی کا مژدہ سنایا اور ایک نیا راگ چھیڑا:

عجب کیا ہے یہ بیڑا غرق ہو کر پھر اچھل آئے
کہ ہم نے انقلابِ چرخِ گردوں یوں بھی دیکھے ہیں

اُدھر ہندو نوجوانوں میں حبُ الوطنی نے ایک نئی زندگی پیدا کررکھی تھی اور ان کی ایک خاصی تعداد نے آزادیِ وطن کی خاطر دہشت پسندی کی راہ اختیار کررکھی تھی، **سوراج** اور **سودیشی** کا نعرہ ہر کس وناکس کی زبان پر تھا، کئی مسلمان نوجوان بھی اپنے نوجوان ہم وطنوں کے ساتھ تھے، جن میں دو نام بہت نمایاں ہیں، ایک **مولانا ابوالکلام آزاد** کا اور دوسرا **مولانا حسرت موہانی** کا۔[ک] **حسرت موہانی** علی گڑھ کالج کے گریجویٹ تھے، بیسویں صدی کے پہلے دہے میں وہ علی گڑھ سے اردوئے معلیٰ ' نکال رہے تھے اور علی گڑھ کالج کے نوجوانوں میں حب الوطنی اور آزادی کا جذبہ بیدار کررہے تھے۔ ترکی، ایران اور مصر کے نوجوانوں کی سیاسی سرگرمیوں کی خبریں اخبارات کے ذریعے جب تعلیم یافتہ مسلم نوجوانوں تک پہنچتی تھیں تو ان میں بھی خوداعتمادی اور

خودداری کی زندگی کے لیے جدوجہد کرنے کا حوصلہ پیدا ہوتا تھا۔

۱۹۰۷ء کی اسٹرائک کو جو ایک لحاظ سے علی گڑھ کالج کے یورپین اسٹاف اور انگریز دوست انتظامیہ کے خلاف نوجوان طلبہ کی صدائے احتجاج تھی، اگر اس وقت کی قومی و بین اقوامی سیاسی فضا کے صحیح تناظر میں دیکھا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ کالج کی یہ اسٹرائک درحقیقت ایک نئے دور کا آغاز تھا،[۸] اس اسٹرائک نے پہلی بار علی گڑھ کالج کے ان قدیم طالبِ علموں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی جو علی گڑھ سے باہر رہتے تھے۔ **مولانا محمد علی** اور **مولانا شوکت علی** نے تمام خرابیوں کا ذمے دار کالج کی انتظامیہ کو خاص طور پر اس کے سیکرٹری اور پرنسپل کو ٹھہرایا اور کہا کہ ان لوگوں کی **سرکارِ برطانیہ** سے غیر ضروری وفاداریوں نے نوجوان طالبِ علموں کو ان سے دور کر دیا ہے۔ اب اس کے بعد علی گڑھ کی **اولڈ بوائز ایسوسی ایشن** میں دو پارٹیاں بن گئیں، ایک **علی گڑھ پارٹی** جو Clique کہلاتی تھی اور دوسری Reforms League کے نام سے مشہور ہوئی۔ قدیم طلبہ کی ان دونوں پارٹیوں کے اختلاف کی بنیادی وجہ ان کا سیاسی رجحان تھا جو ہمارے خیال میں ۱۹۴۷ء تک کسی نہ کسی شکل میں پہلے **اولڈ بوائز ایسوسی ایشن** کی دونوں پارٹیوں اور علی گڑھ کالج کے ٹرسٹیوں اور بعد میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی بااختیار کمیٹیوں کی سرگرمیوں میں ظاہر ہوتا رہا۔

علی گڑھ کے نوجوان طلبہ اور **اولڈ بوائز ایسوسی ایشن** کی **ریفارمس لیگ** کے سیاسی رجحان ہی کا نتیجہ تھا کہ جب ۱۹۰۹ء میں **شیخ الہند مولانا محمود حسن** نے اپنے انقلابی اغراض و مقاصد کے پیشِ نظر دیو بند کے ابنائے قدیم کی تنظیم **جمعیت الانصار** کے نام سے قایم کی اور پھر جلد ہی ۱۹۱۰ء میں ان کے ایما سے دارالعلوم دیوبند کا جلسہ دستار بندی دیو بند میں منعقد ہوا تو اُس میں صاحبزادہ **آفتاب احمد خاں** کی قیادت میں علی گڑھ کے **احرارِ ملت** کا ایک وفد بھی شریک ہوا۔ یہیں پہلی بار اس بات کی کوشش کی گئی کہ علی گڑھ اور دیو بند ایک دوسرے سے قریب آئیں۔[۹]

۱۹۱۱ء میں شاہی دربار کے موقع پر تقسیمِ بنگال کی منسوخی کا اعلان ہوا، اور مسلمانوں کو یقین ہو گیا کہ **انگریزوں** سے یہ امید رکھنا کہ وہ مسلمانوں کی خیر خواہی کریں گے محض خود فریبی ہے۔ اب تک حکومت اور اس کے مسلم حوارئین مسلمانوں کو سمجھاتے آئے تھے کہ اگر **سلطنتِ برطانیہ** مسلمانوں کی

خیرخواہ نہ ہوتی تو وہ کیوں بنگال کو تقسیم کر کے مشرقی بنگال کا ایک الگ صوبہ بنا دیتی جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، لیکن اس تقسیم کی منسوخی کے اعلان کے ساتھ اس خیر خواہی کی ساری پول کھل گئی۔ اسی سال ٹریپولی پر اٹلی کا حملہ ہوا جس کے دھماکے علی گڑھ کالج کے احاطے میں شدت سے محسوس کیے گئے۔ ترکی چاہتا تھا کہ وہ اپنی فوجیں مصر کی راہ سے ٹریپولی بھیجے جو اس وقت سلطنتِ عثمانیہ کو اپنا مقتدرِ اعلیٰ تسلیم کرتا تھا، لیکن عملاً مصر پر اس وقت برطانوی اقتدار غالب تھا اور اس نے اس کی اجازت نہیں دی۔ یہ خبر جب علی گڑھ کالج کے احاطے میں گونجی تو طالبِ علموں میں برٹش گورنمنٹ کے خلاف غم و غصہ کی ایک لہر دوڑ گئی کیونکہ اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ برطانیہ اٹلی کا حامی اور موید ہے، اب روزانہ عشاء کی نماز کے بعد مسجد میں طلبہ کی میٹنگ ہوتی جس میں ٹریپولی پر اٹلی کے مظالم کی خونیں داستان بیان کی جاتی اور نہایت سخت الفاظ میں اٹلی اور دوسرے سامراجیوں کی مذمت کی جاتی۔[10] طالبِ علموں نے شہدائے ٹریپولی کی بیواؤں اور بچوں کی امداد کے لیے ایک فنڈ قایم کیا، اچھا کھانا اور اچھا پہننا چھوڑ دیا اور اس سے جو کچھ بچتا وہ ٹریپولی فنڈ کو دے دیا جاتا۔

ابھی ٹریپولی کا غم تازہ ہی تھا کہ ۱۹۱۲ء میں کہ جب حکومت وقت مسلم یونیورسٹی کی تحریک کے سلسلے میں مسلمانوں کے مطالبات کو ٹھکرا رہی تھی، **سامراجیوں نے ترکوں** کے خلاف بلقان کی جنگ شروع کرادی۔ اس جنگ میں بھی برٹش گورنمنٹ کھلم کھلا **ترکوں** کی مخالف تھی، اس سے علی گڑھ کے طالبِ علموں میں **انگریز** دشمنی کی لَے اور تیز ہوگئی اور انھوں نے کھل کر **ترکوں** کی حمایت میں کام کرنا شروع کیا۔[11] اسی سال، ۱۷ر نومبر کو **ڈاکٹر مختار احمد انصاری** علی گڑھ گئے جہاں انھوں نے ترکی جانے والے اپنے طبی مشن کے مقاصد لوگوں کو سمجھائے، چھے ہزار روپے کی رقم تو فوراً جمع ہوگئی، بعد میں کل رقم پینتالیس ہزار تک پہنچی،[12] اس کے ساتھ چھے طالبِ علموں نے طبی مشن کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔ یہ تھے کالج کے **عبدالرحمٰن صدیقی**، **محمد شعیب قریشی**، **عزیز انصاری**، **خلیق الزماں** اور اسکول کے **منظور علی** اور **عبدالرحمٰن پیشاوری**۔[13] ان نوجوانوں کی شان دار خدمات کا اعتراف حکومتِ ترکیہ کے اعلیٰ عہدے داروں نے ممنونیت کے گہرے جذبے کے ساتھ کیا۔

یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ ملک میں مسلمانوں کے دیگر طبقات کے علاوہ علی

گڑھ کے نوجوان گروہ کے ذہن وضمیر کی بیداری اوران میں نئے سیاسی رجحانوں کی آبیاری میں **مولانا محمد علی** کے کامریڈ اور ہمدرد اور **مولانا ابوالکلام آزاد** کے الہلال و البلاغ ' کا نمایاں حصہ تھا ان اخبارات نے اس خیال کی اشاعت بڑے پر جوش لہجے میں کی کہ 'پین اسلامزم' کا نعرہ سامراج دشمن نعرہ ہے، اور اسے دنیائے اسلام کے مغلوب ومحکوم ملک مغربی استعمار کے خلاف ایک متحدہ محاذ بنانے کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں، اور یہ حقیقت بھی ہے کہ 'پین اسلامزم کی پُرانی تحریک اب قومی آزادی کی نئی تحریکوں میں بدل چکی تھی اور یہاں ہندستان میں **اقبال** کی نظموں نے مسلمانوں کے دل میں یقین اور ذوقِ عمل پیدا کیا اور بڑے پر جوش آہنگ میں 'طلوعِ اسلام' کی بشارت دی۔[۱۴]

۱۹۱۳ء میں مسجد کان پور کا خونیں واقعہ پیش آیا اور پھر شرقِ اوسط کے مقدس مقامات اور حجاز کی حفاظت کا سوال اٹھا اور مسلمانوں میں برطانیہ کے خلاف شدید غم وغصہ پیدا ہوا، خدامِ کعبہ کی بنیاد ڈالی گئی۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ چھڑی تو ناچار **ترکوں** کو جرمنی کا ساتھ دینا پڑا، اور غالباً برطانیہ یہ چاہتا بھی تھا کہ **ترک** اس کے مخالف کیمپ میں جائیں تاکہ اسے سلطنتِ عثمانیہ کے حصے بخرے کرنے اور صلیبی جنگوں میں مغرب کی ہزیمت کا انتقام لینے کا موقع ملے۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان واقعات کا کیا اثر علی گڑھ کالج کے طالبِ علموں پر پڑا ہوگا اور اُن کی ہمدردیاں اور وفاداریاں کس کے ساتھ ہوں گی۔ جنگ کے دوران ہندستان میں بدیسی حکومت نے قوم پرور ہندوؤں اور مسلمانوں پر بڑی سختیاں کیں، قومی اخباروں پر پابندیاں عائد کیں، تشدد کا ہر طریقہ اختیار کیا اور ملک کو معاشی طور پر بری طرح لوٹا اور برباد کیا جنگ کے شروع ہوتے ہی **شیخ الہند مولانا محمود حسن** کی ریشمی رومال کی تحریک کا آغاز ہوگیا تھا، اور مکہ معظمہ میں انھیں اوران کے شاگرد **مولانا حسین احمد مدنی** اور دوسرے ساتھیوں کو گرفتار کر کے مالٹا میں نظر بند کر دیا گیا تھا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب کابل میں **مولانا عبیداللہ سندھی** اور **راجا مہندر پرتاپ** وغیرہ نے ہندستان کی آزاد جمہوری حکومت بنائی اور ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ میں کانگریس اور مسلم لیگ کا مشہور پیکٹ ہوا، غرض ہندو مسلم اتحاد اور ایک بڑی قومی تحریک کے آثار پیدا ہو چلے تھے، لیکن چونکہ جنگ کا زمانہ تھا اور سختیاں اور پابندیاں بہت زیادہ تھیں، اس لیے وقوع پذیر ہونے والے واقعات کو جنگ کے خاتمے کا انتظار تھا۔

جنگ ختم ہوئی تو اس کے ساتھ نئی آزمائشیں شروع ہوئیں، ترکی مقبوضات کی تقسیم اور

رولٹ ایکٹ کے نفاذ سے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں اضطراب اور احساسِ محرومی پیدا ہوا۔ **علی گڑھ کالج** کے درودیوار پر بھی سوگ کی فضا طاری ہوگئی، دورانِ جنگ **انگریزی راج** کے حامیوں نے حکومت سے سازباز کر کے اسے یقین دلایا تھا کہ وہ حکومت ہی کی شرط پر **مسلم یونیورسٹی** ایکٹ منظور کرلیں گے۔ قوم کے رہنما جو جیلوں میں تھے، رِہا ہوئے تو ان کے سامنے کئی اہم مسائل ایسے آئے جو فوری توجہ کے طالب تھے، ان میں ایک **خلافت** کا مسئلہ بھی تھا، اسی کے ساتھ **مانٹیگو چیمسفرڈ** دستوری اصلاحات کے نفاذ کے معاملے نے بھی قوم پرور عناصر کو نئی اُلجھنوں میں مبتلا کردیا تھا، **خلافت کمیٹی** قایم ہوچکی تھی اور علما نے الگ سے مسلمانوں کے حقوق اور ملک کی آزادی کے حصول کے لیے **جمعیۃ العلماء** کے نام سے اپنی تنظیم بنالی تھی، **جلیانوالہ باغ** میں **جنرل ڈائر** کے مظالم نے ہندو مسلم اتحاد کو اور مضبوط کردیا تھا، مگر ابھی چونکہ کوئی واضح پروگرام نہ تھا، اس لیے انتشار اور سراسیمگی کی کیفیت طاری تھی، مسلمانوں میں کوئی ہجرت کی بات کہتا تھا اور کوئی تجدید کا اعلان چاہتا تھا، ایسے میں **گاندھی جی** نے جب حکومت سے عدم تشدد پر مبنی **ترکِ موالات** کا پیغام دیا تو سبھی نے اس کا خیر مقدم کیا۔ **مولانا محمد علی** جیل سے چھوٹ کر آئے تو انھوں نے **گاندھی جی** کے خیال کی بھرپور تائید کی اور علما نے بھی اس کے وجود کا فتوا دیا۔

یکم اگست ۱۹۲۰ء کو **گاندھی جی** نے **وائس رائے ہند لارڈ چیمسفرڈ** کو خط لکھا کہ حکومتِ **برطانیہ** نے **خلافت** کے مسئلے پر بے اصولی، ناانصافی اور غیر اخلاقی حرکتوں کا ارتکاب کیا ہے اور ستم یہ کہ وہ اپنے غیر اخلاقی اقدامات کو جائز بھی سمجھتی ہے۔ ایسی حکومت کے لیے میرے دل میں نہ کوئی قدر ہوسکتی ہے نہ احترام۔[۱۵] ۹ر ستمبر ۱۹۲۰ء کو **انڈین نیشنل کانگریس** کے **کلکتہ** کے خصوصی اجلاس میں **گاندھی جی** کی **ترکِ موالات** کی تجویز بھاری اکثریت سے منظور کی گئی۔ مضامین کمیٹی میں سوائے **مسٹر جناح** کے تمام مسلمان ممبروں نے **گاندھی جی** کی تجویز کی تائید کی۔ اس تجویز کے کئی جزو تھے جن میں ایک سرکاری اور امدادی اسکولوں اور کالجوں کا بائیکاٹ بھی تھا۔ جلد ہی یہ **عظیم قومی تحریک** پورے ملک میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔

ناممکن تھا کہ **ذاکر صاحب** جیسا ذہین اور حساس نوجوان جس نے اپنے سیاسی فکر کی پہلی بتی **مولانا ابوالکلام آزاد** کے چراغ **الہلال** سے جلائی تھی، ملک وملت کے بدلے ہوئے حالات اور نئے

سیاسی رجحانات سے متاثر نہ ہوتا، خاص طور پر جب وہ دیکھتا تھا کہ ان سیاسی رجحانات کے حامل وہ لوگ تھے جن کی اس کے دل میں بڑی عزت تھی، مثلاً **حکیم اجمل خاں**، **ڈاکٹر مختار احمد انصاری**، **مولانا حسرت موہانی**، **حاجی موسیٰ خاں** اور **مولانا محمد علی** وغیرہ اور جو کانگریس کی سیاسی سرگرمیوں کے بھی حامی تھے، یہی وہ لوگ تھے جنھوں نے **ترکِ موالات** کا پیغام علی گڑھ کالج میں پہنچایا، یہ سب کے سب کالج کے خیر خواہ تھے اور ان میں سے کئی اس کے ٹرسٹی بھی تھے۔ **گاندھی جی** کو ابھی **ذاکر صاحب** نے دیکھا نہ تھا، لیکن ان کے متعلق جو کچھ اخباروں میں چھپتا تھا اسے وہ پڑھتے تھے، ناگزیر تھا کہ **ذاکر صاحب** جیسا صاف، ذہین اور پاک دل نوجوان **گاندھی جی** کی شخصیت سے متاثر ہو۔ یہ بات اپنی جگہ اہم ہے کہ **ذاکر صاحب** نے تھوڑے ہی دنوں بعد جرمنی میں اپنے قیام کے دوران **ڈاکٹر ایرن ترائش** کے ساتھ مل کر **گاندھی جی** پر ایک کتاب لکھی جو *Die Botschaft de Mahatma Gandhi* کے نام سے ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی۔ انھوں نے جرمنی میں **گاندھی جی** کے سیاسی و سماجی فکر اور فلسفۂ عدم تشدد پر کئی تقریریں بھی کیں جو وہاں کے باشعور طبقے میں بہت پسند کی گئیں۔

گاندھی جی نے اُن طالبِ علموں کے والدین کے نام ایک اپیل شائع کی جو اس وقت علی گڑھ کالج میں زیرِ تعلیم تھے۔ اپیل میں کہا گیا تھا:

> آپ کے بچے علی گڑھ میں پڑھ رہے ہیں، آپ کو اپنے بچوں کی تعلیم سے متعلق جو فکر ہے اس میں میں آپ کا شریک ہوں...... میں خود چار بچوں کا باپ ہوں ......اور مجھے والدین کے فرائض کا احساس بھی ہے، لیکن میں ان سب سے بڑھ کر اُس فرض کو سمجھتا ہوں جو خدا کا حق ہے۔ میں نے مختلف جگھوں پر ہزاروں والدین کو خطاب کیا ہے اور کسی نے اس تجویز کی مخالفت نہیں کی ہے کہ ان اسکولوں اور کالجوں سے بچے باہر نکل آئیں جن پر حکومت کا کنٹرول ہے۔ میں

سمجھتا ہوں کہ میری اس بات سے آپ کے جذبات
مجروح نہیں ہوں گے اگر میں آپ کے بچوں سے
آپ کی مرضی کے خلاف اسکول اور کالج
چھوڑدینے کو کہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ علی
گڑھ کے طالب علموں کے والدین بھی دوسرے
والدین کی طرح اس ضرورت کا احساس رکھتے
ہوں گے کہ اپنے بچوں کو گورنمنٹ کے یا
گورنمنٹ سے امداد پانے والے اسکولوں اور
کالجوں سے نکال لیں، جس نے مسلمانوں کے
ساتھ غداری اور پنجاب میں اپنے ظالمانہ رویے
سے پوری قوم کی توہین کی ہے۔ کاش آپ کو بھی
اس کا احساس ہوتا کہ وطن عزیز کا مقدر ہم
والدین کے ساتھ نہیں بلکہ ہمارے بچوں کے ساتھ
وابستہ ہے۔ کیا ہم انھیں اس غلامی کی لعنت سے
جس نے ہمیں اپنے پیٹ کے بل رینگنے پر مجبور
کردیا، چھٹکارا نہ دلائیں گے؟...... اگر وہ آزاد
بچوں اور بچیوں کی طرح تعلیم حاصل کریں تو
اس سے ان کا کوئی نقصان نہ ہوگا۔[۱۶]

گاندھی جی کی اس اپیل کا کچھ لوگوں پر یقیناً اثر ہوا، لیکن زیادہ تر لوگوں نے، خصوصاً ٹرسٹیز کی اکثریت اور کالج ایڈمنسٹریشن نے اس کی ڈٹ کر مخالفت کی اور ہر وہ حربہ استعمال کیا جس سے وہ کالج کو **ترکِ موالات** کی تحریک سے محفوظ رکھ سکتے تھے۔ ۱۰/ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو سنڈیکیٹ کی میٹنگ ہوئی جس میں **ترکِ موالات** کی مخالفت کی تجویز منظور کی گئی اور پرنسپل (**ڈاکٹر ضیاء الدین**) اور اسٹاف سے کہا گیا کہ وہ ہمت سے صورتِ حالت کا مقابلہ کریں، اس دوران کچھ طالب علم **گاندھی جی** اور **مولانا محمد علی** کے

پاس پہنچے اور انھوں نے انھیں **علی گڑھ** آنے کی دعوت دی کہ وہ آئیں، طلبہ کو **ترکِ موالات** کا پیغام دیں اور انھیں سمجھائیں کہ مجوزہ سرکاری **یونیورسٹی** مسلمانوں کے تعلیمی وتہذیبی مسائل کو حل نہیں کرسکتی، اور یہ کہ انھیں اپنے تعلیمی ادارے کو حکومت کی پابندیوں سے آزاد رکھنا چاہیے۔ ۱۱/اکتوبر کو **علی برادران**، **گاندھی جی** اور **سوامی ستیہ دیو** **علی گڑھ** پہنچے، ۱۲/اکتوبر کو **گاندھی جی** نے یونین کلب میں طلبہ سے خطاب کیا اور **ترکِ موالات** کی تحریک کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کی، لیکن وہ **کالج** کے بائیکاٹ کے سلسلے میں طلبہ سے کوئی وعدہ نہ لے سکے۔

❍

ذاکر صاحب کی خواہش تھی کہ وہ **گاندھی جی** اور **علی برادران** کی آمد کے موقع پر **علی گڑھ** میں موجود رہیں، لیکن وہ بیمار تھے اور **ڈاکٹر انصاری** کو **دہلی** میں دکھانا چاہتے تھے۔ افسوس کہ تاریخیں ٹکرا گئیں۔ انھوں نے اس بات کی کوشش کی کہ کابینہ میں ان کے دوست اس بات پر راضی ہو جائیں کہ مقررہ تاریخ (۱۲/اکتوبر ۱۹۲۰ء) کو یونین کا جلسہ سہ پہر میں جہاں تک ممکن ہو، تاخیر سے ہو لیکن ایسا نہ کیا جاسکا اور جب وہ اسی دن دہلی سے لوٹے تو معلوم ہوا کہ **گاندھی جی** نے یونین میں تقریر کی اور واپس چلے گئے۔

گاندھی جی واپس چلے گئے تھے، **علی برادران** رک گئے تھے لیکن نہایت اداس، دل شکستہ اور مایوس تھے، انھیں اُمید تھی کہ ان کی مادرِ درس گاہ ان کی پکار سنے گی، **گاندھی جی** کی آمد کی لاج رکھے گی جو **خلافت تحریک** کے پُرزور مویدین میں تھے اور مسلمانوں کے مذہبی حقوق کے لیے لڑ رہے تھے، انھیں شرمندگی تھی کہ **علی گڑھ** نے شدائد اور ایثار وقربانی کا سامنا کرنے سے گریز کیا اور **انگریز پرستی** کی تن آسانی کو ترجیح دی۔

۱۲/اکتوبر کو جب **ذاکر صاحب** شام کو **دہلی** سے لوٹے تو حسبِ معمول **علی گڑھ** **اسٹیشن** پر طالبِ علم موجود تھے۔ ان میں **ذاکر صاحب** کے بعض دوست بھی تھے جو انھیں لینے اسٹیشن آگئے تھے۔ طلبہ میں ایک گروپ ایسا تھا جو اس دن یونین میں **گاندھی جی** اور **مولانا محمد علی** کی تقریر پر تبصرہ کر رہا تھا اور بڑے تکلیف دہ انداز میں کر رہا تھا، کچھ ایسے تھے جو بازاری اور اہانت آمیز جملے کہہ رہے تھے، گویا جیسے وہ **گاندھی جی** اور **مولانا محمد علی** کی سبکی اور ناکامی کا جشن اپنے خاص انداز میں منا رہے ہوں۔ **ذاکر صاحب** کو محسوس ہوا کہ ان کے اپنے بعض دوست بھی ان طلبہ کے ہم نوا ہیں۔ طلبہ اور اپنے دوستوں

کے اس ظالمانہ رویے سے وہ بے چین ہو گئے، **مجیب صاحب** نے ہم لوگوں سے کئی بار ذکر بھی کیا اور بعد میں لکھا بھی کہ **ذاکر صاحب** نے انھیں بتایا تھا کہ اس دن اسٹیشن پر **گاندھی جی** کا توہین آمیز تذکرہ اس قدر وحشیانہ تھا کہ میں شرم سے زمین میں گڑ گیا۔ تعلیم، تہذیب اور ہر وہ چیز جو اعلیٰ اور پاکیزہ ہے، سب کے خلاف طرزِ عمل، یہ اندازِ گفتگو، ایک جرم تھا، مجھے خیال آیا کہ اس گناہ کا کفارہ تو ادا ہی کرنا ہوگا۔[۱۷] یہ شریفانہ احساس **ذاکر صاحب** کی نیک فطرت اور ان کی اب تک کی ساری ذہنی اور اخلاقی تربیت کے عین مطابق تھا، **علی گڑھ** اسٹیشن پر وہ ایک 'لمحہ' درحقیقت **ذاکر صاحب** کی حیاتِ مستعار کا وہ لمحہ تھا جس نے ان کی زندگی کا اصل رخ متعین کر دیا، وہ لمحہ دراصل اربابِ قضا و قدر کا متعین کیا ہوا لمحہ تھا جس کے بھید عقلِ انسانی پر نہیں کھلتے۔

وہ رات جو ۱۲؍اکتوبر کا دن گزار کر آئی تھی رجعت پرستوں کے لیے اطمینان وراحت کی رات، لیکن غیرت مندوں کے لیے شرم وندامت کی رات تھی، نہ معلوم اُس رات ایسے کتنے لوگوں کی آنکھوں سے پچھتاوے کے آنسو بہے، کتنے لوگوں کے دل مضطرب رہے اور کتنوں نے یہ ارادہ کیا کہ وہ مسلمانوں کے اس عظیم انشان دانش کدے کو ملک وملت کی خدمت کی راہ کی قربانیوں سے محروم نہ رہنے دیں گے۔ چونکہ کوئی ریکارڈ نہیں، اس لیے ہم یقین کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ رات **ذاکر صاحب** پر کیسی گزری، ہاں، اس بات سے کچھ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ باوجود اس کے کہ ان کے قریبی دوستوں نے اس رات کی صبح کو ان کے رویے اور اندازِ گفتگو میں کوئی خاص تبدیلی محسوس نہیں کی، ۱۲؍اکتوبر کی شام کو **علی گڑھ** اسٹیشن پر انھیں اضطراب اور ندامت کا جو احساس ہوا تھا، وہ ۱۳؍اکتوبر کے **یونین کلب** کے جلسے میں آنسو بن کر بہہ نکلا جسے بہتوں نے دیکھا اور جس کی لکیریں اس دن کی رپورٹ کی سطریں بن کر کتابوں میں محفوظ ہو گئیں۔

یونین کے اس جلسے کا حال جس میں **ذاکر صاحب** کے فیصلہ کن اقدام نے ہوا کا رخ بدل دیا، **رشید احمد صدیقی** نے ان الفاظ میں لکھا ہے:

> صبح ہوئی، یونین میں جلسہ ہوا میں اور مرشد
> (ذاکر صاحب) بھی ایک طرف بیٹھ رہے۔ مولانا
> محمدعلی نے حسبِ معمول بڑی پُرزور تقریر کی،

لیکن حاضرین پر کچھ زیادہ اثر نہیں ہوا۔ ان کے بعد مولانا شوکت علی آئے۔ دو پہر ہونے والی تھی، دونوں بھائی ٹرین سے کہیں باہر جانے والے تھے۔ تقریر کی آخری اور کمزور موجیں کنار ساحل سے ہم آغوش ہونے والی ہی تھیں کہ مولانا شوکت علی نے آخری بار ایک مایوسانہ وارفتگی کے ساتھ یہ مشہور اور فرسودہ شعر:

سپردم بہ تو مایۂ خویش را
تو دانی حساب کم و بیش را

پڑھا ... اور اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ مڑ کر دیکھتا ہوں تو مرشد کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں، دم بخود رہ گیا مجمع قابو سے باہر ہو گیا تھا۔ مرشد کو کھینچتا ہوا باہر لایا۔ پوچھا: یہ کیا ہوا ؟ فرمایا: رشید صاحب، 'الوداع' زندگی کا آغاز بخیر ہوا، انجام کے بھی بخیر ہونے کی دعا کیجیے گا۔ میرے پاس جو کچھ میرا ہے وہ یوسف اور محمود کے حوالے کر دیجیے گا۔ کالج کے کاغذات ان کو واپس بھیج دیجیے گا۔ میں نے کہا، مرشد، اس تحریک سے متعلق اکثر گفتگو رہی۔ آپ اس طریقہ کار کے کچھ ایسے موید بھی نہ تھے۔ آخر یہ کیا ہوا؟ فرمایا تحریک غلط ہو یا صحیح اس کے بارے میں یقین اور صحت کے ساتھ کچھ کہنا ناممکن بھی ہے اور قبل از وقت بھی۔

مجھے جس بات نے بے دست و پا کر دیا وہ یہ
خیال تھا کہ کہنے والے یہ نہ کہیں کہ علی گڑھ نے
ایسی تحریک میں حصہ نہ لیا جس میں مصائب کا
سامنا تھا۔ مجھے تو یہ بتلانا ہے کہ فرزندانِ علی
گڑھ رزم اور بزم دونوں کی ذمے داری اٹھا سکتے
ہیں۔ آپ مزاحم نہ ہوں، پانسا پھینکا جا چکا ہے
، انجام جو کچھ ہو، اچھا خدا حافظ ![۱۸]

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں تھوڑی دیر رک کر ہم ۱۹۲۰ء کے نوجوان ذاکر حسین کی دلآویز شخصیت کے خدوخال عابد صاحب کی ایک تحریر کے درج ذیل اقتباس کے آئینے میں بھی دیکھیں جو ذاکر صاحب کی شخصیت سے متعلق ہمارے خیال اور تاثر کی سچی، کھری اور عینی شہادت ہے:

ذاکر صاحب ہندستان کی تحریک آزادی کے
طوفانی دور میں پلے اور بڑھے۔ اس طوفان و
ہیجان کے زمانے میں جہاں بحرِ زندگی کی سطح
پر ساحل سے ٹکر لینے والی تند و پر شور موجیں
ابھریں وہاں قعر دریا میں ان موتیوں نے بھی
پرورش پائی جن میں بقول غالب دریا کا اضطراب
محو ہو گیا تھا۔ ایک ایسا موتی جس کے سکون میں
طوفانوں کی خاموش قوت چھپی ہوئی تھی،
نوجوان ذاکر حسین تھا جو ۱۹۲۰ء میں ایم اے او
کالج علی گڑھ کے ایم۔ اے فائنل میں پڑھ رہا تھا ...

اکتوبر ۱۹۲۰ء میں جب میں میور سنٹرل کالج
الہ آباد سے (بی۔ اے) کا امتحان پاس کرنے کے بعد
انگریزی ادب میں (ایم۔ اے) کرنے کے لیے محمڈن

اینگلو اورینٹل کالج میں داخل ہوا تو سارا کالج ذاکر حسین کی شہرت سے گونج رہا تھا۔ وہ ایم اے معاشیات کے دوسرے سال کے طالب علم تھے اور شعبہ معاشیات میں جونیئر لکچرر بھی۔ مجھے پہلی ملاقات میں نہیں تو دو چار ملاقاتوں میں اچھی طرح اندازہ ہو گیا کہ میں نے ان کی غیر معمولی ذہنی و اخلاقی صفات اور دل کش شخصیت کے بارے میں جو افسانوی روایتیں سنی تھیں وہ بڑی حد تک صحیح تھیں۔ مجھے ان کی ذہانت میں ایک طرف ادراک ووجدان کا اور دوسری طرف تفکر و تخیل کا ایک ایسا مرکب نظر آیا جو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ آپ ان سے گفتگو کریں تو چشمِ زدن میں وہ بات کی تہ تک پہنچ جاتے تھے اور پھر رفتہ رفتہ اُبھر کر سطح پر آتے تھے۔ وہ خود کسی مسئلے پر غور کریں تو ان کی قوت فیصلہ بجلی کی طرح کو ند کر صحیح حل کے مرکزی نقطے کو روشن کر دیتی تھی۔ پھر رفتہ رفتہ پورے دائرے میں پھیلتی تھی۔ ان کی تقریر میں بھی یہ خصوصیت تھی کہ پہلے سیدھی دل میں اُتر جاتی تھی اور پھر استدلال کے ذریعے دماغ کو قائل کرتی تھی ...... سرسری نظر سے دیکھنے والے کے لیے ایسا لگتا تھا کہ وہ ایک خوش باش ، لا ابالی مزاج رکھتے ہیں۔ زندگی ان

کے لیے کوئی گھرا، وزنی، سنجیدہ مقصد نھیں
بلکه ایك هلکا پھلکا دلچسپ مشغله ھے۔
مگر چند ھی روز بعد ذاکر صاحب کی شخصیت
کا ایك نیا پھلو جو اب تك دبااور چھپا ھوا تھا
ابھر کر نظروں کے سامنے آیا اور معلوم ھوا که
اس بظاھر بے ته ، بے پروا نوجوان کے سینے میں
ایك پر خلوص، پرسوز اور پر جوش دل ھے اور
اس دل میں محکم ایمان، اٹل اراده اور اتھاه همت
اور حوصله ھے۔[۱۹]

ذاکر صاحب کی طلبہ اور اسٹاف بھی عزت کرتے تھے، ایک ممتاز طالب علم، اچھی گفتگو کرنے والے، دل کش شخصیت اور دیانت دار نوجوان کی حیثیت سے اُن کی شہرت عام تھی اور کالج میں لوگ رہنمائی کے لیے ان کی طرف دیکھنے لگے تھے جہاں اُن کی بات کا ایک وزن اور ایک وقار تھا، پرنسپل **ڈاکٹر ضیاء الدین** انھیں اپنا رفیق سمجھتے تھے۔ **تحریک ترکِ موالات** کا **ذاکر صاحب** پر اثر ہوا، تو گویا علی گڑھ میں تحریک کی یہ پہلی کامیابی تھی۔ یونین کے جلسے سے **علی برادران** تو چلے گئے مگر مجمع کو مضطرب اور بے چین چھوڑ گئے۔ جوش خروش کا ایک طوفان تھا کہ تھمنے میں نہ آتا تھا۔ اسی میں کسی نے اُٹھ کر کہا کہ اگر ہم اس ادارے کو چھوڑ دیں تو جو لوگ ہمیں چھوڑنے کے لیے کہہ رہے ہیں، انھیں چاہیے کہ وہ ہماری بہتر تعلیم کی ذمے داری قبول کریں۔ اس پر مجمعے میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اور اس شخص پر جس نے یہ بات کہی تھی **ڈاکٹر ضیاء الدین** کا جاسوس ہونے کا الزام لگایا تھا۔ ایک سینیر طالب علم **ابن حسن** تھے جو اسی زمانے میں اسسٹنٹ لکچرر مقرر ہوئے تھے۔ انھوں نے تجویز کی معقولیت پر غور کرنے کو کہا تو انھیں بھی طنز و تضحیک کا نشانہ بنایا گیا۔ **ذاکر صاحب** ان دنوں بیمار تھے، صحت ان کی کمزور تھی اور وہ اس موقع پر کچھ کہنا نہیں چاہتے تھے کیونکہ انھیں تیز بخار تھا، لیکن جب طنز و تعریض کی اشتعال انگیزیاں بہت بڑھ گئیں اور ہر معقول بات مخالفت کے طوفان میں دبتی نظر آئی تو ان سے نہیں رہا گیا۔ کھڑے ہوئے اور ایک زوردار اور مدلل تقریر کی اور ایک آزاد اور جداگانہ تعلیمی ادارہ قایم کرنے کی تجویز کی تائید کی، اتفاق سے چند ماہ پیش تر انھیں بھی

کالج میں **معاشیات** کا اسسٹنٹ لکچرر مقرر کیا گیا تھا۔ ان کے ایک دوست **سید محمد** اٹھے اور کہنے لگے:

یہ شخص میرا دوست ہے، یہ اچھا آدمی ہے، سچا آدمی ہے۔ مگر اس وقت اس کے سینے میں شیطان گھس گیا ہے۔ یہ بھی اپنی تنخواہ کو محفوظ کرنا چاہتا ہے، اس لیے یہ ترکیب کر رہا ہے کہ وقت ٹل جائے اور ہم کچھ نہ کر پائیں، دوستو! دھوکا نہ کھاؤ۔

اس پر وہ پھر کھڑے ہوئے، تقریر کی اور طلبہ کی اکثریت کو یہ کہہ کر اپنا حامی بنالیا کہ وہ لکچرر شپ سے استعفیٰ دے رہے ہیں اور وہ وظیفہ بھی نہیں قبول کریں گے جو انھیں ملنے والا ہے، **ابن حسن** اور دوسرے طلبہ نے بھی اسی طرح کے اعلانات کیے،[۲۰] **ذاکر صاحب** کی طبیعت کچھ ایسی تھی، شاید یہ ان کے دادا کا اثر ہو کہ انھیں چیلنج قبول کرنے میں ایک لطف آتا تھا، ایسے میں وہ 'جان'، کے مقابلے میں 'تسلیمِ جاں' کے علم بردار بن جاتے تھے۔ یہ خیال کہ جو لوگ اداروں کے بائیکاٹ کے حامی ہیں، ان میں اتنی ہمت ہونی چاہیے اور انھیں اتنے وسائل فراہم کرنے چاہئیں کہ ایک **قومی ادارہ** جس میں طلبہ آئندہ تعلیم حاصل کرسکیں، قایم کیا جاسکے، ایک چیلنج کی شکل میں ان کے ذہن میں جاگزیں ہوگیا، اس جلسے میں تو انھوں نے کسی سے کچھ نہیں کہا کہ وہ کیا کرنے والے ہیں، لیکن چند دن بعد وہ دہلی پہنچے جہاں **حکیم اجمل خاں ڈاکٹر انصاری** اور **مولانا محمد علی** اور دوسرے ممتاز لوگوں سے ملے اور انھیں یقین دلایا کہ طلبہ اور اساتذہ کی ایک بڑی تعداد ایم اے او کالج چھوڑ کر قومی ادارے میں آجائے گی بشرطیکہ ایک ایسا ادارہ قایم کیا جاسکے۔ قوم کے رہ نما اس کے لیے تیار تھے، یوں اور اس طرح ۲۹/اکتوبر ۱۹۲۰ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ وجود میں آئی اور علی گڑھ کالج کی مسجد میں اس ادارے کا افتتاح کرتے ہوئے اسیرِ مالٹا **شیخ الہند مولانا محمود حسن** نے اپنے خطبے میں اس کے اغراض و مقاصد کی وضاحت کی۔

لیکن قبل اس کے ہم **شیخ الہند** کے خطبۂ افتتاحیہ کے دو ایک اقتباس یہاں نقل کریں، یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس تجویز کا ذکر کر دیا جائے جو طلبہ نے ۱۳/اکتوبر ۱۹۲۰ء کو یونین کے جلسے میں منظور کی تھی۔ تجویز میں صلح نامہ سیورے کے موقع پر ترکی کے خلاف سرکارِ برطانیہ کے رویے کی

پُر زور مذمت کی گئی تھی اور بورڈ آف ٹرسٹیز سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ حکومت سے امداد لینا بند کر دیا جائے اور الہ آباد یونیورسٹی سے ایم اے او کالج کا الحاق منسوخ کر دیا جائے، طلبہ کا فیصلہ ہے کہ اگر ٹرسٹیز نے ۲۶/اکتوبر ۱۹۲۰ء تک ان کے مطالبات نہیں تسلیم کیے تو وہ کالج کو ایک قومی ادارے میں بدل دینے کی ہر ممکن کوشش کریں گے اور وہ کسی گورنمنٹ چارٹرڈ یونیورسٹی سے کوئی سروکار نہ رکھیں گے۔ اس کے بعد طلبہ نے کلاسوں میں جانا بند کر دیا کالج کے پرنسپل ڈاکٹر ضیاء الدین نے اپنی ساری سرکاری اور غیر سرکاری طاقت اور اپنے سارے ہمدردوں کی تائید وقوت کو جو تحریکِ موالات کے مخالف تھے، مجتمع کیا، سارے ملک سے والدین اور سرکاری ملازمین علی گڑھ پہنچے، طلبہ کو واپس بلا لینے کے لیے ان کے گھروں پر تار بھیجے گئے کہ طلبہ باغی ہو گئے ہیں، والدین اپنے بچوں کو آ کر لے جائیں، غرض حکومت کے بہی خواہوں اور کالج کے 'نام نہاد' ہمدردوں نے ایک مضبوط دفاعی محاذ قایم کر لیا اس دفاع کی ایک تدبیر یہ بھی تھی کہ با اثر طلبہ کو دنیوی اعزاز کے سبز باغ دکھائے گئے اور انھیں تحریک سے توڑ لینے کے لیے سرکاری عہدوں کے لالچ دیے گئے۔ ذاکر صاحب کی شخصیت کا طلبہ عام طور پر احترام کرتے تھے، اور اُن کی بات اور اُن کا فیصلہ وقعت رکھتا تھا۔ خیال تھا کہ اگر وہ ٹوٹ گئے تو علی گڑھ میں یہ تحریک کمزور پڑ جائے گی اور پھر اس سے نپٹنا آسان ہوگا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین نے انھیں بلا کر سمجھایا کہ وہ خواہ مخواہ کیوں اس جھگڑے میں پڑ کر اپنی زندگی خراب کرتے ہیں، اس سے باز آ جائیں تو وہ جلد ہی انھیں ڈپٹی کلکٹری دلا دیں گے، یہ گویا اُن کی پاک ضمیری کے لیے دوسرا چیلنج تھا جو دولت اور عہدے کی تحریص کی شکل میں پیش کیا گیا تھا اور جیسا کہ کہا جا چکا ہے چیلنج کا قبول کرنا ان کی طبیعت کا عین مقتضا تھا، انھوں نے ڈاکٹر ضیاء الدین کی پیش کش کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیا اور قومی خدمت کی راہ میں اپنے قدم مضبوطی سے جما دیے:

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

شیخ الہند نے اپنے خطبہ افتتاحیہ میں جسے ان کی علالت اور کمزوری کے باعث ان کے شاگرد مولانا شبیر احمد عثمانی نے پڑھا، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اغراض ومقاصد پر بڑی وضاحت سے روشنی ڈالی اور تحریک ترکِ موالات اور جامعہ کے قیام کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

اے نو نہالانِ وطن، جب میں نے دیکھا کہ میرے

درد کے غمخوار جس سے میری ہڈیاں پگھلی
جارہی ہیں، مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور
اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے
اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی
گڑھ کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے
ہندستان کے دو تاریخی مقاموں (دیوبند اور
علی گڑھ) کا رشتہ جوڑا ...
مجھے لیڈروں سے زیادہ نو نہالانِ وطن کی ہمت
بلند پر آفریں اور شاباش کہنا چاہیے جنھوں نے
اس نیک مقصد کی انجام دہی کے لیے اپنی
ہزاروں امیدوں پر پانی پھیر دیا اور با وجود
ہر قسم کی طمع اور خوف کے موالات نصاریٰ کے
ترک پر نہایت مضبوطی اور استقلال کے ساتھ
قایم رہے اور عزیز زندگیوں کو ملت اور قوم کے
نام پر وقف کر دیا۔

جامعہ کے بارے میں *شیخ الہند* نے کہا:

مسلمانوں کی تعلیم مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو اور
اغیار کے اثر سے مطلقاً آزاد کیا با اعتبار عقائد و
خیالات اور کیا با اعتبار اخلاق و اعمال ہم غیروں
کے اثرات سے پاک ہوں، ہماری عظیم الشان قومیت
کا اب یہ فیصلہ نہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنے کالجوں
سے بہت سستے غلام پیدا کرتے رہیں بلکہ ہمارے
کالج نمونہ ہونے چاہئیں بغداد اور قرطبہ کی یونی

ورسٹیوں کے اور ان عظیم الشان مدارس کے
جنھوں نے یورپ کو اپنا شاگرد بنایا اس سے پیش
تر کہ ہم اس کو اپنا استناد بناتے۔

ذاکر صاحب نے ۱۹۲۰ء کے ان ایمان پرور اور ولولہ خیز شب و روز کو ہمیشہ یاد رکھا اور اس کا ذکر بھی اپنی تقریروں، نجی خطوط اور گفتگوؤں میں کرتے رہے، ۱۹۴۶ء میں **جامعہ کے جشنِ سیمیں** کے موقع پر انھوں نے اپنے معرکۃ الآراء خطبے میں کہا:

مجھے وہ وقت یاد ہے اور میرے متعدد ساتھیوں
کو بھی جب علی گڑھ کالج کی مسجد میں ...
(ایک) وجود مقدس دیوار کا سہارا لیے بیٹھا ہے،
ناتوانی کے باعث مجمع کو مخاطب بھی نہیں
کرسکتا اور اس کا پیام اس کے شاگرد مولانا
شبیر احمد عثمانی سناتے ہیں۔ صاحبو! یاد
رکھو وہ جس دیوار کا سہارا لیے بیٹھے تھے وہ
خالی اینٹ پتھر کی دیوار نہ تھی، وہ ایمان محکم
اور اس ایمان کا نتیجہ یعنی ایک عظیم الشان
ملی ماضی کی دیوار تھی ... اس وقت کسی بڑے
مکان کا سنگِ بنیاد نہیں رکھا گیا تھا، کسی
عمارت کا افتتاح نہ ہو سکتا تھا چندوں کا
اعلان بھی نہ ہوا تھا کہ یہ قافلہ سارا سامان
چھوڑ کر بے سرو سامانی کی طرف رواں ہو رہا
تھا۔ یہ وقتی فائدے کے بدلے وقتی نقصان کا سودا
کر رہا تھا، اسے عاجلہ کے مقابلے میں آخرہ زیادہ
عزیز تھی اور اس فضا میں جامعہ ملیہ اسلامیہ

کا کام شروع ھوا تھا ۲۹/اکتوبر ۱۹۲۰ء کو۔

۲۶/اکتوبر ۱۹۶۳ء کو وائس پریسیڈنٹ ھاؤس، نئی دھلی سے جامعہ کے اولڈ بوائے اور اس وقت کے پرسنل سیکریٹری شیخ الجامعہ **پروفیسر محمد مجیب**، **عبداللطیف اعظمی صاحب** کو ان کے خط کے جواب میں جس میں ۲۹/اکتوبر ۱۹۶۳ء کے **یومِ تاسیس جامعہ** کے موقع کے لیے پیغام کی درخواست کی گئی تھی، **ذاکر صاحب** نے لکھا تھا:

جامعہ کے یوم تاسیس پر دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔ اس دن بہت سی یادیں تازہ ھو جاتی ھیں۔ مولانا محمودالحسن (محمود حسن) مرحوم مغفور کا خطبہ کانوں کو پھر سنائی دینے لگتا ھے۔ بڑے خلوص اور ولولے کے دن تھے وہ۔ اس کیفیت کو قایم رکھنا ،کچھ بدلی ھوئی شکل ھی میں سھی ، جامعہ کے مستقبل کو روشن بنانے اور قومی زندگی میں اس کے مقام کو متعین کرنے میں بہت مدد گار ھو سکتا ھے۔

جامعہ کے پرانے ساتھیوں اور نئے متعلقین کو یہ دن مبارک ھو۔ والسلام

مخلص

ذاکر حسین[۲۱]

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام کا رسمی افتتاح علی گڑھ کالج کی مسجد میں تو ہو گیا تھا لیکن ابھی تک یہ واضح نہ تھا کہ کون سے طلبہ جامعہ کے ہیں اور کون سے ایم اے او کالج کے، رہتے سب ساتھ تھے کالج کے ہوسٹلوں میں یہ صورتِ حال اب باقی نہیں رکھی جا سکتی تھی۔ کالج کے سیکریٹری اس وقت **سید محمد علی** تھے جن کی وفاداریاں سرکارِ برطانیہ سے بہت بڑھی ہوئی تھیں، انھوں نے ۳۰/اکتوبر کو اخباروں میں چھپوایا کہ **مولانا محمد علی** نے زور زبردستی سے

کالج کی عمارت کے چند کمروں کو کھول لیا ہے اور قومی یونیورسٹی میں ’بقول اُن کے‘ داخلہ کرنا شروع کر دیا ہے۔ میں نے آنریری سیکرٹری کی حیثیت سے ان کو یہ نوٹس دیا ہے کہ ۳۰/اکتوبر کو وہ ساڑھے تین بجے سہ پہر تک کالج کے احاطے کو چھوڑ دیں اور کالج کے حدود میں کوئی میٹنگ نہ کریں۔ **مولانا محمد علی** نے جو اولڈ بوائز لاج میں ٹھہرے ہوئے تھے، ان احکامات کو نظر انداز کر دیا۔

اس دوران کئی با اثر اور ممتاز طلبائے قدیم **مولانا** سے ملے اور انھیں اس بات پر راضی کرنا چاہا کہ وہ قومی یونیورسٹی کہیں اور قایم کر لیں، کہا جاتا ہے کہ **عبدالمجید خواجہ**، **ڈاکٹر انصاری** اور کچھ دوسرے لوگ اس بات سے متفق ہو گئے لیکن **مولانا محمد علی** کا اصرار تھا کہ ایم اے او کالج ہی کو قومی یونی ورسٹی میں تبدیل کر دینا چاہیے۔[۲۲]

یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی اگر اس واقعہ کا ذکر کر دیا جائے جو بعض طلبائے جامعہ کو ۱۹۲۳ء میں پیش آیا۔ **مرحوم سعید انصاری** اس واقعے کے راوی ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ ایک موقع پر **مولانا محمد علی** کی خدمت میں انجمن اتحاد کی طرف سے ایک **سپاس نامہ** پیش کیا گیا جس میں یہ کہا گیا تھا کہ جامعہ میں ایک عرصے تک **مولانا** کی عدم موجودگی سے جامعہ کو خاصا نقصان پہنچا تھا، اس کے بعد جامعہ کے اساتذہ و طلبہ کے جذبات کا اظہار **غالب** کے اس مصرعے کے ذریعے کیا گیا تھا:

> وہ جو ہم رکھتے تھے ایک حسرت تعمیر سو ہے

مولانا نے اپنی تقریر میں کہا:

> ہم نے تعمیر کا ارادہ ہی کب کیا تھا جو آپ لوگ اس کی حسرت دل میں رکھتے ہیں۔

اور پھر علی گڑھ اور جامعہ کی تشریح اس طرح فرمائی:

> بھئی، ہماری حالت تو اوائل مسلمانوں کی سی ہے۔ ہمارا اصل کعبہ تو علی گڑھ کالج ہے۔ جامعہ کی زندگی تو ہجرت کی زندگی ہے۔ ہمیں پھر مکہ کو دوبارہ فتح کرنا ہے۔[۲۳]

ظاہر ہے کہ **مولانا محمد علی** جب 'فتح مکہ' کا ارادہ رکھتے تھے تو کیسے اپنے آپ کالج کے حدود سے باہر چلے جاتے۔ **ڈاکٹر اشرف** جو **ترکِ موالات** کرنے والے طلبہ میں شامل تھے، لکھتے ہیں:

بیعت رضواں کا وہ دن بھی ہمیشہ یاد رہے گا
جب اس سالار قافلہ نے ہم سب کو اکیلے اکیلے
بلا کر پکی باریک کے ایک تنگ و تاریک کمرے میں
کلام پاک پر عہد لیا تھا کہ جب تک انگریزی
اقتدار کا خاتمہ نہ ہو ہمارے لیے برطانوی
حکومت سے کسی حالت میں تعاون جائز نہیں ہے۔
اس عہد و پیمان نے جانے میری طرح کتنے
نوجوانوں کو ایک نئی زندگی اور ایک نیا حوصلہ
بخشا اور ہم نے طے کیا کہ اب ہماری زندگی قومی
جدو جہد اور وطنی آزادی کے لیے وقف ہے۔

۳۰/ اکتوبر کو یہ افواہ اڑائی گئی کہ **مولانا محمد علی** نے طے کیا ہے کہ وہ پرنسپل کے کمرے اور آفس پر قبضہ کریں گے۔ ٹرسٹیز نے علی گڑھ کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ **مسٹر کیمپل** سے مدد چاہی، وہ تو اس کے لیے تیار ہی بیٹھے تھے، چنانچہ **۳۱/ اکتوبر** کو صبح ساڑھے پانچ بجے مسلح پولیس کے ساتھ انھوں نے **اولڈ بوائز لاج** کو گھیر لیا اور **مولانا محمد علی** سے لاج کو فوراً چھوڑ دینے کے لیے کہا، **مولانا محمد علی** طلبہ اور دیگر حضرات کے ساتھ ایک جلوس کی شکل میں کالج کی مسجد میں پہنچے، فجر کی نماز اور **سرسید** کے مزار پر فاتحہ پڑھی اور پولیس لاریوں میں بیٹھ کر بدر باغ کے قریب **کشوری لال** کی ایک عمارت میں جسے پہلے ہی سے کرایے پر لے لیا گیا تھا، اُترے۔ وہاں کوئی بیس خیمے بھی نصب کیے گئے تھے، اب یہی جامعہ ملیہ اسلامیہ تھی۔[۲۴]

کیا عجب کہ **مولانا محمد علی** کے ذہن میں خود انہی کا یہ شعر اُس وقت گونج رہا ہو جب ان کی قیادت میں **ترکِ موالات** کرنے والے اساتذہ وطلبہ کی یہ جماعت جو اس وقت کی جامعہ ملیہ تھی **سرسید** کے مزار پر فاتحہ پڑھ کر پولیس کی لاریوں میں بیٹھ رہی تھی:

سکھایا تھا تم ہی نے قوم کو یہ شور و شر سارا
جو اس کی انتہا ہم ہیں تو اس کی ابتدا تم تھے

اور یہیں ایک بار پھر **ذاکر صاحب** کے یہ جملے یاد کر لیجیے:

... سعادت مندی اور وفا شعاری کے ساتھ خود اختیارانہ اس علمی بستی کے نظام کی پابندی کو عین آزادی جانا، پر جب اس نظام کو ضمیر کے مطالبوں سے ٹکراتا پایا تو اس سے بغاوت کی طاقت بھی اسی چشمۂ حیات سے ارزانی ہوئی۔ باغی بنے ، نکالے گئے۔ دوسری بستی بسانے میں ایک ربع صدی کاٹ دی، مگر اس مادرِ علمی کی طرف سے دل میں کبھی کوئی تلخی محسوس نہیں کی۔ بَن باس میں بھی دل اس میں اٹکا رہا۔

❍

ذاکر صاحب ۱۹۲۲ء میں جرمنی چلے گئے، لیکن ان کے جامعہ کے احباب انھیں جامعہ کے حالات سے باخبر رکھتے تھے، **گاندھی جی** **ترکِ موالات** کی تحریک میں بہت سے سیاسی رہنما اور کارکن گرفتار کیے گئے تھے اور ملک کی مختلف جیلوں میں قید و بند کی زندگی گزار رہے تھے، حکومت کے سخت رویے نے بھی کمزور دل والوں کی ہمتیں پست کر دی تھیں، خلافت کے تقریباً سبھی رہنما پکڑے گئے تھے، **ذاکر صاحب** ستمبر کے مہینے میں جرمنی پہنچے تھے، اسی سال شروع میں (فروری ۱۹۲۲ء) چوری چورا ، اور چند دوسرے مقامات پر تشدد کے واقعات کی وجہ سے **گاندھی جی** نے اپنی **ترکِ موالات** کی تحریک واپس لے لی۔ اُدھر جنگِ عظیم کے بعد ترکی میں **ترک** قوم پرستوں نے صلح نامہ سیورے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا اور برطانیہ کی شہ اور پشت پناہی سے **یونانیوں** کی جو فوج تیزی سے انقرہ کی طرف بڑھ رہی تھی اُسے سکاریہ کی لڑائی، **مصطفیٰ کمال** کے ہاتھوں ایسی شکست ہوئی کہ **ترک فوجیں**، **یونانیوں** کا اِزمِر (پرانا نام: سمرنا) تک تعاقب کرتی چلی

گئیں اور پھر ازمِر سے بھی انھیں بھگا کر سمندر میں ڈھکیل دیا۔ ترکوں کی اس قومی جنگ میں 'خلیفۃ المسلمین' کا رول سخت مایوس کن تھا، اور نیشنلسٹ ترکوں کو خلیفہ اور خلافت کے ادارے سے جذباتی تعلق بھی باقی نہیں رہ گیا تھا۔ خود دنیائے اسلام میں، اور خاص طور پر اس برصغیر (ھندوپاک وبنگلہ دیش) میں، اُس وقت کے سب سے بڑے ہیرو مصطفیٰ کمال تھے جن کی قیادت میں رفتہ رفتہ جمھوریۂ ترکیہ کی نیشنل اسمبلی نے پہلے تو خلیفہ کے اختیارات محدود کیے اور پھر مارچ ۱۹۲۴ء میں خلافت ہی کا خاتمہ کردیا۔ ھندوستان کی تحریکِ خلافت کا یہ بہت بڑا نشیب تھا، اِس نشیب کے کچھار میں شیر دل مولانا محمد علی نے بہت پیچ وتاب کھایا، کمال اتاترک کو تار دیا کہ ہندوستانی مسلمانوں کے نمائندوں کا ایک وفد ترکی جائے گا جو ان سے مسئلہ خلافت پر تبادلۂ خیال کرے گا، لیکن انھیں اس تار کا کوئی جواب نہیں ملا، اور جیسا کہ مجیب صاحب نے لکھا ہے کہ انھیں بعد میں خالدہ ادیب خانم سے معلوم ہوا کہ ھندوستان کی خلافت کمیٹی نے جو رقمیں ترکی بھیجی تھیں انھیں مصطفیٰ کمال نے اپنی پارٹی کی تنظیم پر خرچ کیا۔[۲۵]

دیکھا جائے تو اب خلافت کمیٹی کے باقی رہنے کا کوئی جواز نہیں رہ گیا تھا اور ہوا بھی یہی کہ رفتہ رفتہ اس کی سرگرمیوں کا دائرہ محدود ہوتا گیا، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام کا فوری سبب خلافت اور ترکِ موالات کی تحریکیں تھیں، انہی سے جامعہ کو اس وقت تقویت حاصل تھی، ان میں سے اب جب کہ ایک ختم ہوگئی تھی اور دوسری بے جان تھی، تو ہم جامعہ کی مشکلات کا اندازہ کرسکتے ہیں۔ جامعہ، خلافت کمیٹی کی مالی امداد سے چلتی تھی، یہ امداد پہلے تو کم ہوئی کہ خود خلافت کمیٹی کی آمدنی کم ہوگئی تھی، اور پھر بند ہوگئی۔ فی الحال جامعہ کے پاس آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ تھا اور اس کے بیش تر ٹرسٹیز میں، قومی تحریکوں کی ناکامی کے سبب جن کے حوصلے پست تھے اس کے بند کردیے جانے کے چرچے ہونے لگے تھے۔ خود مولانا محمد علی کے یہاں بھی جو درحقیقت اپنے کعبۂ مقصود یعنی علی گڑھ کالج کو فتح کرنے اور اسی کو قومی یونیورسٹی بنانے کا خواب دیکھا کرتے تھے، اب جامعہ کو قایم رکھنے کے سلسلے میں وہ پہلے جیسا جوش وخروش نہیں پایا جاتا تھا، لیکن رہنماؤں میں گاندھی جی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری اور عبدالمجید خواجہ قومی زندگی میں جامعہ ملیہ جیسے آزاد تعلیمی ادارے کی اہمیت کو خوب سمجھتے تھے اور ان کی دلی خواہش تھی کہ یہ قایم

رہے اور ترقی کرے۔ ان کے علاوہ جامعہ کے اساتذہ، سینیر طلبہ اور کارکنوں کی ایک **مخلص** جماعت بھی اپنے خونِ جگر سے سینچے ہوئے اس پودے کو زندہ اور سرسبز و شاداب دیکھنا چاہتی تھی۔ اپنے اس کڑے وقت میں انھوں نے **ذاکر صاحب** کو بہت یاد کیا، انھیں اس کا یقین تھا کہ **ذاکر صاحب** جیسا مخلص، شریف النفس، باہمت اور حوصلہ مند نوجوان جرمنی سے واپس آ کر **جامعہ** کو چھوڑ کر کہیں اور نہ جائے گا۔ ان لوگوں نے انھیں تار بھجوایا:

> فاؤنڈیشن کمیٹی جامعہ ملیہ کو بند کرنے کا ارادہ رکھتی ہے، آپ کا کیا مشورہ ہے"؟ جواب آیا: "میں اور میرے چند ساتھی جامعہ کی خدمت کے لیے اپنی زندگی وقف کرنے کو تیار ہیں۔ ہمارے آنے تک جامعہ کو بند نہ ہونے دیا جائے۔[۲۶]

غالباً یہی زمانہ ہے جب **برلن** میں ایک دن **ذاکر صاحب** نے **عابد صاحب** اور **مجیب صاحب** سے **جامعہ** اور اس کی مشکلات کا ذکر بڑی فکرمندی سے کیا اور کچھ اس طرح کی بات کی کہ انھوں نے فیصلہ کیا ہے کہ انھیں ہندوستان واپس جا کر اس کے کام میں ہاتھ بٹانا ہے، نتیجہ خواہ کچھ بھی ہو۔ **عابد صاحب** نے پیش کش کی کہ وہ بھی **جامعہ** میں کام کریں گے۔ اس پر **مجیب صاحب** نے بھی **جامعہ** کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔ **ذاکر صاحب** نے ان کی طرف کچھ شبہے کی نگاہ سے دیکھا اور تھوڑی دیر بعد کہا:

> نہیں، آپ کو یہ نہیں سوچنا چاہیے۔ جامعہ آپ کے لیے موزوں جگہ نہیں ہوگی۔ آپ وہاں چل کر کیا کریں گے۔" انھوں نے کہا کہ "جو آپ کریں گے وہی میں بھی کروں گا۔

ذاکر صاحب نے کہا: "میرا معاملہ مختلف ہے۔ میرا تو یہ عہد ہے۔"

لیکن جب **مجیب صاحب** نے اصرار کیا تو **ذاکر صاحب** نے کہا:

> اگر میں آپ کو اپنے ساتھ لے چلوں اور ایک ویران میدان میں پہنچ کر کہوں کہ جامعہ ملیہ

یھی ھے تو کیا آپ اسے یقین کرلیں گے۔" مجیب صاحب نے کھا : "اگر آپ کھیں تو میں یقین کرلوں گا۔" اس پر ذاکر صاحب نے انھیں گلے لگالیا اور کھا "اچھا آپ بھی جامعه چلیے۔"[۲۷]

ذاکر صاحب کا جواب پا کر طلبہ کا ایک وفد دھلی جا کر **حکیم اجمل خاں مرحوم** سے ملا اور اُن سے درخواست کی کہ **ذاکر صاحب** کے آنے تک وہ جامعہ کو بند نہ ہونے دیں۔ ان طلبہ نے **حکیم صاحب** کو جامعہ کے لیے اپنی طرف سے ہر طرح کے ایثار اور قربانی کا بھی یقین دلایا۔ اس پر انھوں نے اس وفد کو اطمینان دلا کر واپس علی گڑھ بھیج دیا۔۲۸ اور ۲۹ر جنوری ۱۹۲۵ء کو دھلی میں **حکیم صاحب** کی رہایش گاہ 'شریف منزل' میں فاؤنڈیشن کمیٹی کے جلسے ہوئے جس میں بالآخر یہ طے پایا کہ جامعہ کو جاری رکھا جائے اور اس کو مستحکم بنانے کی تدبیریں کی جائیں گی۔ ۲۹ر جنوری کے جلسے میں **گاندھی جی** بھی موجود تھے۔ انھوں نے **حکیم صاحب** کی ہمت بندھائی اور کہا کہ مشکلات اور مالی پریشانیوں کے باوجود جامعہ کو تو چلانا ہی ہوگا، چاہے اس کے لیے مجھے بھیک مانگی پڑے، **گاندھی جی** کی اس پیش کش پر ۱۷ر مارچ ۱۹۲۵ء کو **حکیم صاحب** نے فاؤنڈیشن کمیٹی سے جس کا جلسہ علی گڑھ میں ہوا تھا، یہ منظور کرالیا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کو علی گڑھ سے منتقل کر دیا جائے[۲۸] اور شیخ الجامعہ (**عبدالمجید خواجہ**) کو ہدایت کی گئی کہ وہ آئندہ جون میں جامعہ کو دھلی لے جانے کے لیے ضروری انتظامات شروع کر دیں۔ چنانچہ ۲۶-۱۹۲۵ء کا جامعہ کا تعلیمی سال قرول باغ، دھلی میں طبّیہ کالج سے متصل کرایے کی چند کوٹھیوں میں شروع ہوا۔

مارچ ۱۹۲۵ء کے اس اہم فیصلے کے بعد کہ جامعہ کو دھلی منتقل کر دیا جائے، **حکیم اجمل خاں مرحوم** نے **ڈاکٹر مختار احمد انصاری** کے مشورے سے یورپ کے سفر کا پروگرام بنایا۔ اس سے پہلے انھوں نے ۱۹۱۱ء میں یورپ کا سفر کیا تھا، اس وقت ان کی زندگی کا نصف النہار تھا، لیکن اس بار ملک کے سیاسی انتشار اور ہندو مسلم مناقشات نے ان کا دل توڑ دیا تھا، ان کی صحت بہت خراب ہوگئی تھی اور یہ گویا اُن کی زندگی کی شام تھی، اور شام بھی کیسی، اُداس اُداس، دھواں دھواں، دل بٹھا دینے والی- یورپ میں وہ طبی ماہرین سے اپنی گرتی ہوئی صحت سے متعلق مشورہ کرنا چاہتے تھے، لیکن غالبًا اس سفر کا ایک

پہلو یہ بھی تھا کہ وہ چند روز کے لیے ملک کی تاریک فضا سے دور رہ کر قدرے سکونِ قلب حاصل کریں۔

اپریل ۱۹۲۵ء کے اواخر میں **حکیم صاحب** پیرس پہنچے جہاں ان کا ایک ماہ قیام رہا، وہیں پیرس میں **ذاکر صاحب حکیم صاحب** سے ملے۔ وہ ۱۹۲۵ء کے شروع میں اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے کے لیے ضروری مواد و ماخذ کی تلاش میں لندن گئے ہوئے تھے۔ لندن سے برلن واپس ہوتے ہوئے **ذاکر صاحب** نے پیرس میں **حکیم صاحب** سے ملاقات کی اور ان میں باہم جامعہ کے مستقبل کے پروگرام کے بارے میں گفتگو ہوئی۔ **ذاکر صاحب** نے انھیں جامعہ کی خدمت کے لیے اپنی زندگی وقف کر دینے کا یقین دلایا[۲۹] اور پیرس سے جب **حکیم صاحب** اور **ڈاکٹر انصاری** سوئٹزرلینڈ کی سیاحت کرتے ہوئے ایک طبی نمایش دیکھنے کے لیے وی آنا (آسٹریا) پہنچے تو **ذاکر صاحب** نے؛ **عابد صاحب**، **مجیب صاحب**، **خواجہ عبدالمجید** اور **برکت علی قریشی** کو **حکیم صاحب** اور **ڈاکٹر انصاری** سے ملنے کے لیے وی آنا بھیجا۔ **ذاکر صاحب** چونکہ **حکیم صاحب** سے مل چکے تھے اور ان دنوں اپنے امتحان کی تیاری میں بھی مصروف تھے، اپنے ان دوستوں کے ساتھ وی آنا نہیں گئے۔[۳۰]

حکیم صاحب نے اپنی یادداشت میں لکھا:

> گو! وی آنا ہمارے پروگرام میں نہ تھا لیکن جب
> ہمیں لوزین میں اس طبی نمایش کا حال معلوم
> ہوا تو اسے اس وجہ سے پروگرام میں داخل
> کرنا پڑا کہ ہم طبیہ کالج کے لیے جو چیزیں
> خریدنی چاہتے ہیں ان کے انتخاب کے لیے یہ
> بہترین موقع ہے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے لیے ان عزیزوں نے جو برلن میں تعلیم پا رہے ہیں اور جامعہ کے ساتھ خاص دلچسپی رکھتے ہیں، ایک تعلیمی خاکہ کھینچا تھا۔ اس لیے انھوں نے[۳۱] **برکت علی صاحب**، **خواجہ عبدالمجید صاحب**، **عابد حسین صاحب** اور **مجیب صاحب** کو ہمارے پاس اس غرض سے بھیجا کہ ہم بھی اس تعلیمی اسکیم پر غور کر لیں اور اپنی رائے بھی ان پر ظاہر کریں۔ یہ سب لوگ ۱۰؍جولائی کو وی آنا پہنچے اور اپنی آرزوؤں کا ایک بڑا حصہ ہم لوگوں نے ان اعزہ کی نذر خوشی سے کر دیا۔[۳۲]

حواشی

۱۔ وقارِ حیات —— **محمد اکرام اللہ ندوی،** مطبع: مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۲۵ء، ص: ۵۶۱

۲۔ ایضاً، ص: ۵۶۲

۳۔ ایضاً، ص: ۵۹۱

۴۔ ہسٹر آف دی ایم اے او کالج علی گڑھ —— **ایس کے بھٹناگر،** ایشیا پبلشنگ ھاؤس، ۱۹۶۹ء، ص: ۲۰۴-۱۸۸

۵۔ ایضاً، ص: ۲۰۵

۶۔ ایضاً، ص: ۲۰۶

۷۔ **ذاکر صاحب، مولانا حسرت موہانی** کی شخصیت سے بہت متاثر تھے۔ ۲۴/ نومبر ۱۹۵۱ء کو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں **یومِ حسرت** منایا گیا تھا، اس کا افتتاح کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا: ''یہ جلسہ ایک ایسے شخص کی یاد میں کیا جا رہا ہے جس کا اس ادارہ سے بہت گہرا تعلق ہے **حسرت** کی شخصیت اور شاعری دونوں میں بڑی دلآویزی ہے۔ جس زمانے میں لوگ انقلابی نہیں ہوتے تھے، **حسرت** اُس وقت انقلابی تھے۔ جب لوگ جیل نہیں جاتے تھے اُس وقت **حسرت** نے جیل میں چکی پیسی۔ جب لوگ بم نہیں پھینکتے تھے، اُس وقت **حسرت** بم پھینکنے والوں کے ساتھ تھے۔ اس موقع پر مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا۔ **لارڈ ہارڈنگ** کے زمانے میں ایک بم پھینکنے والا علی گڑھ میں **حسرت** کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا اور اس یونی ورسٹی پر بم پھینکنا چاہتا تھا لیکن **حسرت** نے اس کو بم پھینکنے سے روک دیا، اس لیے نہیں کہ انھیں **لارڈ ہارڈنگ** سے کوئی ہمدردی تھی یا وہ بم پھینکنے کے مخالف تھے۔ بلکہ اس لیے کہ وہ اس دار العلوم سے محبت کرتے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس ادارہ کو کوئی نقصان پہنچ جائے اور اس کا کام چلانے والوں کی راہ میں دشواریاں پیدا ہو جائیں (مسلم یونی ورسٹی گزٹ ۸/ دسمبر ۱۹۵۱ء)

۸۔ **اقبال** کو لندن میں جب اس اسٹرائک کی خبر ملی تو انھوں نے یہ کہتے ہوئے:

اوروں کا ھے پیام اور میرا پیام اور ھے

طلبہ علی گڑھ کالج کے نام کے عنوان سے ایک نظم لکھی تھی اور اس کے ذریعے اپنی سیاسی **مصلحت** پسندی کے پیشِ نظر انھیں یہ خاص مشورہ دیا تھا:

بادہ ہے نیم رس ابھی شوق ہے نارسا ابھی
رہنے دو خُم کے سر پہ تم خشتِ کلیسیا ابھی

۹۔ *The Deoband School and the Demand for Pakistan*

ضیاءالحسن فاروقی، ایشیا پبلشنگ ھاؤس (بمبئی)۱۹۶۳ء،ص:۵۸-۵۶

۱۰۔ *Pathway to Pakistan* — **چودھری خلیق الزماں**،لانگ مینس،۱۹۶۱ء،ص:۱۷/ **چودھری صاحب** ۱۹۰۷ء میں علی گڑھ گئے تھے جہاں وہ ۱۹۱۶ء تک زیرِ تعلیم رہے۔

۱۱۔ **ذاکرصاحب** اس وقت اسلامیہ ھائی اسکول اٹاوہ میں طالب علم تھےاور ہم پہلے یہ لکھ چکے ہیں کہ وہ کس طرح تقریریں کر کے ترکوں کی امداد کے لیے چندہ جمع کرتے اور بھجواتے تھے۔

۱۲۔ **بھٹناگر**،حوالہ سابق،ص:۳۱۳

۱۳۔ کامریڈ،۲۸/دسمبر۱۹۱۲ء،ص:۱۳

۱۴۔ یہی وہ زمانہ ہے جب **ذاکرصاحب** پہلے اٹاوہ اسکول میں اور پھر ایم اے او کالج میں **اقبال** کی شاعری سے متاثر ہوئے،اُن کی نظمیں وہ ایک خاص انداز سے بلند آواز سے پڑھتے یا گنگناتے، بہت سی نظمیں اوراشعار انھیں یاد ہو گئے تھے۔ان اشعار سے وہ اپنی گفتگو اور یونین کے مباحثوں میں بڑا کام لیتے تھے۔

۱۵۔ مہاتما گاندھی — **ٹنڈلکر** (جلد: دوم)۱۹۵۱ء،ص:۱

۱۶۔ ایضاً،ص:۲۸-۲۷

۱۷۔ **محمد مجیب**،حوالۂ سابق،ص:۲۵

۱۸۔ ہمارے ذاکر صاحب — **رشید احمد صدیقی**،ص:۵۸-۵۷

۱۹۔ ڈاکٹر ذاکر حسین – مردمومن — **سیدعابد حسین**، اسلام اور عصرِ جدید ،جولائی۱۹۶۹ء

۲۰۔ جامعہ کی کہانی — **عبدالغفار مدھولی**،کوہِ نور پریس[دھلی]۱۹۶۵ء،ص:۲۲-۲۱

۲۱۔ مشاھیر کے خطوط — **عبداللطیف اعظمی**،مکتبہ جامعہ لمٹیڈ (نئی دھلی) ۱۹۷۵ء،ص:۳۲

۲۲۔ **بھٹناگر**،حوالہ سابق،ص:۳۴۸(بحوالہ: انسٹی ٹیوٹ گزٹ بابت:نومبر۱۹۲۰ء)

۲۳۔ 'جامعہ ملیہ اسلامیہ' رسالہ: جوھر،(**جامعہ جوبلی نمبر**) — **سعید انصاری**،۱۹۶۴ء،ص:۵۵-۵۴

۲۴۔ **بھٹناگر**،حوالہ سابق،ص:۳۴۸

۲۵۔ ذاکر حسین – اے بایو گریفی — **محمد مجیب**،ص:۴۰

۲۶۔ **عبدالغفار مدھولی**،حوالہ سابق،ص:۶۹

۲۷۔ مجیب صاحب کی خود نوشت سوانح — **محمد مجیب** (تلخیص وترجمہ: **ضیاءالحسن فاروقی**، رسالہ: جامعہ (**مجیب نمبر**) بابت: ماہ ستمبر،اکتوبر۱۹۸۶ء،ص:۳۷-۳۶،مزید دیکھیے: **محمد مجیب**،حوالہ سابق،ص:۴۱

۲۸۔ اس سلسلے میں **مولانا شوکت علی** اوران کی پارٹی جامعہ کے 'نقلِ مکانی' کےحق میں نہ تھی۔

۱۱؍فروری ۱۹۲۵ء کو **حکیم صاحب** نے **عبدالمجید خواجہ** کو لکھا:

......مولانا شوکت علی صاحب سے باتیں ہوگئیں۔ ڈاکٹر انصاری اور میں نے اس عزم کا اظہار کردیا کہ جامعہ دہلی ہی میں آنی چاہیے۔ اگر ایسا نہ ہوگا تو ہم لوگ اپنی ذمے داری سے جدا ہوجائیں گے۔ بالآخر وہ خاموش ہوگئے۔ اب آپ یہ سمجھ لیں کہ جامعہ کو دہلی ہی میں لانا ہے۔

(*عبدالمجید خواجہ*، پیرس، نہرو میموریل میوزیم اینڈ لائبریری، نئی دہلی)

۲۹۔ شیخ الجامعہ **عبدالمجید خواجہ** کو **حکیم صاحب** نے ۴؍مئی ۱۹۲۵ء کو پیرس سے لکھا تھا:

ذاکر بھی لندن میں ہیں اور غالباً ایک ہفتہ کے بعد ملنے کے لیے وہ بھی آئیں گے، اور ممکن ہوا تو پیرس سے ہمارے ہم سفر ہوجائیں گے۔ وہ برلن اور ہم سوئٹزرلینڈ چلے جائیں گے۔ آج ان کا خط لندن سے آیا تھا۔ جامعہ ملیہ کے نقلِ مکان سے جس کے مکانوں کا غالباً آپ نے بھی ابھی تک انتظام نہیں کیا ہوگا، وہ بہت خوش معلوم ہوتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ ہم چھے آدمی برلن سے اور غالباً دو لندن سے جامعہ ملیہ کے لیے اپنی زندگیاں وقف کرچکے ہیں۔ یہ بھی لکھا تھا کہ امید ہے کہ یہ لوگ حبیب اور ہادی کی سنت کی پیروی کرنے والے ثابت نہ ہوں گے۔"

(**عبدالمجید خواجہ**، پیرس، نہرو میموریل میوزیم اینڈ لائبریری، *نئی دہلی*)

پروفیسر محمد حبیب اور **ڈاکٹر ہادی حسن** عدم تعاون کر کے جامعہ ملیہ آ گئے تھے، لیکن تھوڑے دنوں بعد وہ جامعہ چھوڑ کر مسلم یونیورسٹی کے اسٹاف میں شامل ہوگئے، **حکیم صاحب** کے خط میں اشارہ انہی دونوں بزرگوں کی طرف ہے۔

۳۰۔ **کے اے حمید**، حوالہ سابق، ص: ۴۶

۳۱۔ یہ اشارہ خاص طور پر **ذاکر صاحب** کی طرف ہے۔

۳۲۔ حیاتِ اجمل — **قاضی محمد عبدالغفار**، ص: ۳۵۳-۳۵۱

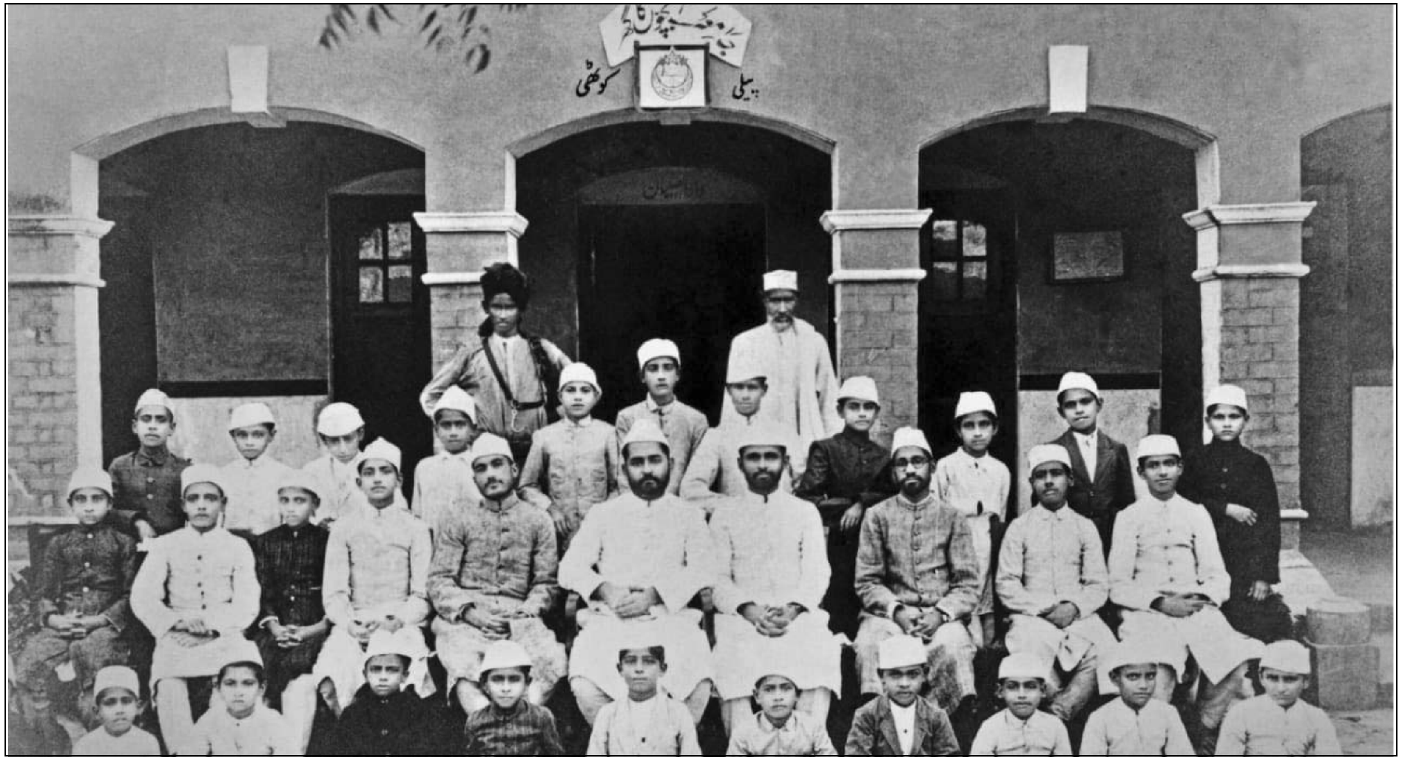

جامعہ کے بچوں کا گھر —— پیلی کوٹھی

جامعہ ملیہ اسلامیہ
کے
بانیِ اول

مولانا عبدالماجد دریابادی

محمد علی اپنی زندگی بھر کچھ نہ کرتے صرف جامعہ ہی کی بنیاد ڈال جاتے تو یہی ایک کارنامہ سرمایۂ عمر ہونے کے لیے کافی تھا۔ **اللہ** کا یہ شیر تو اس کے علاوہ بھی کچھ کر دھر کے دنیا سے اٹھا۔

ہائے کیا زمانہ وہ ۱۹۲۰ء کے آخر اور ۱۹۲۱ء کے نصف اول کا تھا! کتنا جوش و خروش اور اخلاص تھا کہ سینوں سے ابلتا ہوا، امنڈتا ہوا، ایثار تھا کہ عہدِ صحابہ کا نمونہ دنیا کو ایک بار پھر دکھا رہا تھا۔ بوڑھے، جوان، بچے، مرد اور عورت، سب اپنے اپنے رنگ میں مست! '**کل کی فکر میں آج**' کو تجے ہوئے '**آجل**' کے خیال میں '**عاجل**' کو بھولے ہوئے چھوڑے ہوئے۔ **محمد علی** ان دیوانوں سرفروشوں کے لشکر کا سردار۔

تلقین یہ شروع کی کہ ایسی خدا فروش و مذہب دشمن حکومت جو خلافتِ اسلامیہ سے برسرِ پیکار ہو۔ اس سے اور اس کے ملحق اداروں اور محکموں سے کسی طرح کا تعلق جائز نہیں۔ اس کے

عہدے،اس کے منصب 'سب بحکم عکائے تو بلقان تو'اس کی طرف قابلِ واپسی پھر سرکاری اور نیم سرکاری تعلیم جو ان سارے تعلقات کے لیے سنگِ بنیاد ہے وہ تو بدرجۂ اولیٰ قابلِ ترک ولائقِ احتراز،تو اب مسلمانوں کے بچے کریں کیا؟ کریں یہ:

این سررشتۂ تعلیم مادرِ دست ما باشد

اپنی تعلیم اپنے ہاتھ میں لیں۔نصاب اپنا ہو،استاد اپنے ہوں،تعلیمی ماحول اپنا ہو۔

پیام لے کر رخ پہلے علی گڑھ کا کیا کہ وہیں کے یہ ساختہ پرداختہ تھے اور وہی ان کی سب سے بڑی امید گاہ تھی۔پیام سہل اور معمولی نہ تھا۔ایک مستقل انقلاب کی دعوت تھی اور انقلاب کا رجز کن کانوں کو خوش گوار معلوم ہوا ہے؟ لڑکوں میں چند سعید روحوں نے بڑھ کر لبیک کہا باقی ہر طرف سے انکار وملامت ہی کے آوازے بلند ہوئے۔**محمد علی** جس گڑھ کو اپنا سمجھ رہے تھے اس سے پولیس کے ڈنڈوں اور سنگینوں کے سائے میں نکالے گئے۔

داستان بڑی طویل اور دردناک ہے حالات کا اندازہ کرنے کے لیے اس وقت کے اخبارات کے فائلوں کا مطالعہ ناگزیر ہے۔علی گڑھ کے متضاد تاروں سے روزناموں کے کالم کے کالم لبریز ہوتے تھے۔کم تر کوئی مصیبت تھی جو **محمد علی** اور ان کے جواں ہمت رفیقوں کو جھیلنی نہ پڑی ہو۔رسمِ افتتاح کے لیے **شیخ الہند مولانا محمود حسن** کا وجود مقدس ہاتھ آ گیا اور بے سروسامانی کے اسی عالم میں جامعہ ملیہ اسلامیہ قایم ہوگئی۔وہی جامعہ جس نے ایک فرزندِ رشید **ڈاکٹر ذاکر حسین خاں** کی صورت میں پیدا کر دیا۔

کلاسیں درختوں کی چھاؤں میں ہونے لگیں،لڑکوں کے رہنے سہنے کے لیے خیمے نصب ہوگئے۔**محمد علی** سب ہی کچھ تھے۔چندہ بھی لائیں۔پرنسپل کے فرائض بھی انجام دیں۔استادوں کا انتخاب کریں۔نصابِ درس بھی ہر مضمون کا شروع سے لے کر بی اے تک کا مرتب کریں! عین اسی عالم میں جب ذرا سے بھی سکون سے سانس لینے کی نوبت آئی،اس نیاز کیش کو جس کی شہرت چند روز قبل تک پورے ملحد ہونے کی تھی اور بجا تھی جنوری ۲۱ء میں خط لکھا کہ فلسفے کی پروفیسری کی جگہ تمہارے لیے روکے ہوئے ہوں۔لیکن مذہب علم سے زیادہ عزیز ہے۔اس کی طرف سے اطمینان دلا دو تو بے تکلف چلے آ ؤ۔خط کی اصل عبارت مکتوبات **محمد علی** وغیرہ کے سلسلے میں بار بار چھپ چکی ہے۔یہ محض خلاصہ درج ہوا ہے۔

اس غرض سے مقصود یہ دکھانا ہے کہ **محمد علی** کو مذہب کس درجہ عزیز تھا اور وہ ہر معاملے کو مذہب کی عینک سے دیکھنے کے کس قدر عادی تھے۔ حقیقتاً وہ مذہبی دیوانے تھے۔ انھیں غلط سمجھا اس نے، جس نے انھیں سیاسی فرزانہ خیال کیا۔ جامعہ قایم کرنے سے ان کی خدمت بھی ہو جائے۔

'پانیر' نے جو اس وقت تک تمام تر انگریزی ہاتھوں میں تھا، **مولانا** کی زندگی ہی میں ایک مضمون ان پر لکھا تھا جس کا حاصل یہ تھا:

> یہ ہندوستان کا وہ ذہین اور طباع شخص ہے
> جو کوئی تعمیری کام اپنی یادگار نہیں چھوڑے
> جارہا ہے۔ اس خیال کی تردید کے لیے جامعہ
> ملیہ اسلامیہ کا وجود بالکل کافی ہے جو ایسی
> سعید اولاد چھوڑ جائے اسے یہ کہنا کہ وہ لاولد
> اٹھ گیا، کیسی صریح زیادتی اور ظلم ہے۔
> (رسالہ: جوہر [جوبلی نمبر]

زمانہ یہی تھا جب **مہاراج** کے خاص **لیفٹیننٹ شری این سی کیلکار** پونا کے ایک پُرجوش **انگریزی** ہفتہ وار: 'مرہٹہ' کے ایڈیٹر تھے انھوں نے کہیں اپنے پرچے میں **گؤ رکشا** کی حمایت میں کوئی سخت مضمون لکھ دیا کہ ذبیحہ گاؤ اب اتحاد کی خاطر بند ہونا چاہیے۔ **محمد علی** کے ہاتھ میں کوئی اخبار اس وقت نہ تھا، 'کامریڈ' بند تھا اور تمام تر جامعہ ملیہ کی پرورش و پرداخت میں منہمک تھے۔ اس مضمون کو پڑھ کر تڑپ گئے اور اسے مسلمانوں کے لیے ایک دھمکی سمجھے۔ مرحوم **حسن حیات علیگ** (جو بعد کو **نواب صاحب بھوپال** کے سیکرٹری ہوئے اور اس وقت **مولانا** کے سیکرٹری تھے) کی روایت ہے کہ **مولانا** نے اس مضمون کے جواب میں ایک بہت ہی سخت خط **کیلکار** کے نام لکھا اور **حیات صاحب** کو ڈاک میں ڈالنے کے لیے دیا۔ مضمون یہ تھا کہ ذبیحہ گاؤ سے تو میں خود رام پوری ہونے کے عرصہ سے محترز ہوں اور اپنے ماننے والوں کو مشورہ بھی دیتا رہتا ہوں لیکن اگر اس باب میں مسلمانوں پر ذرا بھی جبر کا پہلو پیدا ہوتا ہے تو یہی نہیں بلکہ خاص مہاراشٹر، پونا آکر اپنے ہاتھ سے گائے ذبح کروں گا۔ **حیات مرحوم** جو **مولانا** کے بڑے مزاج شناس تھے، کہتے تھے کہ یہ خط اگر مکتوب الیہ کو پہنچ گیا ہوتا تو ایک

قیامت برپا ہوکر رہتی پھر اب یاد نہیں کن حیلوں بہانوں سے کام لے کر انھوں نے خط کی روانگی موقوف کرادی۔

اور اسی طرح کے واقعات کوئی ایک یا دو یا محض اتفاقی نہیں اپنے اخبارات: کامریڈ وہمدرد' میں اسے بار ہا لکھا اور اپنی بے شمار تقریروں میں اسے بار ہا دہرایا کہ میں تو انگریزی حکومت کا بھی وفادار رہوں۔ میری بغاوت بس اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب حکومت کی مداخلت دین ومذہب میں ہونے لگتی ہے۔ میری حب الوطنی سیاسی نہیں تمام تر مذہبی ہے۔ اپنے وطن یعنی جائے سکونت اور جائے پیدایش کے ساتھ محبت تو ایک امر طبعی ہے۔ انسان کیا معنی کتے اور بلّی جانوروں تک میں ہوتی ہے لیکن میں جو وطن کا سپاہی بنا پھرتا ہوں اور ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد کررہا ہوں تو اس لیے کہ یہ عین میرے مذہب کی تعلیم ہے۔ میرے خدا نے جو حقوق مخلوقات کے قایم کیے ہیں ان میں ایک بڑا حق وطن کا بھی ہے۔ دوسرے لوگ اس جنگِ آزادی میں اگر شریک ہیں تو کسی دنیوی نفع کی خاطر، لیکن میں تو اس جہاد کو اور سلطانِ جابر کے سامنے کلمۂ حق کہنے کو ایک فریضۂ دین سمجھ رہا ہوں۔

وسط ۱۹۲۸ء ہے اور **مولانا** ذیابیطس کا علاج کرانے ایک رئیس کے خرچ پر برطانیہ گئے ہوئے ہیں۔ میں روزنامہ: ہمدرد' کے نگراں کی حیثیت سے دھلی میں چندنوں سے مقیم ہوں۔ دفتر کامریڈ' میں ولایتی اخبارات بھی متعدد آتے رہتے ہیں۔ ایک روز ایک لندنی اخبار میں دیکھتا کیا ہوں یہ خبر چھپی ہوئی موجود ہے کہ کل ایک مسلمان کو پارلیمنٹ کی گیلری (غلام گردش) میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا گیا جو یہاں کے لیے ایک نئی بالکل نئی چیز تھی۔ خبر پڑھتے ہی ہم لوگوں کی زبان سے بے اختیار نکلا کہ یہ سوا **مولانا** کے اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ برسوں سے یہی دھن تھی اور بار بار یہی کیا کرتے تھے کہ جب سے پہلی نظر بندی اور اسیری ۱۹۱۴ تا ۱۹۱۸ء کے زمانے میں **قرآن مجید** کے معنی سمجھ کر پورا پڑھا اور تجدیدِ ایمان کی ہے بس تبلیغ کا ایک نشہ سوار ہے۔ دل میں یہی ارمان ہے کہ یورپ بھر میں گھوم پھر کر اس کی منادی کرتا رہوں کہ میرے پاس کیسا انمول خزانہ امن وراحت کا (یعنی **قرآن مجید**) موجود ہے اس نعمتِ بے بہا کو ایک ایک تک پہنچادوں اور ہر اسٹیشن پر ہر پارک میں ہر چوراہے پر نماز پڑھ کر ان لوگوں کو مانوس کراؤں اس لیے جو لوگ بدکتے اور بھڑکتے ہیں ان کی وحشت کو دور کرنا اپنے فرائض میں سے ہے۔

آخر عمر میں کئی سال سے فجر کے وقت اٹھنے سے ذرا معذور ہو گئے تھے۔ ذیابیطس کی زیادتی سے رات کو پیشاب کے لیے بار بار اٹھنا پڑتا ہے۔ اس میں بارہا فجر کے وقت اٹھنے میں دیر ہو جاتی اور نماز قضا پڑھنا پڑتی مگر دیر جتنی بھی ہو جائے نماز جب پڑھتے پورے اطمینان اور تعدل ارکان کے ساتھ جلدی جلدی لشتم پشتم نماز ختم کر ڈالتے، میں نے انھیں ایک بار بھی نہیں دیکھا اور یہی حال ان کی تلاوتِ قرآن کا تھا۔ روزانہ التزام کے ساتھ تلاوت کا وقت تو نہ نکال پاتے لیکن جب بھی انھیں پڑھتے دیکھتا یہی جی میں آیا کہ بس دیکھتے ہی رہیے۔ جن آیتوں میں یہ مضمون ہوتا کہ یہ منافقین اللہ سے نہیں ڈرتے اور بندوں کی رضا جوئی کی فکر میں رہتے ہیں۔ انھیں بڑے تاثر کے ساتھ پڑھتے۔ ان کی تکرار کرتے جاتے، جھومتے جاتے اور آنکھوں سے آنسو بہے جاتے۔

یہی حال تقریروں کا تھا۔ حمیت دینی اور غیرتِ ایمانی کا کوئی پہلو آجاتا اور کسی تقریر میں کیوں نہ آتا بس بے چین ہو جاتے۔ خود بے اختیار روتے اور دوسروں کو رُلا رُلا کر چھوڑتے اور ویسے دیکھیے تو بڑے زندہ دل بذلہ سنج ولطیفہ گو ہنسنے ہنسانے والے۔ خلافت کانفرنس کے اجلاس میرٹھ کی یہ تقریر سننے والوں کے کانوں میں برسوں گونجتی رہی، جس چیز میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی رضا سمجھتے بس اس کے سامنے دنیا کی کسی بڑی سے بڑی ہستی کی بھی پرواہ نہ رکھتے۔ اپنی والدہ کا یوں بڑا احترام کرتے (اور واقعی وہ محترمہ ہر طرح قابلِ احترام تھیں بھی) لیکن جب لڑکیوں کا شادی کا مسئلہ چھڑا تو **محمد علی** نے صاف عرض کر دیا کہ آپ پر اپنی اولاد کے فرائض عائد تھے اور انھیں آپ نے خوب ہی انجام دیے لیکن اب سوال میری اولاد کا ہے اور اس کے متعلق ذمے داریاں **اللہ** اور **رسولؐ** نے میرے سر رکھی ہیں۔ انھیں مجھ ہی کو انجام دینے دیجیے۔ اپنے مرشد (**مولانا عبدالباری فرنگی محلی**) سے علاوہ عقیدت کے انتہائی محبت بھی رکھتے تھے اور مالی ومعاشی حیثیت سے بھی ان کے ممنون احسان وکرم تھے لیکن جب مسئلہ حجاز میں ۱۹۲۲ء میں انھیں **شریف حسین** کا اور اپنے کو **سلطان سعود** کا حامی پایا اور لوگوں نے خلافِ مرشد راہ اختیار کرنے پر طنز وملامت شروع کی تو تقریروں وتحریروں میں صاف کہنا شروع کر دیا کہ میں نے بیعت فنافی الشیخ ہونے کے لیے نہیں کی تھی۔ **اللہ** اور اس کے **رسولؐ** کی رضا کا راستہ جاننے کے لیے کی تھی۔ مرشد کی اطاعت اسی وقت تک کروں گا جب تک وہ راہِ **مولا** مجھے دکھاتے رہیں لیکن جہاں دیکھوں گا کہ خود انھیں کے قدم کو لغزش ہو رہی ہے تو اپنا فرض سمجھوں گا کہ ان کی رہنمائی کروں۔

محبت اپنے بڑے بھائی **شوکت علی** سے بھی بے پناہ تھی لیکن جب دیکھتے کہ وہ دوسروں کی مروت میں آکر یا کسی اور خارجی اثر سے راہِ حق سے ہٹ رہے ہیں معاً ان کا ساتھ چھوڑ دیتے اور اس سے بڑی دلی کوفت اٹھاتے پھر بھی اپنی راہِ حق نہ چھوڑتے اور جب یہ معاملہ عزیز ترین عزیزوں کے ساتھ تھا تو **گاندھی جی** اور دوسرے سیاسی رفیقوں کا کیا ذکر ہے **جگر** کا ایک مصرع ہے:

میں چمن میں چاہے جہاں رہوں میرا حق ہے فصلِ بہار پر

یہی حال **محمد علی** کا تھا۔ کانگریس کے جلسوں میں ہوں یا کہیں بھی، **اللہ** کے نام اور اس کے دین کی منادی کرتے رہنا ضروری تھا:

کہاں کہاں تیرا عاشق تجھے پکار آیا

وہ کوئی نہ کوئی پہلو ہر جگہ اپنی صدا لگانے کے لیے ڈھونڈ ہی نکال لیتے تھے۔

۱۹۲۸ء میں لندن میں ادیب شہیر **جارج برنارڈ شا** ان پر بھی تبلیغِ اسلام کر ہی آئے (افسوس ہے کہ اس گفتگو کی مجمل تفصیل بھی اب حافظہ میں نہیں ہے) جس سال کانگریس کے صدر تھے، کانگریس کے سیکرٹری **پنڈت جواہر لال نہرو** تھے، اپنے لمبے ساتھ اور سابقہ تجربے کے بعد اپنی خود نوشت **سوانح عمری** میں **پنڈت جی** یہ بات کیسی پتے کی لکھ گئے ہیں:

محمد علی میں کمال یہ تھا کہ کانگریس کی
تجویزوں تک میں گھوم پھر کر کسی طرح خدا کا
نام ضرور لے آتے تھے۔

اور یہ تھا مرد خدا پرست **محمد علی** کل ۵۳ سال کی عمر میں دنیا سے گزر جانے والا رحمۃ اللہ

◆

جامعہ ملیہ اسلامیہ

اور

گاندھی جی

پروفیسر محمد مجیب/ ترجمہ: ضیاء الحسن فاروقی

۱۹۲۰ء میں حالات کا کچھ ایسا سنجوگ ہوا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام عمل میں آیا۔ **ایم اے او کالج** (علی گڑھ) کے اندر اور اُس کے باہر ایک جماعت تھی جو یہ نہیں چاہتی تھی کہ **کالج** کو ایسی یونی ورسٹی بنا دیا جائے جو پورے طور پر حکومت کے اختیار میں ہو۔ یہ جماعت خاصی فعال اور مستعد تھی۔ اُس وقت **مہاتما گاندھی** ملک کا دورہ کر رہے تھے، وہ علی گڑھ بھی گئے تا کہ استادوں اور طالبِ علموں کو حکومت کے تعلیمی اداروں کو چھوڑ کر نکل آنے پر رضا مند کریں، کیونکہ یہ ادارے غلامانہ ذہنیت کے گہوارے بن گئے تھے۔ کچھ تعلیم یافتہ مسلمان یہ چاہتے تھے کہ ایک **آزاد مسلم یونی ورسٹی** قایم کریں یا ایسا **آزاد کالج** جو کسی امتحان لینے والی یونیورسٹی سے ملحق ہو۔ تحریک خلافت نے ایک نیا جوش اور ولولہ پیدا کر دیا تھا اور مسلمانوں کے دلوں میں بغداد اور قرطبہ کی مسلم درس گاہوں کی علمی روایات کو زندہ کرنے کی آرزو مچل رہی تھی۔ ڈاکٹر ذاکر

حسین نے جو اُس وقت علی گڑھ کالج میں ایم اے (فائنل) کے طالب علم اور جز وقتی استاد تھے، کالج کے کچھ طالب علموں کے چیلنج کے جواب میں ان استادوں اور طالب علموں کو جمع کیا جو ایک آزاد قومی درس گاہ قایم کرنے کے حق میں تھے اور پھر دھلی آکر چند ممتاز قومی رہنماؤں سے ملے اور یہ معلوم کیا کہ کیا وہ اس طرح کی ایک درس گاہ کی بنیاد رکھنے کی ذمے داری قبول کرنے کے لیے آمادہ ہیں۔ یہ رہنما تو دل سے اس کے آرزومند تھے، اس پر وہ بہت خوش ہوئے اور ۲۹/ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو علی گڑھ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا سنگ بنیاد رکھ دیا گیا۔

جامعہ کے اغراض و مقاصد کے بارے میں کچھ زیادہ غور و فکر نہیں ہوا تھا۔ خیال تھا کہ جو لوگ روشن خیال اور سمجھ دار ہیں وہ ان مقاصد کو جو پہلے ہی سے واضح تھے عمل میں لے آئیں گے۔ جامعہ کے پہلے جلسۂ تقسیم اسناد میں تعلیمی حقائق کے احساس کے مقابلے میں جوش و عینیت بہت زیادہ غالب تھی لیکن نصابِ تعلیم میں ہندوستان کے مذاہب کے مطالعے کو شامل کر کے ایک اہم اور بے مثل کام انجام دیا گیا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ جامعہ میں جس طرح مسلمانوں کو تعلیم حاصل کرنے کا موقع حاصل ہے، اسی طرح ہندوؤں، سکھوں اور عیسائیوں کو اپنے مذہب کی تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملے۔ ۱۹۲۴ء کے بعد جب خلافت کمیٹی کے باقی رہنے کا کوئی جواز نہیں رہا کہ ترکی کی نیشنل اسمبلی نے خلافت کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا تھا تو جامعہ کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اب تک خلافت کمیٹی کی مالی امداد سے جامعہ کا کام چلتا تھا لیکن اب یہ امداد جاری نہیں رہ سکتی تھی اور جب صورتِ حال کا جائزہ لیا گیا تو کئی ممتاز مسلم رہنما ایسے تھے جن کا خیال تھا کہ جامعہ کو جاری رکھنے کی کوئی سیاسی اور تعلیمی وجہ باقی نہیں رہی۔ جامعہ کے استادوں اور طالب علموں کی ایک تعداد ایسی بھی تھی جو اسی خیال کی حامل تھی۔ صرف دو رہنما تھے: حکیم اجمل خاں اور مہاتما گاندھی جو سیاسی حالات کی نامساعدت کے باوجود مستقبل پر نظر جمائے ہوئے تھے اور ان ہی دونوں اشخاص نے اس نازک وقت میں جامعہ کو بچا لیا۔ مہاتما گاندھی نے آزاد قومی اداروں کے قیام کی تحریک کی تھی اور حکیم اجمل خاں نے آزاد قومی ادارے کی حیثیت سے جامعہ کی اہمیت کو سمجھا تھا لیکن محسوس کرتے تھے کہ وہ جامعہ کے چلانے کی ذمّے داری کا بوجھ تنہا نہ اٹھا سکیں گے۔ مہاتما گاندھی کو جب معلوم ہوا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بند ہو جانے کا امکان ہے تو وہ علی گڑھ گئے،

حالات معلوم کیے، استادوں اور طالب علموں کی ہمت بندھائی اور کہا کہ اگر مسلم رہنماؤں میں کوئی جامعہ کی دیکھ بھال کی ذمّے داری لے لے تو وہ ایک سال کے مصارف کا انتظام کردیں گے۔ اس طرح وہ اساتذہ اور طلبہ جو مایوس ہوکر مسلم یونی ورسٹی میں واپس نہیں چلے گئے تھے، دھلی آ گئے۔

یہ ۱۹۲۵ء کی بات ہے۔ اس وقت مسلمانوں میں **مہاتما گاندھی** کی وہ مقبولیت جو انھیں ۲۰-۱۹۱۹ء میں حاصل تھی، بہت کم ہوگئی تھی۔ ان میں اپنی غلطیوں کو مان لینے کی ہمت تھی اور اگر انھیں خود اس کا احساس نہ ہوتا کہ آگے چل کر جامعہ ملیہ اسلامیہ کیا بن سکتی ہے، تو وہ مسلمانوں کی مایوس قیادت کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے باقی رکھنے کی الجھن سے بچا لیتے۔ لیکن اس سلسلے میں ان کا اپنا ایک نظریہ تھا کہ اپنے اور قومی مفاد دونوں کے حق میں مسلمانوں کو اپنی تعلیم کا انتظام کس طرح کرنا چاہیے۔ رفتہ رفتہ ان کا خیال صاف ہوتا گیا۔ انھوں نے جامعہ کو بند ہونے سے بچا لیا۔ کیونکہ ان کے ذہن میں ایک ایسی مسلم درس گاہ کی اہمیت واضح تھی جس کا کردار حقیقی طور پر اسلامی ہو اور جو ہندوستانی شہریت کی اچھی تربیت گاہ بھی ہو۔ جس انداز پر وہ اس تعلیمی ادارے کی ترقی دیکھنا چاہتے تھے اس سے ان کی غیر معمولی فراخ دلی اور سیاسی سوجھ بوجھ کا پتا چلتا ہے۔

۱۹۲۶ء میں جرمنی سے واپس آتے ہی **ڈاکٹر ذاکر حسین** نے شیخ الجامعہ کی حیثیت سے جامعہ کا بوجھ اپنے کاندھوں پر لے لیا۔ وہ ۱۹۲۳ء کے موسم خزاں میں جرمنی گئے تھے۔ اس وقت تک **مولانا محمد علی مرحوم** کی وائس چانسلر شپ کے زمانے میں بھی، وہ جامعہ کے روزمرہ کے کاموں کو دیکھتے رہے تھے۔ جامعہ سے انھوں نے جو عہد باندھا تھا وہ مکمل اور غیر مشروط تھا، اس لیے اُن ساتھیوں کے، جو جامعہ میں کام کر کے جذباتی تسکین کے خواہاں تھے، شکوک وشبہات کا مقابلہ کرنے اور اُن کے سوالوں کے جواب دینے کی ذمے داری بھی اُن ہی کی تھی۔ ۱۹۲۴ء میں جب وہ جرمنی میں تھے، انھوں نے **حکیم اجمل خاں** کو بذریعہ تار مطلع کیا تھا کہ جامعہ کو بند نہ ہونے دیا جائے، وہ اور ان کے دو ساتھی جامعہ کے لیے اپنی زندگیاں وقف کرنے کے لیے تیار ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جامعہ کے بارے میں کوئی بات واضح نہیں تھی، سوائے اس کے کہ اس کے استاد اور طالب علم یہ تہیہ کیے ہوئے تھے کہ وہ کسی حالت میں اپنے کام کو بند نہیں کریں گے۔

جون ۱۹۲۶ء میں **ڈاکٹر ذاکر حسین مہاتما گاندھی** سے جامعہ کے معاملات پر تبادلۂ خیال کرنے کے لیے سابرمتی آشرم گئے۔ دونوں کی یہ پہلی ملاقات تھی، اس موقع پر دونوں نے ایک دوسرے کی قدر پہچانی اور ایک گہرے تعلق کی بنیاد پڑ گئی۔ **مہاتما گاندھی** نے بتایا کہ وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کو کس طرح کی درس گاہ دیکھنا چاہتے ہیں لیکن انھوں نے اسی لمحے اس اندیشے کا اظہار بھی کر دیا کہ انھوں نے جامعہ کو چلانے کے لیے **ہندوؤں** سے چندہ لے کر اس سے اپنی دل چسپی کا بہت زیادہ مظاہرہ کیا تو ممکن ہے مسلمانوں کے نزدیک اس کی حیثیت اور اہمیت بہت کم ہو جائے۔ ان کا یہ اندیشہ بے بنیاد نہیں تھا۔ اس لیے انھوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ اگرچہ وہ جامعہ کو مالی مشکلات سے بچا سکتے ہیں لیکن بہتر یہی ہے کہ وہ اس کام سے اپنے آپ کو الگ رکھیں، اور **ڈاکٹر ذاکر حسین** اور **حکیم اجمل خاں** ہی یہ ذمے داری لیں کہ اپنے بس بھر جامعہ کے لیے سرمایے کی فراہمی کا بندوبست کریں۔ جامعہ ملیہ اگر بند ہو گئی ہوتی تو اس کا انھیں شدید صدمہ ہوتا، لیکن انھیں امید تھی کہ اس کے استادوں اور کارکنوں میں اپنے مقصد سے اتنی لگن اور ان کے کردار میں اتنی مضبوطی ہوگی کہ وہ مشکلات کو مردانہ وار جھیل جائیں گے۔ میری آنکھوں کے سامنے آج بھی وہ سماں ہے کہ انھوں نے کس طرح اِس نمایاں تضاد پر قہقہہ لگایا تھا کہ جس ادارے کی بھلائی اور ترقی کے وہ جی جان سے آرزومند تھے اس کی مدد کرنے کے لیے تیار نہ تھے لیکن حالات کا جو جائزہ انھوں نے لیا تھا وہ صحیح تھا۔ اگر جامعہ مفید ہو سکتی تھی تو اسے مسلمانوں سے اپنا تعلق قایم رکھنا چاہیے تھا اور اگر تعلیمی نقطۂ نظر سے اس کی کوئی اہمیت تھی تو اسے ہندوستانی شہریت کا جذبہ بیدار کرنے کا مقصد پورا کرنا چاہیے تھا۔ **مہاتما گاندھی** نے بڑی نرمی سے یہ بات ہمارے دلوں میں بٹھا دی کہ تیرو یا ڈوب جاؤ، اور یہ امید بھی ظاہر کر دی کہ جامعہ میں تیر کر پار نکل جانے کی صلاحیت ہے۔

اپنے طور پر **گاندھی جی**، **ڈاکٹر ذاکر حسین** اور اُن کے ساتھیوں پر پورا اعتماد کرنے کے لیے آمادہ تھے۔ انھوں نے ہم سے کسی قسم کا کوئی مطالبہ نہیں کیا، بلکہ انھوں نے اپنے لڑکے **دیوی داس** اور اپنے ایک عزیز چیلے جی، **راما چندرن** کو کچھ دنوں کے لیے جامعہ میں کام کرنے کے لیے بھیج دیا اور اسی زمانے میں اپنے ایک پوتے، **رَسِک** کو پڑھنے کے لیے بھیجا۔ انھوں نے کبھی جامعہ سے اس کا کوئی قطعی ثبوت نہیں مانگا کہ وہ ایک قومی ادارہ ہے۔ **ڈاکٹر ذاکر حسین** کے اس خیال سے وہ بلا کسی

جھجھک کے متفق ہو گئے کہ جامعہ کے لیے بہترین طریقہ یہ ہوگا کہ وہ سیاست سے الگ رہے، کیونکہ وہ ادارے جنھیں **مہاتما گاندھی** نے قایم کیا تھا سیاسی تحریکات میں حصہ لینے کے لیے عارضی طور پر بند کیے جاسکتے اور پھر کھولے جاسکتے تھے، لیکن اگر جامعہ ایک بار بند ہوگئی تو پھر نہ کھل سکتی۔ باوجود اس کے انھوں نے جامعہ کو سیاست میں حصہ نہ لینے کی اجازت دے دی تھی، جامعہ کے کئی استادوں اور کارکنوں نے ۱۹۳۰ء کی سول نافرمانی کی تحریک میں حصہ لیا۔ لیکن ایک خاص طرز کا ذہن رکھنے والے قوم پرستوں کے لیے یہ کافی نہیں تھا، وہ سیاسی میدان میں جامعہ سے اس سے زیادہ کی توقع رکھتے تھے اور بعض حلقوں میں تو اس کی نیشنلزم کے کمزور اور اس پر بے دلی کی نیشنلزم ہونے کا شبہ کیا جاتا تھا۔ **گاندھی جی**، بہرحال، اپنے موقف پر قایم رہے، انھوں نے زور دے کر یہ بات کہی کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ ایک **مسلم اور قومی درس گاہ** ہے اور سیاسی اختلافات کی فضا میں اپنے تہذیبی کردار کو باقی رکھتے ہوئے اسے اپنی راہ چلنے کی آزادی ہونی چاہیے۔ ایک موقع پر جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ ان کے ایک قریبی ساتھی نے یہ تجویز رکھی ہے کہ اگر جامعہ ملیہ اسلامیہ اپنا نام بدل دے تو غیر مسلم ذرائع سے سرمایہ فراہم کرنے میں آسانی ہوگی، انھوں نے کہا کہ اگر 'اسلامیہ' کا لفظ نکال دیا گیا تو انھیں اس ادارے سے کوئی دل چسپی نہیں ہوگی۔

مہاتما گاندھی جامعہ میں کئی بار آئے۔ جامعہ آنے کا وہ پہلے سے کوئی پروگرام نہیں بناتے تھے۔ جس طرح خاندان کا کوئی سرپرست بغیر کسی رسمی اطلاع کے اپنے گھر آتا ہے، **گاندھی جی** کو جامعہ میں اسی طرح آنا پسند تھا۔ ان کے استقبال کے لیے کوئی خاص انتظام نہیں کیا جاتا تھا، جامعہ کے استاد اور کارکن جلدی سے ان کی ملاقات کے لیے بلائے جاتے تھے، ایسے موقعوں پر وہ کبھی سیاسی گفتگو نہیں کرتے، بس وہ صرف یہ جاننا چاہتے تھے کہ تعلیمی اور مالی لحاظ سے جامعہ کس حال میں ہے۔ ایک بار جب وہ دھلی میں تھے اور اوکھلا کے پاس **کستور با بالِکا آشرم** میں آئے ہوئے تھے، انھوں نے چند بچوں کو دیکھا جن کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ جامعہ کے بچے ہیں۔ انھوں نے بچوں سے پوچھا کہ شہر واپس جانے سے پہلے کیا وہ جامعہ دیکھ سکتے ہیں۔ بچوں نے کہا: ضرور، تشریف لے چلیے، اور پھر بھاگ کر **ڈاکٹر ذاکر حسین** اور اسٹاف کے دوسرے لوگوں کو اطلاع دینے جامعہ پہنچے۔ **گاندھی جی** آئے اور اسکول کے سامنے لان میں ایک بے تکلف نشست ہوئی۔

انھوں نے حسبِ سابق جامعہ کا حال پوچھا، اور اشارۃً بھی ایسی کوئی بات نہیں پوچھی کہ جنھیں وہ جامعہ کے مقاصد تصور کرتے تھے، اُن مقاصد کے حصول کے لیے جامعہ کیا کر رہی ہے۔ تاریخ نے اپنے صفحات میں اس واقعے کو محفوظ کرلیا ہے کہ ۸؍ستمبر ۱۹۴۷ء کو جب وہ دھلی اسٹیشن پر پہنچے تو پہلی بات جو انھوں نے پوچھی یہ تھی: ''کیا ذاکر حسین محفوظ ھیں؟ کیا جامعہ ملیہ محفوظ ھے؟'' اس وقت تک صورتِ حال یہ تھی کہ **ڈاکٹر ذاکر حسین** ہندوستانی تعلیمی سنگھ کے تقریباً ۹ برس تک صدر رہ چکے تھے اور **گاندھی** سے ان کا تعلق اور بھی گہرا ہو گیا تھا کہ انھوں نے تجربے کے طور پر **بنیادی تعلیم** کے شروع کرنے کی ذمے داری بھی قبول کرلی تھی۔ سنگھ بنیادی تعلیم کے کام کی دیکھ بھال کے لیے قایم کیا گیا تھا اور مجھے اس کی تقریباً سبھی سالانہ میٹنگوں میں شرکت کا موقع ملا تھا، مجھے محبت اور اعتماد کی وہ فضا اب تک یاد ہے جس میں **ڈاکٹر ذاکر حسین** اور **گاندھی** جی تمام مسئلوں پر تبادلۂ خیال کرتے تھے۔ جامعہ میں **استادوں کا مدرسہ** قایم ہوا تو **مہاتما گاندھی** کی تعلیمی سرگرمیوں سے اس کا ناتا راست اور پہلے سے زیادہ مضبوط ہو گیا۔ اُن ایام میں جب **ہندوؤں** اور **مسلمانوں** میں روز بروز دوری ہوتی جاتی تھی، جامعہ کا **استادوں کا مدرسہ**، جہاں ملک کے مختلف حصوں سے تمام مذاہب کے ماننے والے طلبہ آتے تھے، جذباتی اور تہذیبی یکجہتی کی جو ہمارا قومی آدرش تھا، ایک جیتی جاگتی مثال بن گیا تھا۔

گاندھی جی کا عقیدہ تھا کہ ایسی اقلیتوں کی مدد سے قومی اتحاد کا مقصد سب سے زیادہ بہتر طور پر حاصل ہوسکتا ہے جن کے اپنے **آزاد تعلیمی ادارے** ہوں اور یہ ادارے ان اقلیتوں کی اعلیٰ ترین مذہبی، اخلاقی اور سماجی روایات کے ترجمان بن جائیں۔ اسی کے ساتھ ان کے دروازے اکثریتی فرقے اور دوسری اقلیتوں کے اساتذہ اور طلبہ کے لیے بھی کھلے ہوں۔ ملک کی تقسیم کے بعد جامعہ ملیہ اسی وجہ سے اپنے مخصوص مسلم کردار کو باقی رکھ سکی کہ **گاندھی** جی نے مسلمانوں اور مسلمانوں کے تعلیمی اداروں کے اس اخلاقی اور سماجی حق کو کہ وہ اپنی انفرادیت باقی رکھ سکتے ہیں۔ نہ صرف تسلیم کیا تھا بلکہ وہ چاہتے تھے کہ انھیں یہ حق ضرور ملے۔ **گاندھی** جی پر یہ حقیقت پورے طور پر واضح تھی کہ اقلیتوں کی تہذیبی انفرادیت اور قومیت کے اصولوں میں کوئی تضاد نہیں ہے اور اس سے اقلیتوں کو اپنے ملک کی فلاح و ترقی میں اپنی بہترین صلاحیتیں لگانے کے بہت ہی اہم مواقع ملیں گے۔ نیشنلزم کا جو ایک بہت ہی محدود

سیاسی مفہوم ہے، **گاندھی جی** اس نیشنلزم کے حامل نہیں تھے۔ اُن کا نقطۂ نظر اوران کے معیار اخلاقی تھے، سیاسی نہیں۔ وہ خود ایسی سیاسی سرگرمیوں میں شریک تھے جن کی مفاد پرست پارٹیاں اپنے اغراض کے لیے غلط تعبیریں کر سکتی تھیں اوراسی لیے انھوں نے جامعہ ملیہ کو اپنے مقاصد کے لیے جدوجہد کرنے اوراس انداز سے جدوجہد کرنے کی جو زیادہ سے زیادہ مناسب اور مؤثر معلوم ہو، پوری آزادی دی۔ گورنمنٹ سے ملنے والی گرانٹ کے پیچھے کوئی سیاسی مقصد نہیں ہے اوراس کی اپنی قوم پرور غیر جماعتی روایات کی وجہ سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کو اس کا خطرہ نہیں ہے کہ کسی صورت میں اس کی تہذیبی آزادی ختم ہو جائے گی۔

گورنمنٹ کے سیکولر نقطۂ نظر اور **گاندھی جی** کے طرزِ فکر میں کیسے مطابقت ہو؟ جس زمانے میں بنیادی تعلیم کی پالیسی پر بحث ہو رہی تھی اور نصاب بن رہا تھا۔ یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ بنیادی تعلیم کے اسکول سیکولر ہوں گے۔ یہ فیصلہ دانش مندی پر مبنی تھا، حالانکہ عام طور پر قومی تحریک اور خاص طور پر بنیادی تعلیم کی تحریک کے پیچھے خاصا مذہبی جوش بھی تھا اور لوگوں کے مذہبی جوش کے غیر رسمی اظہار پر مشکل ہی سے کوئی پابندی عائد کی جا سکتی تھی۔ ایسے اسکول یا کالج میں جس پر گورنمنٹ کا کوئی کنٹرول نہیں ہے، صورتِ حال کسی قدر مختلف ہوتی ہے۔ اگر چہ یہاں بھی انتہا پسندی کا امکان ہے۔ اصولاً طالبِ علم کو اس کے مذہب کی تعلیم دی جا سکتی ہے اور جامعہ ملیہ کی طرح ضابطے سے تجربہ کر کے ایک مناسب توازن قایم کیا جا سکتا ہے۔ اگر جامعہ ملیہ کے تجربے کو اپنا لیا جائے اور ایسے اسکول اور کالج خاص تعداد میں کھولے جائیں جہاں سب مذہبوں کی تعلیم کا انتظام ہو تو ایسا ماحول پیدا کیا جا سکتا ہے کہ مذہب کی اعلیٰ خوبیاں سیکولرزم کی بہترین خصوصیات پر اثر انداز ہو سکیں۔ **گاندھی جی** کو امید تھی کہ مذہبی اور جذباتی یک جہتی کے لیے جامعہ ملیہ اسلامیہ ایک گہری مذہبی بنیاد فراہم کرے گی۔ یہی سچی سیکولرزم ہے اوراسی کو حاصل کرنے کے لیے تعلیم کا فرض ہے کہ ہمیں تیار کرے، ورنہ ہمیں اس صورتِ حال کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ جہاں مذہب کے کوئی معنی نہیں ہوں گے اور اخلاقی قدروں کی وفاداری کو اپنے جواز کے لیے کوئی اور چیز تلاش کرنی ہوگی۔

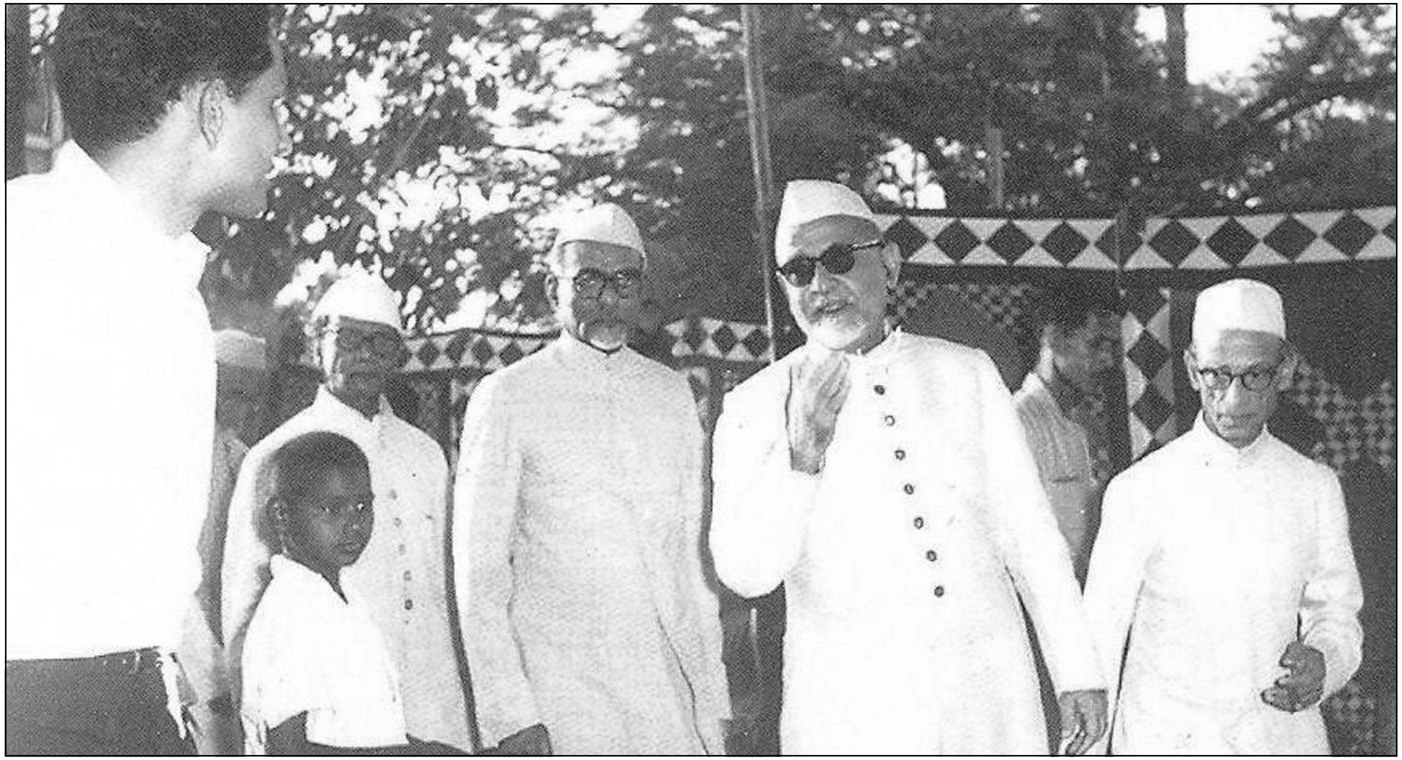

(دائیں سے بائیں)پروفیسر محمد مجیب، ڈاکٹر ذاکر حسین اور جناب حامد علی خاں

جامعہ ملیہ اسلامیہ
اور
محمد علی مرحوم

ڈاکٹر قاضی عبدالحمید زبیری

مولانا محمد علی مرحوم مسلمانِ ہند کی ان چند ممتاز ہستیوں میں سے ایک ہیں جنھوں نے تقریباً ہر شعبے پر ایک گہرا نقش ثبت کیا ہے۔ چناں چہ مسلمانوں کی سیاست، شاعری، علم وادب، صحافت اور تعلیم پر وہ خاصا اثر انداز ہوئے ہیں۔ **مولانا محمد علی** فطرت کے ان چند منتخب افراد میں سے تھے جنھیں وہ غیر معمولی دل ودماغ کی صلاحیتیں دیتی ہے۔ وہ جس شعبۂ زندگی میں بھی رہے ایک کامیاب انسان رہے اور وہ جہاں بھی رہتے ان کی عظیم الشان شخصیت سب پر حاوی ہو جاتی لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا ان کے دماغ پر غالب آتا گیا حتی کہ **ملتِ اسلامیہ** کے عشق میں ان کی حالت مجنوں کی سی ہوگئی۔ اس جنون کے باعث انھوں نے زمانے سے ایک لڑائی مول لی۔ وہ حق کے لیے سینہ سپر ہوکر ہر کسی کے خلاف ڈٹ گئے۔ انتہائی علالت کی حالت میں وہ کشاں کشاں گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے گئے۔ وہاں ہندوستان کی آزادی کا رندانہ نعرہ بلند کیا اور بالآخر عالمِ اسلام کا یہ عظیم مجاہد **بیت المقدس** کی روحانی خاک میں ہمیشہ کے لیے مدفون ہوکر اپنے رب کے قریب پہنچ گیا۔

ہر بڑا، انسان اپنے قومی تمدنی ورثے سے وہ سب کچھ حاصل کرسکتا ہے جو اس میں موجود ہوتا ہے۔ چناں چہ **مولانا محمد علی** نے **اسلامی تمدن** سے اس کے بہترین عناصر کو اخذ کیا۔ ان کی تعلیم مغربی ماحول میں ہوئی تھی لیکن انھوں نے اپنے شوق سے **قرآن، تفسیر، حدیث، تاریخ اسلامی، علمِ کلام** وغیرہ جیسے اسلامی علوم پر بہت جلد عبور حاصل کرلیا۔ پھر انھوں نے اس تمدنی ورثے کے اکتساب پر ہی قناعت نہ کی بلکہ اسے پرکھا اور اس خش وخاشاک کو جو اس میں امتدادِ زمانہ کے باعث جمع ہوگیا تھا دور کرنے کی کوشش کی۔ **مولانا محمد علی** نہ صرف جذباتی حیثیت سے بلکہ عقلی غور وفکر کے ذریعے اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ اسلام انسانیت کی نشو ونما کے لیے سب سے بہترین نسخہ ہے اسی پر عمل کرکے نہ صرف مسلمانانِ عالم بلکہ تمام دنیا اپنی مادی اور روحانی نجات حاصل کرسکتی ہے۔ چناں چہ انھوں نے نہایت خلوص اور جوش کے ساتھ اس پیغام کو تمام دنیا کے سامنے پیش کیا۔ **مولانا** کی آخری زندگی کی مذہبی کیفیت کو دیکھ کر لوگ انھیں **ملاّ** کہنے لگے تھے لیکن وہ اس پر فخر کرتے تھے کیوں کہ ان کے نزدیک یہی طرزِ فکر اور طرزِ زندگی سب سے بہتر تھا۔ **اسلامی تمدّن** سے وابستگی کے لیے آخری عمر میں انھوں نے **عربی لباس** بھی اختیار کرلیا تھا۔ اس طرح **مولانا** باطنی اور ظاہری دونوں لحاظ سے **تمدن اسلامی** کے بہترین مظہر بن گئے تھے۔

دین ودنیا کی ہم آہنگ نشو ونما

جن اصولوں کی بنیادوں پر **تمدن انسانی** کی بقا، اصلاح اور نشو ونما چاہتے تھے انہی اصولوں کو وہ انسانی تعلیم کا مقصد قرار دیتے تھے۔ چناں چہ **مولانا محمد علی** نے مسلمانوں کی اس قرآنی دعا کو تعلیم کا مقصد قرار دیا:

رَبَّنَا اٰتِنَا فِیْ الُدنُیَا حَسَنَۃً وَّ فِ الاٰخِرَۃِ حَسَنَۃ

دین ودنیا کی فلاح، مادّہ اور روح کی ہم آہنگی جسمانی اور روحانی قویٰ کی نشو ونما۔ چناں چہ تعلیم کا مقصد قرار پایا لیکن دنیا کا حصول اس طرح ہو کہ وہ مقصد کلّی یعنی دینی مقصد کے ماتحت ہو۔ جز ہمیشہ کل کا تابع رہے۔ انسان کی ابدی زندگی اس کی مخالف زندگی کے مقصد کو متعین کرے۔ چناں چہ تعلیم کا مقصد ہوا:

از کلید دیں در دنیا کشاد

مذہبی تعلیم کوغرض یہ کہ ہرقسم کی اساس ہونا چاہیے۔خصوصاً ملتِ اسلامیہ کی آئندہ نسلوں کی تعلیم تو روحانی اساس کے بغیر مکمل ہو ہی نہیں سکتی ہے۔

لیکن مذہبیت اور روحانیت کے معنی ترکِ دنیا کے نہیں ہیں بلکہ یہ ہیں کہ اس روح کو بہتر طریقے پر دنیاوی امور میں کارفرما کیا جائے۔ چناں چہ دنیاوی امور کی تعلیم ضروری ہے۔خاندانی، وطنی، ملی اور انسانی فرائض کی ادائیگی کا احساس تعلیم کا لازمی جزو ہونا چاہیے۔

اس کے ساتھ ہی انفرادی ماڈی زندگی کی بقا بھی ضروری ہے چناں چہ معاش کا مسئلہ تعلیم میں خاصی اہمیت رکھتا ہے۔کسبِ حلال انسان کے لیے ضروری ہے اور تعلیم کا یہ مقصد بھی ہونا چاہیے کہ وہ طالبِ علموں کو اس کے لیے تیار کرے۔

مولانا محمد علی محدود معنی میں ایک مدرس نہ تھے لیکن وہ ایک عظیم الشان مفکر تھے۔اس لیے ایک انسانی معلم بھی تھے ان کے پیشِ نظر انسانی تعلیم کے یہ تینوں ضروری عناصر موجود تھے۔انھوں نے شروع میں کوشش کی کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جہاں کی وہ تخلیق تھے اور جس سے انھیں بے انتہا محبت تھی ان مقاصدِ تعلیم کو قبول کرلے اور ان کی روشنی میں خود کی زندگی میں انقلاب پیدا کرلے لیکن رجعت پسند طاقتوں کے مقابلے میں انھیں اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ چناں جہ بالآخر ایک نئی اسلامی جامعہ کا **مولانا شیخ الہند** کے ہاتھوں علی گڑھ کی جامع مسجد میں افتتاح کرایا گیا اور اس کا نام جامعہ ملیہ اسلامیہ رکھا گیا۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ذریعے **مولانا محمد علی مرحوم** اور دیگر اکابرِ اسلام مسلمانانِ ہند کی ملّی اور اسلامی احیا چاہتے تھے۔ چناں چہ شروع ہی میں ان مقاصد کو نہ صرف **مولانا محمد علی مرحوم** نے بلکہ **مسیح الملک حکیم اجمل خاں** صاحب مرحوم اور **شیخ الہند مولانا محمود حسن** نے واضح کردیا۔

جامعه مليه اسلاميه کے مقاصد

چناں چہ **مولانا محمد علی مرحوم** 'ہمدرد' کے ایک مقالے میں تحریر فرماتے ہیں:

جامعہ کا ہمیشہ سے ایک معین مقصد ہے اور وہ
خود اس قدر جامع اور صاف ہے کہ اس کی

> تشریح وتاویل کی ضرورت نہیں ہے۔ جامعہ نے ابتدا ہی سے پیش نظر جو مقصد رکھا ہے وہ یہ ہے کہ بچے یہاں سے خدا پرست مسلمان اور وطن پرور ہندوستانی پیدا ہوں۔

مولانا نے مزید تحریر فرمایا:

> جامعہ نے تعلیم کے متعلق صحیح نظریہ قایم کیا اور تلامذہ کے قوائے داخلی کو ترقی دینے کا کام اپنے ذمے لیا اور اس کو ہرگز پسند نہ کیا خواہ تعلیم دنیوی ہو یا دینی اس کی مثال مثل الحمار ہوجائے۔ اس کا پہلا مقصد یہ تھا کہ ان کو وطن دوست کے مسلمانوں کو حق دوست وخدا پرست مسلمان بنایا جائے اور دوسرا مقصد یہ تھا کہ وطن دوست اور حریت پرور ہندوستانی بنایا جائے۔

فطری نشو ونما

مولانا محمد علی کو اس کا پورا، احساس تھا کہ تعلیم کا مقصد انسانی ذہن میں اشیا کے علم کا ٹھونسنا نہیں ہے بلکہ وہ انسان کی داخلی امکانی قوی کا بتدریج نشو ونما ہے۔ چناں چہ وہ فرماتے ہیں:

> نباتات اور انسان جمادات کی طرح غیر ذی روح نہیں ہے جس کا ارتقا خارجی ہوتا ہے یعنی ترقی نہیں ہوتی، محض از دیاد بڑھوتری ممکن ہے خلاق عالم نے نباتات اور حیوانات میں خود نمو کا انتظام فرمایا ہے اور داخلی ترقی کا

سامان خود فراهم کردیا ھے۔

اس بنا پر **مولانا مرحوم** طلبا میں جامد تقلید کا مادّہ پیدا کرنا نہیں چاہتے تھے کہ وہ خود **قرآن** اور **حدیث** کا علم حاصل کریں اور اسلام کے روحانی سرچشموں سے خود بلاواسطہ فیض یاب ہوں۔ وہ تقلید جامد کو مسلمانوں کے ذہن اور علمی زوال کا سبب خیال کرتے تھے اور عام مسلمانوں کو مذہبی تعلیم دلا کر ان کی اس ذہنی غلامی سے نجات دلانے میں قائل تھے۔

اسلام کی تعلیمات کو **مولانا** چوں کہ تمام تعلیمِ انسانی کی اساس سمجھتے تھے۔ اس لیے انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نصاب میں اسلامی مذہبی تعلیم کو اساس قرار دیا اور **قرآن وحدیث**، ضروری فقہ اور قدرے عربی زبان کی تعلیم کو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ابتدائی جماعتوں سے لے کر جامعہ کی تعلیم تک ایک لازمی مضمون قرار دیا۔

سائنس اور پیشہ کی تعلیم کی ضرورت

جامعہ کے تعلیمی نصاب میں مولانا نے دنیاوی ضروریات کے لیے دیگر مضامین کو شامل کرنا بھی ضروری سمجھا، چناں چہ فرماتے ہیں:

> جامعہ کی تعلیم میں دوسری طرف مسلمانوں کی دنیوی ضروریات کا لحاظ رکھا گیا ھے۔ اب یہ ھوتا رھا ھے کہ تعلیم سے فارغ ھونے کے بعد مسلمان یا تو مسجد کے مُلّا ھوتے تھے یا سرکاری دفتر کے کلرک، جامعہ ملیہ کی تعلیم کا مقصد یہ ھے کہ زندگی کے ھر شعبہ میں اس کے تلامذہ حصہ لے سکیں اور دنیا کا کوئی دروازہ ان پر بند نہ ھو۔ ادب اور تاریخ، فلسفہ اور سائنس کے ذریعے وہ سارے عالم کو اپنا جولاں گاہ بناسکیں۔

جامعہ کی تعلیم کا مقصد مسلمان طلبا کو اپنی روزی کمانے کے قابل بھی بنانا ہے۔ چنانچہ مولانا ارشاد فرماتے ہیں:

طلبا اپنی روزی خالص دماغی کام کرنے کے ذریعے ہی سے کمانے پر مجبور نہ ہوں کوئی پیشہ ایسا بھی اختیار کرسکیں جس میں محض جسمانی محنت سے روزی کمائی جاسکے اور جس میں بڑے سرمایہ کی حاجت نہ ہو مثلاً نجاری، قفل سازی، پارچہ بافی وغیرہ۔

غرضیکہ **مولانا محمد علی مرحوم** نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے تعلیمی نصب العین کو جن عناصر سے ترکیب دیا تھا وہ حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ اسلام اور اس سے وابستہ مذہبی علوم کی تعلیم خصوصاً قرآن پاک کی تعلیم۔

۲۔ آزادی وطن کی پاک جذبہ کی تربیت اور نشو ونما۔

۳۔ علوم وفنون، تاریخ، فلسفہ، ہیئت اور سائنس کی تعلیم۔

۴۔ معاش کے لیے ضروری فن کی تعلیم۔

مادری زبان میں تعلیم

مولانا طالب علموں کی اچھی تعلیم کے لیے یہ ضروری خیال کرتے تھے کہ ذریعہ تعلیم ابتدائی جماعتوں سے لے کر اعلیٰ جماعتوں تک مادری زبان ہو۔ چناں چہ وہ اس مسئلے پر نہایت جوش کے ساتھ لکھتے ہیں:

ہماری غلامانہ ذہنیت کسی چیز سے اس قدر

ثابت نہیں تھی جس قدر کہ ایک غیر زبان میں
تحصیل علوم کی مشقت رائیگاں سے ثابت ہوتی
ہے۔ ہم مشرقی تو وحشی لوگ ہیں اور بربریت
میں مبتلا ہیں لیکن خود تہذیب یافتہ مغربیوں
کا کیا شعار ہے؟ کوئی انگریز اپنے بچے کو
تاریخ یا سائنس جرمن زبان میں پڑھواتا ہے؟
کیا کوئی فرانسیسی یا اطالوی اپنے بچے کو
جغرافیہ یا ریاضی انگریزی یا روسی زبان میں
سکھواتا ہے؟ لیکن ہماری غلامی اور اب ہماری
غلامانہ ذہنیت کو دیکھ کر ہمارے اسکول اور
کالجوں کے ہندوستانی اساتذہ بھی جو اکثر
انگریزی زبان کو خود بھی اس طرح نہیں جانتے
تھے جس طرح کہ انگریزی جانتے ہیں۔
ہندوستانی بچوں کو تاریخ اور سائنس،
جغرافیہ اور ریاضی انگریزی زبان میں سکھانے
کی کوشش کرتے ہیں۔

مولانا نے شروع ہی سے **اردو** کو جامعہ کے تمام درجوں میں ذریعہ تعلیم قرار دیا۔ چناں چہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جامعہ کے طلبا نے بہتر طریقے سے مضامین کو اخذ بھی کیا اور اس تعلیم کے لیے ان کو وقت بھی نسبتاً کم صرف کرنا پڑا۔

نظریہ اور عمل

مولانا محمد علی ایک انتہائی باعمل انسان تھے۔ چنانچہ صرف نظریوں سے انھیں دلچسپی نہ تھی بلکہ وہ تعلیم میں بجا طور پر عمل پر زور دیتے تھے، اخلاقی تعلیم کا بہترین طریقہ یہ نہیں ہے کہ اخلاقی خوبیوں پر

وعظ کیے جائیں بلکہ اساتذہ خود ان اخلاقی اوصاف سے متصف ہوں۔ وہ اپنی اخلاقی اور روحانی زندگی سے مدرسے کے ماحول کو اخلاقی اور روحانی بنادیں تاکہ اس ماحول میں زندگی گزارنے ہی سے طلبا بااخلاق، خداپرست، ملت پرور اور وطن دوست ہوجائیں۔ **مولانا محمد علی** کی خود زندگی سراپا عمل تھی۔ وہ خود بذاتہ ان تمام خوبیوں کے بدرجہ اتم حامل تھے جو وہ اپنے طالبِ علموں میں پیدا کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ جس کسی نے ان کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا وہ خود بہت حد تک ان خوبیوں کا حامل ہوگیا۔

انہی کی تربیت یافتہ ایک جماعت نے ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اسلام کی صحیح روح پھونکی اور اہلِ ملک کو جہادِ آزادی کے لیے آمادہ کیا۔ انھوں نے علی گڑھ کے فیشن پرستوں کو موٹے گاڑھے کا عادی بنادیا مذہب اور آزادی کے لیے ہر قسم کی مالی اور جانی قربانیوں کا جذبہ اپنے ساتھیوں میں بدرجہ اتم پیدا کردیا۔ اُنہی کی تربیت یافتہ دوسری جماعت نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بقا اور نشو ونما کے کام کو اپنے ذمے لے لیا اور بالآخر اس کو مسلمانوں کی ایک عظیم الشان درس گاہ بنادیا۔

مولانا محمد علی آخر عمر میں اپنے دیگر ملّی اور قومی کاموں کے باعث جامعہ ملیہ اسلامیہ کے روزمرّہ کے کاموں میں حصہ نہ لے سکے اور ان کے جیسے عظیم، وسیع الخیال اور وسیع العزم سیاست داں کے لیے یہ ممکن بھی نہ تھا کہ وہ خود کو صرف ایک تعلیمی درس گاہ میں محدود کردیتا۔ ان کی جولاں گاہ وسیع تھی۔ ان کو نہ صرف ہندوستان کے کروڑوں مسلمانوں کی قیادت کا فرض ادا کرنا تھا بلکہ غیر مسلموں کی بھی جہادِ آزادی میں رہ نمائی کرنی تھی۔ وہ ان فرائض کو آخر وقت تک نہایت جاں سوزی، بے باکی اور خلوص سے انجام دیتے ہیں حتیٰ کہ انہی فرائض کی ادائیگی نے ان کی صحت کو تباہ کردیا اور بالآخر وہ غمِ قوم وملت میں گھل گھل کر شہید ہوگئے۔ خدا، ان کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

انھوں نے دنیا کو سبق دیا کہ تعلیم کا اصل معنی عمل ہے، سوزِ زندگی ھے عشقِ ملت اور انسانیت ھے۔ وہ اس شعر کی زندہ تفسیر تھے:

چہ باید مرد را طبعِ بلندے مشر بے نابے
دل گرمئے نگاہ پاک بینے جان بے تابے

مولانا محمد علی مرحوم انسانیت کے لیے عمل کا سب سے بہتر نمونہ **حضورِ اکرم صلی علیہ وسلم** کی

قیادت بابرکات کو سمجھتے تھے ان کا ایمان راسخ تھا کہ صحیح تعلیم وہ ہے جو **قرآن مجید** میں موجود ہے اور صحیح اسوۂ حسنہ وہ ہے جو **محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم** کا اسوہ ہے۔ چناں چہ ان کا ایک شعر ہے:

ہو محمد کیوں نہ قرآں اور بھی ہم کو عزیز
اس میں خود تیری جو جیتی جاگتی تصویر ہے
(جوہر)

مولانا محمد علی نے مغربی تہذیب وتمدن کی گود میں تعلیم حاصل کی تھی لیکن اپنی ذہانت اور طباعی سے وہ **اسلامی تمدن** اور تعلیم کی تہہ تک پہنچ گئے اور بالآخر اسے انھوں نے تمام دنیا کے لیے بہترین تعلیمی نسخہ قرار دیا۔ ان میں احساسِ کمتری نام کو بھی نہ تھا بلکہ انھیں اپنی ملی روایات پر فخر تھا۔ وہ ایک بہادر انسان تھے۔ اس لیے بہادروں جیسی زندگی انھوں نے گزاری وہ مسلمانوں کے علاحدہ قومی وجود اور اس کی بقا اور نشو ونما کے قائل تھے۔ چناں چہ تمام عمر انھوں نے اس کے لیے جدوجہد کی لیکن وہ ھندوستان کی دوسری قوموں کے بھی مخالف نہ تھے بلکہ چاہتے تھے کہ وہ جہادِ آزادی میں ہم سفر ہوں۔

غرض یہ کہ **مولانا محمد علی** نے اپنی تحریر وتقریر اور اپنے عمل سے مسلمانانِ ہند کے سامنے نہ صرف ایک صحیح نصب العین پیش کیا بلکہ اپنی اخلاقی خوبیوں اور ان مسلسل قربانیوں سے اسی نصب العین کو ایک زندگی بھی بخش دی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ نے بہت حد تک ان خوبیوں کو باقی رکھا ہے وہ جس وقت تک **مولانا محمد علی** کے بتائے ہوئے راستے پر چلے گی وہ اس وقت تک دن دونی رات چوگنی ترقی کرے گی۔ (رسالہ جوہر، **جوبلی نمبر**)

(دائیں سے بائیں)ڈاکٹر سید عابد حسین، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مس گیرڈا فلپس بورن اور ڈاکٹر ذاکر حسین

جامعہ ملیہ اسلامیہ
کے
پہلے 'شیخ الجامعہ'

حنیف نقوی

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پہلے **وائس چانسلر مولانا محمد علی جوہر** کی صدی کے آغاز کے ساتھ **مولانا** کے آبائی وطن اور جائے پیدائش کے سلسلے میں جو بحث اٹھ کھڑی ہوئی ہے، وہ زعمائے ملک وقوم اور اساطینِ شعر وادب کے مستند سوانحِ حیات کی ترتیب واشاعت سے ہماری بے اعتنائی پر تازیانۂ عبرت کی حیثیت رکھتی ہے۔ گزشتہ ایک سال میں اس موضوع پر کئی حضرات اظہارِ خیال کر چکے ہیں، لیکن ہفت روزہ 'ہماری زبان' کے محمد علی نمبر میں **شبیر علی خاں شکیب** کا مضمون 'محمد علی کا وطن' اور ماہنامہ 'نگار' (دھلی) کے نومبر ۱۹۷۹ء کے شمارے میں جناب **رئیس منظر** کا مضمون 'حکومتِ ہند نے مولانا محمد علی جوہر کا وطن بدل دیا' جس محنت اور سلیقے سے لکھے گئے ہیں وہ قابلِ داد ہے۔ ان تحریروں سے زیرِ بحث مسئلے کے تمام پہلو واضح ہو کر سامنے آ گئے ہیں۔ **مولانا محمد علی** خود اپنی تحریروں میں ایک سے زائد مقامات پر بالاعلان یہ وضاحت

کرچکے ہیں کہ وہ رام پور میں پیدا ہوئے۔ اس امرِ واقعہ کو نہ تو محکمۂ ڈاک وتار کا شائع کردہ بروشر (*Brochure*) ہی بدل سکتا ہے اور نہ کسی یادگاری کمیٹی کے صدر یا سیکرٹری کی تحریر اسے کالعدم کر سکتی ہے۔ **مولانا** کے اس بیان کو اس وقت تک سند کی حیثیت حاصل رہے گی جب تک دوسرے زیادہ مستند و معتبر ذرائع سے یہ ثابت نہ کر دیا جائے کہ انھوں نے اس معاملے میں کسی خاص مصلحت کے تحت دانستہ طور پر اخفائے حال یا غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ اس کے بعد ہی **نجیب آباد یا مراد آباد** میں تولّد سے متعلق کسی روایت پر غور کیا جا سکتا ہے۔

شکیب صاحب اور **رئیس منظر صاحب** نے اپنے مضامین میں بجا طور پر یہ رائے قایم کی ہے کہ نجیب آباد میں **مولانا** کی ولادت سے متعلق غلط فہمی دراصل **رئیس احمد جعفری** کی تصنیف: 'سیرتِ محمد علی' پر انحصار واعتبار کا نتیجہ ہے، جس میں **مولانا** کے والد **عبدالعلی خاں مرحوم** کی نسبت یہ غلط اطلاع فراہم کی گئی ہے کہ وہ اپنی بیوی اور بیٹوں کے ساتھ نجیب آباد سے رام پور آئے تھے۔ ان دونوں **حضرات** نے **مولانا** کے برادرِ عم زاد **حافظ احمد علی خاں شوق رام پوری** کی تصنیف: 'تذکرۂ کاملانِ رام پور' کے حوالے سے اس امر کے خاصے ثبوت بہم پہنچا دیے ہیں کہ دراصل **مولانا** کے دادا **علی بخش خاں** نجیب آباد سے ترکِ سکونت کے بعد تقریباً ایک سال لکھنؤ میں گزار کر ۱۸۴۲ء میں **نواب محمد سعید خاں** کے حسب الطلب رام پور چلے آئے تھے۔ **عبدالعلی خاں** جو اپنے پانچ بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے، اپنے والد کے رام پور آنے کے چھے سال بعد ۱۸۴۸ء میں یہیں پیدا ہوئے۔ **علی بخش خاں** کے رام پور سے توسّل کا دوسرا ثبوت **جناب رئیس منظر** نے **مولانا محمد علی جوہر** کی والدہ کی ایک تحریر سے فراہم کیا ہے جو 'انجمن اعانت نظر بندانِ اسلام' کے شائع کردہ کتابچے: 'شوکت علی، محمد علی کی نظربندی' میں شامل ہے۔ یہ کتابچہ مارچ ۱۹۱۸ء میں اور 'تذکرۂ کاملانِ رام پور' مارچ ۱۹۲۱ء میں شائع ہوا تھا۔ **علی بخش خاں** اس سے بہت پہلے ۱۲۸۴ھ/ ۱۸۹۷ء میں وفات پا چکے تھے۔ وقت کے اس قابلِ لحاظ تفاوت کے پیشِ نظر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس نزاع کے تصفیے کے لیے قدیم تر مآخذ کی طرف رجوع کیا جائے۔ اسی خیال کے تحت سطورِ ذیل میں دو ایسی شہادتیں پیش کی جا رہی ہیں جو **علی بخش خاں** کے ہم عصر اور ان کے خاندان سے غیر متعلق افراد کے بیانات پر مشتمل ہیں۔

علی بخش خاں کے رام پور سے توسّل کے پہلے شاہد **مرزا غالب** ہیں۔ ریاست رام پور سے **مرزا صاحب** کا باقاعدہ تعلق اگرچہ **مولانا فضلِ حق خیرآبادی** کی تحریک وتوسط سے فروری ۱۸۵۷ء میں قائم ہوا۔[۱] لیکن وہ اس توسّل کے لیے **نواب یوسف علی خاں** کی مسند نشینی (اپریل ۱۸۵۵ء) کے بعد سے مسلسل سرگرمِ عمل تھے۔ **مولانا عرشی** کے قیاس کے مطابق اس سلسلے میں انھوں نے **علی بخش خاں** کے اثر ورسوخ سے بھی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ ۶/فروری ۱۸۵۶ء کو **خاں صاحب موصوف** کی معرفت سرکاری کتب خانے کے لیے "مہرِ نیم روز" کی خریداری بہ گمانِ غالب اسی حکمتِ عملی کا ایک حصہ تھی۔ اپنی ان کوششوں میں کامیابی کے بعد **غالب** نے **نواب یوسف علی خاں** کے حسبِ خواہش ۱۸۶۰ء کے اوائل میں پہلی مرتبہ رام پور کا سفر کیا اور ۲۷/جنوری سے ۱۷/مارچ تک وہاں مقیم رہے۔ اس قیام کے دوران انھیں **علی بخش خاں** سے جو بہ حیثیت **خان ساماں ملازمینِ خاص** کے زمرے میں شامل تھے، قریب تر آنے کے مواقع حاصل ہوئے۔ چنانچہ **۲۲**/جولائی ۱۸۶۱ء کو **نواب یوسف علی خاں** کے نام لکھے ہوئے ایک خط سے **معلوم** ہوتا ہے کہ اس سے کچھ پہلے انھوں نے **خاں صاحب موصوف** کو خط لکھ کر ان سے **میرن صاحب** اور **میر سرفراز حسین** کو حصولِ ملازمت میں مدد دینے کی درخواست کی تھی۔[۲] "مہرِ نیم روز" کی خریداری کا واقعہ اور اس خط کے مندرجات صرف **علی بخش خاں** کی رام پور میں موجودگی ہی کی تصدیق نہیں کرتے، ریاست میں ان کے اثر واقتدار کی بھی نشان دہی کرتے ہیں۔

مرزا غالب دوسری مرتبہ ۱۸۶۵ء کے اواخر میں **نواب کلب علی خاں** کے جشنِ مسند نشینی میں شرکت کی غرض سے رام پور تشریف لے گئے اور ۱۷/اکتوبر سے ۲۸/دسمبر تک ریاست کے مہمان رہے۔ **رام پور** کے اس قیام کے دوران انھوں نے وہاں سے اپنے احباب وتلامذہ کو جو خطوط لکھے، ان میں سے ایک خط موسومہ **حکیم غلام رضا خاں** میں **علی بخش خاں** کا ذکر بھی موجود ہے۔ ریاست کے نئے حکمراں کے اوصافِ حسنہ کا تذکرہ کرتے ہوئے **غالب** لکھتے ہیں:

> نواب صاحبِ حال بہ مقتضائے اَلْوَلَدُ سِرٌّ لَابِیْہِ
> حسنِ اخلاق میں نواب فردوس آرام گاہ کے
> برابر بلکہ بعض شیوہ وروش میں ان سے بہتر
> ہیں۔ بہ مجرد مسند نشینی کے غلّے کا محصول

> یک قلم معاف کیا۔ علی بخش خاں خان ساماں کو
> تیس ہزار روپیہ بابت مطالبۂ سرکاری بخش
> دیا۔[۳]

غالب کی تحریروں میں **علی بخش خاں** کا حوالہ تیسری مرتبہ ۱۴/مئی ۱۸۶۷ء کے ایک مکتوب میں ملتا ہے، جو **نواب کلب علی خاں** کے نام ہے۔ اس خط میں **غالب** نے **خاں صاحب** موصوف اور صاحبزادہ **محمد حسن خاں** کے انتقال پر اظہارِ افسوس کیا ہے۔ '**ادائے مدارجِ تسلیم**' اور استیلائے رنج وملال کی کیفیت بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

> دوسری محرم کو علی بخش خاں خان ساماں
> مرے، تیسری کو یہ واقعۂ ہوش ربا (وفاتِ
> صاحب زادہ محمد حسن خاں) پیش آیا۔ یہ تو
> آپ کا فرزندِ دلبند تھا، جو اس کا غم ہو وہ بجا
> ہے، پر فقیر جانتا ہے کہ علی بخش خاں کے
> مرنے کا بھی حضرت کو بڑا رنج ہوا ہوگا۔ ایسے
> دیانت دار، کارگزار، ہوش مند، مزاج داں کہاں
> پیدا ہوتے ہیں؟[۴]

ان دونوں خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ **نواب یوسف علی خاں** کے بعد **نواب کلب علی خاں** کے عہد میں بھی **علی بخش** کا اعتبار و امتیاز برقرار رہا اور انھوں نے ۱۴/مئی ۱۸۶۷ء سے قبل محرم کی دوسری تاریخ کو رام پور ہی میں وفات پائی۔

دوسرے ہم عصر شاہد جو **علی بخش خاں** کی رام پور ہی میں موجودگی کا پتا دیتے ہیں، **منشی انوار حسین تسلیم سہسوانی** (۱۸۱۵-۱۸۹۲ء) ہیں۔ **تسلیم** نے عنفوانِ شباب سے وفات تک عمر کا بیش تر حصہ مرادآباد میں بسر کیا۔ انھوں نے رام پور میں حصولِ ملازمت کے لیے غالباً کبھی کوشش نہیں کی لیکن **نواب محمد سعید خاں** کی تخت نشینی (۱۸۴۰ء) سے قبل سہسوان میں ڈپٹی کلکٹر رہ چکے تھے، ان کے خاندانی روابط تھے۔ اس تعلق کی بنا پر انھیں قیامِ مرادآباد کے ابتدائی زمانے ہی سے ریاست میں آمد

ورفت کے مواقع اور فرماں روایانِ وقت سے تقرب کا شرف حاصل رہا۔اس نسبتِ خاص کی یادگار ان کی تصنیف:'تاج المدائح' ہے جو ان کے اپنے الفاظ میں: "بہ ایمائے فیض پیرائے (نواب کلب علی خاں بہادر) فرماں روائے رام پور" لکھی گئی تھی اور ۱۲۸۸ھ/۱۸۷۲ء میں مطبعِ نول کشور (لکھنؤ) سے شائع ہوچکی ہے۔یہ کتاب دو ابواب اور ایک ضمیمے پر مشتمل ہے۔[بابِ اول] 'فن شعر اور اس کے اقسام' کے بیان سے متعلق ہے، جب کہ [بابِ دوم] 'هر آنچه به ریاست لازم وملزوم ست' کے زیرِعنوان لوازمِ ریاست ومتوسلینِ سرکار کے ذکر سے تعلق رکھتا ہے۔یہ دونوں باب ۱۲۸۳ھ/ ۱۸۶۶ء میں لکھے جا چکے تھے، جیسا کہ مندرجۂ ذیل قطعۂ تاریخ سے ظاہر ہے:

چوں به تعریف جناب نکته سنج
در سخن دادیم دادِ انتظام
خامۂ دُربار در تاریخِ سال
زد رقم: تاج المدائح شد تمام
۱۲۸۳ھ

موخرالذکر باب کے تحت خاصانِ ریاست کے زمرے میں **مولوی محمد عثمان خاں مدارالمہام، مولانا محمد سعد اللہ مرادآبادی، منشی امیر احمد امیر مینائی، نواب مرزا خاں داغ، حکیم ضامن علی جلال، مرزا رحیم الدین حیا، میر عوض علی خوش نویس** اور **شیخ وحید الزماں** وکیل کے پہلو بہ پہلو **شیخ علی بخش خاں**، تحصیل دار کا ذکر بھی موجود ہے۔ان کے بارے میں **تسلیم** نے لکھا ہے:

مشارٌ الیه ومومی الیه سرکار، علی بخش خاں بهادر تحصیل دار کارسنج وخاطر جوست، مزاج دان گوست، کارداں در همه کارداران ست وپیش رودر جمله پیش کاران ست۔ نه سخن آفرین ست، نه سخن چین ست۔ هاں مردِ خوانده است، یارِ مردمِ درمانده۔ حاجت روائیِ، منتشراں شعارش،

دست گیری از پا افتادگان کارش۔ ہر کسے کہ با
او پیوست، با محبوبۂ آرزو پیوست۔ شیخِ کلال
ست، صاحبِ اقبال ست، مآل اندیش ودوربین
است، فکرش بر فلک، خوداوبر زمیں۔ سابق خان
ساماں بود، حال تحصیل دارست، در مقتبسانِ
بساط فیض مناطِ اقتدار ست (ص:۶۳)

تاج المدائح ، میں انشا پردازی وعبارت آرائی کے التزام کی بنا پر الفاظ کے استعمال اور تراکیب کے اختراع میں بعض رعایتیں ملحوظ رکھی گئی ہیں، جن کی وضاحت حاشیوں میں کردی گئی ہے۔ ان حواشی کی روشنی میں اس عبارت کا مفہوم حسبِ ذیل ہے۔

علی بخش خاں بہادر (تحصیل دار) سرکارِ رام پور کے انتہائی معتبر اور معتمد علیہ ملازم ہیں۔ وہ بے حد معاملہ فہم، خوش اخلاق اور مزاج داں ہیں اور مخاطَب سے اس کی کیفیتِ طبعی کے مطابق گفتگو کے فن سے بہ خوبی واقف ہیں۔ کار پردازانِ ریاست میں وہ سب سے زیادہ کار آگاہ اور خدمت گارانِ خاص میں سب پر سابق وفائق ہیں۔ سخن سازی اور عیب جوئی سے مبرّا ہیں، پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ مصیبت زدہ لوگوں سے ہمدردی رکھتے ہیں چنانچہ پریشاں حالوں کی حاجت روائی ان کا شعار اور بے سہاروں کی دست گیری ان کا شغل ہے۔ جس شخص کو ان کا تقرب حاصل ہو گیا، وہ گویا اپنی مراد کو پہنچ گیا (نسباً) **شیخِ کلال** اور (مراتب ظاہری کے لحاظ سے) صاحبِ اقبال ہیں۔ مآل اندیشی ودوربینی ان کا خاصۂ طبیعت اور بلند خیالی وسادہ روی ان کی شخصیت کا جوہر ہے۔ پہلے **خان ساماں** تھے، آج کل **تحصیل داری** کے عہدے پر فائز اور اختیار واقتدار کی بساطِ فیض مناط سے روشنی حاصل کرنے والوں میں شامل ہیں۔

غالب اور **تسلیم** کے ان بیانات سے مندرجہ ذیل نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں۔

۱۔ علی بخش خاں ورودِ رام پور کے بعد سے اپنی وفات تک برابر متوسلینِ ریاست میں شامل رہے۔

۲۔ انھیں والیانِ ریاست کے انتہائی کارگزار قابلِ اعتماد اور مزاج شناس ملازم کی حیثیت حاصل تھی۔

۳۔ انھوں نے ۲/ محرم ۱۲۸۴ھ مطابق ۶/مئی ۱۸۶۷ء کو رام پور ھی میں انتقال کیا۔

۴۔ ان کا نسبی تعلق شیوخ کلال سے تھا، اس لیے ان کے نام کے ساتھ 'خان' اور به روایت تسلیم 'بھادر' کا لاحقه ان کی شخصی عزت ووجاھت پر دلالت کرتا ھے۔

یہاں ضمناً اس امر کا تذکرہ بھی بے محل نہ ہوگا کہ **مولانا محمد علی جوہر** کو **غالب** کی شخصیت اور شاعری سے جو غیر معمولی دلچسپی تھی، اس کا سرچشمہ بہ ظاہر ان کے دادا **علی بخش خاں** اور **غالب** کے درمیان وہ رابطۂ اتحاد معلوم ہوتا ہے جس کی شہادت موخر الذکر کے خطوط سے ملتی ہے۔ غالباً **مولانا محمد علی** ہی وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے قیامِ کلکتہ کے زمانے میں اپنے اخبار: 'کامریڈ' کی ۱۷/جون ۱۹۱۱ء کی اشاعت میں ایک مضمون لکھ کر **غالب** کے قدر دانوں کو ان کے مزار پر ایک مناسب یادگار کی تعمیر، ان کی تصانیف نظم ونثر کے عمدہ ایڈیشنوں کی اشاعت اور اسی قسم کے دوسرے مقاصد کی تکمیل کے لیے غالب سوسائٹی کے قیام کی جانب متوجہ کیا تھا۔

حاصلِ کلام یہ کہ **غالب** اور **تسلیم** کی ان دو معاصر شہادتوں کی روشنی میں یہ حقیقت پوری طرح واضح ہوجاتی ہے کہ **مولانا محمد علی جوہر** کے دادا **شیخ علی بخش خاں** نے نجیب آباد سے ترکِ سکونت کے بعد رام پور کو اپنا وطنِ ثانی بنالیا تھا۔ وہ ۱۸۴۲ء سے ۱۸۶۷ء تک مستقلاً رام پور ہی میں رہے اور تقریباً پچیس سال ریاست کی خدمات انجام دے کر بالآخر اسی خاک کا پیوند ہوگئے۔ اس کے بعد **مولانا محمد علی** کی رام پور میں ولادت کے متعلق کسی شبہے کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

حواشی

۱۔ مکاتیبِ غالب /مرتبہ: **مولانا امتیاز علی عرشی** (رام پور) ۱۹۴۹ء، ص: ۱۹۷
۲۔ ایضاً، ص: ۲۲-۲۱
۳۔ اردوئے معلی، اکمل المطابع (دھلی) ۱۸۶۹ء، ص: ۴۵۳
۴۔ مکاتیبِ غالب، ص: ۱۷ (ماہ نامہ: نگار [دھلی] شمارہ: اپریل، مئی ۱۹۸۰ء)

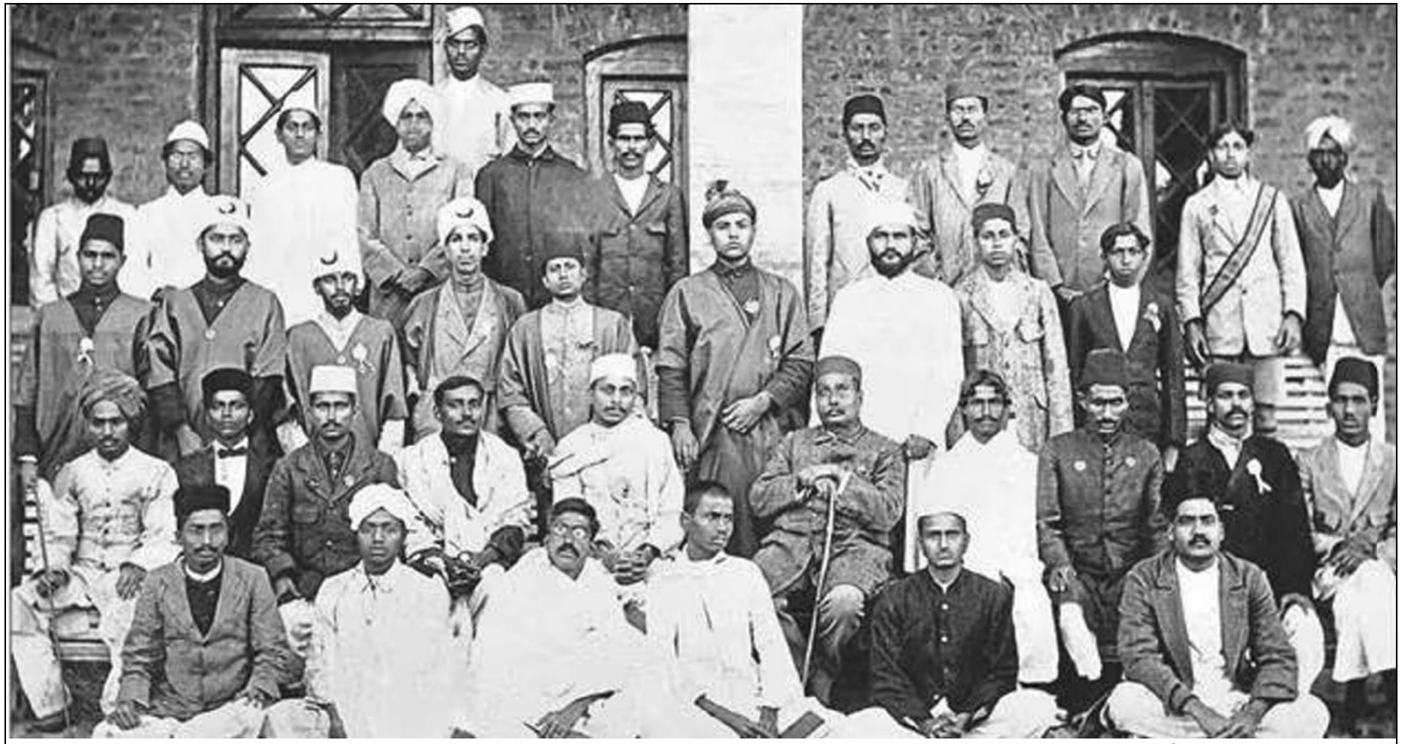

طلباء اور اساتذہ کے گروپ کی 1920 کی تصویر، بشمول ذاکر حسین (تیسری قطار بائیں سے دوسری) جس میں لالہ لاجپت رائے (دوسری قطار، چھڑی پکڑے ہوئے) کے ساتھ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا آغاز کیا۔ (بشکریہ: جامعہ پریم چند آرکائیوز اینڈ لٹریچر سینٹر)

جامعہ ملیہ اسلامیہ
اور
محمد اقبال

عبداللطیف اعظمی*

جامعہ ملیہ اسلامیہ سے **اقبال** کا تعلق اس کے یومِ تاسیس سے لے کر آخر دم تک قایم رہا۔ جامعہ ملیہ نے **اقبال** کی تعلیمات اور ان کے افکار و خیالات کی ترویج و اشاعت اور تشریح و توضیح کی جو خدمات انجام دی ہیں، اس کی مثال شاید ہی کسی اور یونی ورسٹی میں مل سکے۔ یہ تعلق اور عزت و محبت یک طرفہ نہیں تھا۔ خود حضرت **علامہ** بھی جامعہ کا بے حد خیال رکھتے اور جامعہ کے اربابِ حل و عقد کو بڑی عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

یہ تو معلوم ہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ ۱۹۲۰ء میں ۲۹/ اکتوبر کو علی گڑھ میں قایم ہوئی اور اس کا قیام اس وقت کی سیاسی تحریک عدم تعاون کا مرہونِ منت تھا۔ ویسے تو جامعہ کے بانیوں میں وہ تمام قومی رہنما شامل ہیں جنھوں نے جامعہ کے قیام میں کسی نہ کسی قسم کا قابلِ ذکر اور ممتاز حصہ لیا تھا، مگر ان میں سب سے زیادہ نمایاں اور ممتاز حصہ **مولانا محمد علی** کا تھا، اس لیے

* سابق پرسنل سیکرٹری وائس چانسلر، جامعہ ملیہ اسلامیہ

جامعہ کا اگر کوئی ایک بانی ہوتا تو یقیناً **مولانا محمد علی** ہوتے۔ **حکیم اجمل خاں** صاحب بھی جامعہ کے بانیوں میں سے ہیں، وہ اس کے پہلے امیرِ جامعہ اور **محمد علی** اس کے پہلے شیخ الجامعہ مقرر ہوئے، مگر مولانا کے ساتھ دقت یہ تھی کہ وہ سیاسی مسائل میں اس قدر الجھے ہوئے تھے کہ جامعہ جیسے تعلیمی ادارے کو جو نیا نیا قایم ہوا تھا، ان کے لیے خاطر خواہ وقت دینا مشکل تھا، دوسرے یقین کے ساتھ یہ کہنا مشکل تھا کہ کب وہ جیل میں ہوں گے اور کب جیل کے باہر۔ اس لیے **مولانا محمد علی** نے ۲۲ر نومبر ۱۹۲۰ء کو فاؤنڈیشن کمیٹی کے جلسے میں یہ تجویز پیش کی: ''ڈاکٹر اقبال صاحب سے درخواست کی جائے کہ وہ عہدۂ پرنسپلی کو قبول کرلیں۔'' **ڈاکٹر اقبال** کا نام غالباً دو وجھوں سے پیش کیا گیا ہوگا، ایک اس وجہ سے کہ وہ قومی اور وطنی شاعر کے ساتھ ساتھ شاعرِ اسلام اور مفکرِ اسلام کی حیثیت سے بھی ملک گیر شہرت کے مالک تھے، دوسرے خود **مولانا محمد علی** ذاتی طور پر ان کی شاعری سے بے حد متاثر تھے، جس کی تفصیل آگے آئے گی۔ اس جلسے کی روداد میں یہ بھی درج ہے: ''یہ تجویز باتفاق رائے منظور ہوئی اور ایک تار اس مضمون کا ان کے پاس بھیجا گیا۔'' **گاندھی جی** بھی جامعہ کے بانیوں میں ہیں اور ان کی اہمیت یہ ہے کہ **مولانا محمد علی** کی درخواست پر سب سے پہلے علی گڑھ کالج میں تقریر کی تھی اور اس کے اساتذہ اور طلبہ سے برطانوی حکومت سے ترکِ موالات کی براہِ راست اپیل کی تھی جس کے نتیجے کے طور پر جامعہ کا وجود عمل میں آیا۔ اس کے علاوہ وہ قومی رہنماؤں میں ممتاز اور بلند حیثیت کے مالک تھے، اس لیے غالباً ان سے بھی درخواست کی گئی ہوگی کہ وہ بھی جامعہ کی ذمے داری قبول کرنے کے لیے **علامہ اقبال** کو لکھیں۔ چنانچہ انھوں نے نومبر ۱۹۲۰ء کے آخری ہفتے میں **اقبال** کو ایک مختصر سا خط لکھا جس کا ترجمہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

○

[۲۷ر نومبر ۱۹۲۰ء[۱] سے پہلے]

ڈیر ڈاکٹر اقبال،

مسلم نیشنل یونی ورسٹی آپ کو آواز دے رہی ہے۔ اگر آپ اس کا چارج لے سکیں تو مجھے یقین ہے کہ وہ آپ کے مہذب رہنمائی میں یہ ترقی کر سکے گی۔ **حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر**

انصاری اور بلاشبہ **علی برادران** کی بھی یہی خواہش ہے۔ میری خواہش ہے کہ آپ قبولیاتی کا کوئی راستہ نکال سکیں۔ نئ بیداری کے تقاضوں کے بقدر آپ کے اخراجات کی کفالت کی جاسکے گی۔ براہِ کرم **پنڈت نہرو** کی معرفت الہ آباد کے پتے پر جواب دیجیے۔

آپ کا مخلص

ایم کے گاندھی

لاھور

۲۹؍نومبر ۱۹۲۰ء

ڈیر **مسٹر گاندھی**!

نوازش نامہ پرسوں ملا، جس کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ مجھے بے حد افسوس ہے کہ بعض وجوہ سے جن کا ذکر اس وقت کچھ ضروری نہیں، ان حضرات کی آواز پر جن کی میرے دل میں بڑی عزت ہے، لبیک کہنا میرے لیے مشکل ہے۔ اگرچہ میں قومی تعلیم کے شدید حامیوں میں سے ہوں، مگر ایک یونی ورسٹی کی رہنمائی کے لیے، مجھ میں وہ صلاحیتیں نہیں ہیں جو مختلف کشمکشوں اور رقابتوں کی صورت میں جو عموماً ابتدائی حالات میں پیدا ہوتی ہیں، کسی نوزائیدہ ادارے کو چلا سکیں۔ مزید یہ کہ فطری طور پر میں پرسکون حالات میں کام کرسکتا ہوں۔

ایک اور بات یہ بھی ہے۔ ہم جن حالات سے دوچار ہیں، ان میں سیاسی آزادی سے قبل معاشی آزادی ضروری ہے اور اقتصادی لحاظ سے ہندوستانی مسلمان، دوسرے فرقوں کے مقابلے میں بہت پیچھے ہیں۔ بنیادی طور پر انھیں ادب اور فلسفے کی نہیں، بلکہ ٹیکنیکل تعلیم کی ضرورت ہے، جس کی بنا پر انھیں معاشی آزادی حاصل ہوگی، اس لیے فی الحال انھیں اپنی صلاحیتیں اور توجہ اسی موخر الذکر طریقۂ تعلیم پر مرکوز کرنی چاہیے۔ جن معزز حضرات نے علی گڑھ میں نئی یونی ورسٹی قایم کی ہے، انھیں چاہیے کہ اس نئے ادارے میں خصوصی طور پر طبعی علوم کے ٹیکنیکل پہلو پر زور دیں اور اسی کے ساتھ ساتھ حسبِ ضرورت مذہبی تعلیم کا بھی انتظام کریں۔

اس میں شبہ نہیں کہ عالمِ اسلام، بالخصوص عرب ملکوں اور مقدس مقامات میں جو واقعات پیش آئے ہیں، ان کے پیشِ نظر کسی نہ کسی قسم کا عدم تعاون اختیار کرنے میں وہ حق بجانب ہیں، لیکن تعلیم کا

مذہبی پہلو، میرے ذہن میں، ہنوز غیر واضح ہے اور میں نے اس مسئلے پر مکمل طور پر غور کرنے کے لیے اپنی تجاویز شائع کر دی ہیں۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ میں شریعت کا ماہر نہیں ہوں، لیکن میرا عقیدہ ہے کہ جہاں تک تعلیم کا سوال ہے، موجودہ مجبوریوں کے باوجود فقہ اسلامی ہماری مناسب عملی رہنمائی کرنے میں معذور نہیں بنے گی۔

امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

آپ کا مخلص

(دستخط)

محمد اقبال-لاہور

O

علامہ اقبال نے جامعہ کے پرنسپل (یا شیخ الجامعہ جسے اُس وقت پرنسپل کہتے تھے) کے عہدے کو قبول کرنے سے جن وجوہ سے انکار کیا تھا، انھیں پوری تفصیل سے لکھ دیا ہے۔ جو لوگ **اقبال** کے مزاج اور حالات سے واقف ہیں وہ تسلیم کریں گے کہ انھوں نے انکار کر کے اپنے ساتھ بھی انصاف کیا اور جامعہ کے ساتھ بھی۔ کیونکہ آگے چل کر سیاست میں جو موڑ آیا اور جامعہ جن مالی دشواریوں سے دوچار ہوئی وہ صورتِ حال یقیناً **اقبال** جیسے حساس شاعر کے لیے بڑی تکلیف دہ ہوتی اور اس کا ردِ عمل نہ جانے کس صورت میں ظاہر ہوتا اور یہ ناگواری نہ جانے کون سا رنگ اختیار کرتی۔

اقبال نے اپنے اس خط میں اگرچہ **قومی تعلیم** کی حمایت کی ہے اور **عدم تعاون** کی بھی مشروط تائید کی ہے، مگر میرا اپنا خیال ہے کہ **اقبال**، کم از کم تعلیمی سطح پر **عدم تعاون** کے خلاف تھے، اس لیے جامعہ کی سربراہی سے انکار کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے۔ اس سلسلے میں **اقبال** کے احساسات اور خیالات کو سمجھنے کے لیے، میں اپنے مطالعے کا آغاز ان کے اس منظوم پیغام سے کرتا ہوں جو انھوں نے ۱۹۰۷ء میں انگلستان سے طلبۂ علی گڑھ کالج کو اس وقت بھیجا تھا جب وہ یورپین اسٹاف بالخصوص **انگریز** پرنسپل کے خلاف تحریک چلا رہے تھے۔ اُس وقت **اقبال** نے طلبہ کو یہ مشورہ دیا تھا کہ چونکہ ہندوستانی مسلمانوں میں ابھی اتنی بڑی ذمے داری سنبھالنے کی اہلیت وصلاحیت

پیدا نہیں ہوئی ہے۔ اس لیے یورپین اسٹاف کی سربراہی اور قیادت کی مخالفت ملی مفاد اور وقتی مصلحت کے خلاف ہے۔ اس مختصر نظم کا آخری شعر ہے:

بادہ ہے نیم رس ابھی، شوق ہے نارسا ابھی
رہنے دو خم کے سر پہ تم، خشتِ کلیسا ابھی

بانگِ درا، کے ایک شرح نگار، **پروفیسر یوسف سلیم چشتی** اور آخری شعر کی توضیح وتشریح میں فرماتے ہیں:

> اے نوجوانو! تمھاری شراب (خواهشِ انقلاب) ابھی پختہ نہیں ہوئی ہے، اور تمھارا جذبۂ شوق (عشقِ رسول) بھی ابھی مرتبۂ کمال کو نہیں پہنچا ہے، یعنی ابھی تمھارے اندر اسلامی انقلاب برپا کرنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوئی ہے، اس لیے مصلحتاً تم ابھی کچھ عرصے کے لیے اپنے کالج کا نظم ونسق انگریز پرنسپل (انگریزی حکومت) ہی کے ہاتھ میں رکھو۔

اس کے بعد ۱۹۲۰ء میں جب **برطانوی حکومت** کے خلاف ملک گیر پیمانے پر ترکِ موالات کی تحریک شروع ہوئی تو اس تحریک کے بارے میں **اقبال** کے خیالات کا اندازہ ان کے ان دو خطوط سے ہوتا ہے، جو انھوں نے ایک رئیس اور اپنے بے تکلف دوست اور عقیدت مند **خان محمد نیاز الدین خاں** کو لکھے تھے۔ پہلا خط جامعہ کے یومِ تاسیس سے صرف ایک دن قبل لکھا گیا ہے اور اس خط سے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ جو لوگ علی گڑھ کالج سے **انگریزی حکومت** سے مکمل **ترکِ موالات** کا مطالبہ کر رہے تھے، انھوں نے اپنی جماعت میں **اقبال** کا نام بھی استعمال کیا تھا، جس کی **اقبال** کو تردید کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ خط ملاحظہ ہو، شروع کی دو سطریں غیر متعلق تھیں اس لیے حذف کر دی ہیں:

○

لاھور-۲۸/اکتوبر۱۹۲۰ء

مخدومی،السلام علیکم

علی گڑھ سے ابھی کوئی خبر نہیں آئی۔ اسلامیہ کالج میں بھی وہی حالات پیدا ہو چلے تھے۔مگر طلبہ کو چھٹی دے دی گئی ہے اور الحاق کے بارے میں خود ان کی رائے میں بھی تبدیلی ہو رہی ہے۔امید ہے کہ اب اس بارے میں **اراکین انجمن** کو تردد نہ رہے گا۔میری تو یہی رائے ہے کہ گرانٹ اور الحاق کے بارے میں جو فتویٰ علما کا ہو اس پر عمل کرنا چاہیے۔چونکہ واجب الاطاعت امام اس وقت موجود نہیں،اس واسطے **جمہور مشاہیر علمائے ہند** کا فتویٰ ضروری ہوگا،صرف ایک عالم کا فتویٰ اس بارے میں کافی نہیں،خواہ وہ صحیح ہی کیوں نہ ہو۔علما کی غالب جماعت کا اس پر اتفاق ہونا چاہیے۔ذاتی رائے میری خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو،اگر علما کا فتویٰ میری ذاتی رائے کے خلاف ہو تو سرِ تسلیم خم ہے۔جہاں تک میں اندازہ کرتا ہوں،**قرآن** کے احکام اس بارے میں صاف و واضح ہیں لیکن افسوس ہے کہ بعض مشہور علما فتویٰ دیتے ہوئے خائف ہیں۔بعض کی خدمت میں،میں نے خطوط لکھے ہیں،مگر امید نہیں کہ جواب ملے۔

باقی رہا میرا،ان لوگوں سے ہم خیال ہونا،ہم خیالی صرف اسی حد تک ہے جس حد تک **قرآن** کا حکم ہو اور بس۔اخباروں میں انھوں نے شائع کیا ہے کہ **اقبال** نے قومی آزاد یونی ورسٹی سے متعلق مدد دینے کا وعدہ کیا ہے۔یوں تو مسلمانوں کے معاملات میں اگر مجھ سے مدد طلب کی جائے تو مجھے تعمیلِ حکم میں کیوں کرتامل ہو سکتا ہے،تاہم جو کچھ اخباروں میں لکھا گیا ہے،بالکل غلط ہے۔اس خیال سے کہ علی گڑھ میں اس بیان سے لوگ دھوکا نہ کھائیں،میں نے ایک تار آنریری سکرٹری کو دیا ہے کہ یہ بات صحیح نہیں ہے جو اخباروں میں شائع ہوئی ہے۔زیادہ کیا عرض کروں۔[۲]

والسلام

مخلص

محمد اقبال

دوسرا خط تقریباً ایک ماہ بعد لکھا گیا ہے۔اگر چہ پہلے خط میں طلبائے اسلامیہ کالج

(لاهور) کی طرف سے ایک حد تک اطمینان کا اظہار کیا گیا تھا، لیکن وہ تاثر غالباً صحیح نہیں تھا اور آگے چل کر اور غالباً جامعہ ملیہ اور ملک میں دوسری قومی یونی ورسٹیوں کے قیام سے وہاں کے طلبہ کو حوصلہ ملا اور تحریکِ ترکِ موالات وہاں بھی زور پکڑ گئی اور علامہ اقبال کو انجمن حمایت اسلام کی نظامت سے استعفیٰ دینا پڑا۔ انجمن حمایتِ اسلام کو غالباً اسلامیہ کالج سے امداد ملتی تھی اور وہاں شاید یہ مطالبہ بھی تھا کہ انجمن حمایتِ اسلام، کالج کی امداد لینا بند کر دے اور اس سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھے۔ خط ملاحظہ ہو، آخر کی دو سطریں غیر متعلق تھیں، اس لیے حذف کر دی گئی ہیں:

○

مخدومی، السلام

آپ کا خط مل گیا ہے، لیکن اس کا جواب لکھنا کارے دارد۔ بہت طویل ہوگا، فرصت مل گئی تو لکھوں گا، ورنہ اس وقت کا منتظر رہوں گا، جب میں جالندھر آؤں یا آپ لاہور تشریف لاویں۔ انجمن کی سیکرٹری شپ سے میں نے استعفیٰ ضرور دیا تھا مگر کام اب تک کر رہا ہوں اور جب تک استعفیٰ منظور نہ ہو، کرتا رہوں گا۔ امید ہے کہ عوام کی حالتِ جنوں اب زیادہ دیر تک نہ رہے گی۔ تعلیم میں عدم تعاون کرنے کا یہ طریقہ نہ تھا جو بعض لوگوں نے اختیار کر رکھا ھے۔ اگر عدم تعاون کو شرعی فرض بھی تسلیم کر لیا جائے تو طریقِ کار میرے نزدیک شریعتِ اسلامیہ کی اسپرٹ کے مخالف ہے۔ اس پر مفصل گفتگو زبانی ہوگی اور احکامِ شریعت جو میری سمجھ میں آئے ہیں، عرض کروں گا۔ 'زمیندار' میں آپ نے میرا مضمون ملاحظہ کیا ہوگا۔[۳]

مخلص

محمد اقبال۔ لاہور

۳؍ دسمبر ۱۹۲۰ء

○

باوجود اس کے کہ جامعہ کا قیام ایک مخصوص سیاست کا نتیجہ تھا اور اقبال کے سیاسی خیالات ان لوگوں کے خیالات سے مختلف تھے، جن کا جامعہ کے بانیوں میں شمار ہوتا ہے، مثلاً

گاندھی جی، مولانا محمد علی، مولانا آزاد اور ڈاکٹر انصاری وغیرہ، مگر اس کے باوجود دونوں کے تعلقات بڑے خوش گوار تھے اور خوشی کی بات یہ ہے کہ آخر وقت تک اس میں کوئی ناخوش گواری پیدا نہیں ہوئی۔

ماہنامہ: جامعہ، جنوری ۱۹۲۳ء میں علی گڑھ سے جاری ہوا۔ اس کے تیسرے شمارے، مارچ ۱۹۲۳ء میں **اقبال** کی طویل نظم 'طلوعِ اسلام' شائع ہوئی۔ بانگِ درا، کے شرح نگار **پروفیسر یوسف سلیم چشتی** نے اس نظم کا پس منظر بیان کرتے ہوئے لکھا:

> طلوعِ اسلام کا پس منظر یہ ہے کہ انہوں نے
> ۱۹۲۲ء میں لکھی تھی، چونکہ اس زمانے میں
> مصطفٰی کمال پاشا نے سقاریہ کی جنگ میں
> یونانیوں کو شکست دے کر ساری دنیا پر یہ
> حقیقت آشکار کردی تھی کہ ترک ابھی زندہ
> ہیں،...

اسی طرح رجائیت کے عالم میں یہ نظم لکھی...**اقبال** نے **مصطفیٰ کمال** کی کامیابی کو 'طلوعِ اسلام' سے تعبیر کیا ہے۔[۴] The poet of the east کے مصنف **عبداللہ انور بیگ** نے اس نظم کی تاریخ وہی لکھی ہے جو ماہنامہ: جامعہ، میں اشاعت کی ہے، یعنی مارچ ۱۹۲۳ء[۵] **مولانا عبدالحمید سالک** نے لکھا ہے کہ **اقبال** نے یہ نظم ۱۹۲۴ء میں **انجمن حمایتِ اسلام** کے سالانہ جلسے میں پڑھی تھی[۶] مگر میری تحقیق کے مطابق **اقبال** نے **انجمن حمایتِ اسلام** میں یہ نظم ۱۹۲۳ء میں ۳۰/مارچ کو پڑھی تھی[۷] ۱۹۲۴ء کے جلسے میں چند متفرق اشعار سنائے تھے۔ مختصر یہ کہ میرا خیال ہے کہ **اقبال** کی یہ اہم اور مشہور نظم سب سے پہلے ماہنامہ: جامعہ، میں شائع ہوئی ہے اور یہ بڑی بات ہے۔

۱۹۲۳ء میں **اقبال** کا پہلا مجموعۂ کلام: پیامِ مشرق، شائع ہوا تو ماہنامہ: جامعہ، بابت ماہ اپریل ۱۹۲۳ء کے شذرات میں اس کا خیر مقدم کرتے ہوئے لکھا گیا کہ **ڈاکٹر اقبال** کو آج تک صرف ایک شاعر ہی نہیں بلکہ حیاتِ ملی کے نازک و پُرخطر دور کا نبض شناس اور آنے والے حوادث و آلام سے متنبہ کرنے والا پیغامبر سمجھا گیا ہے۔ خیالات کی بلندی نے جذبات کی پاکیزگی کو اعجاز بنا کر پیش کیا اور دل کی درد و تڑپ نے دنیا کو وہ چیز بخشی جو بالآخر کلامِ **اقبال** کے نام سے مشہور ہوئی۔ **ڈاکٹر صاحب** کی تازہ ترین

تصنیف: پیامِ مشرق [۸] اگر پیغامی حیثیت میں نہیں تو اپنے شاعرانہ انداز میں ان کی دوسری فارسی تصنیفات سے زیادہ بلند اور زیادہ وسیع ہیں۔ انھوں نے اس مجموعے میں ملتِ اسلامی کے کسی ایک پہلو سے بحث نہیں کی ہے، بلکہ مختلف و متفرق اشعار، قطعات، رباعیات، نظموں اور غزلوں میں مشرق کی روح کو مغربی دماغ کے لیے پیش کیا ہے، تاکہ مغرب کے بعض افراد جو اپنی بلند پروازی اور وسعتِ خیال کے لیے دنیائے مغرب کو تنگ پا کر فضائے مشرق کی طرف رُخ کرتے ہیں، اس مجموعے میں اس کی ہمہ گیر و عدیم النظیر وسعت کا کچھ اندازہ کر سکیں اور اپنی استعداد کے مطابق اس سے بہرہ اندوز ہوسکیں۔

پیامِ مشرق [۹] درحقیقت المانوی شاعر گوئٹے کے مغربی دیوان کا جواب ہے جو آج سے قبل اقلیمِ سخن کے اس تاجدار نے اپنی زبان (جرمن) میں شائع کیا تھا۔ گوئٹے مشرقیت کا دلدادہ تھا۔ خواجہ حافظ کے علاوہ سعدی و فردوسی سے بھی اس نے خوشہ چینی کی تھی اور فارسی شاعری سے اس کی شیفتگی کا یہ عالم تھا کہ اپنے مجموعۂ کلام کو مغربی دیوان کے نام سے موسوم کیا اور بعض غزلیں بھی اپنی زبان میں تصنیف کیں۔

اقبال نے اپنی جدید تصنیف کے متعلق خود ان الفاظ میں اظہار کیا ہے:

> پیامِ مشرق [۱۰] کے متعلق جو مغربی دیوان کے سو سال کے بعد لکھا گیا ہے، مجھے کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں۔ ناظرین خود اندازہ کرلیں گے کہ اس کا مدّعا زیادہ تر ان اخلاقی، مذہبی اور ملی حقائق کو پیشِ نظر لانا ہے جن کا تعلق افراد و اقوام کی باطنی تربیت سے ہے۔[۱۱]

اس کے بعد اگست کے شمارے میں 'کلامِ اقبال' کے نام سے اقبال کی ایک فارسی غزل شائع ہوئی ہے۔ عنوان کے نیچے قوسین میں لکھا ہے: ''خاص جامعہ کے لیے مرحمت فرمایا۔'' اس کے بعد حسبِ ذیل نوٹ ہے:

> علامہ اقبال کی نظرِ لطف کا یہ ثمرِ اولین ہے جس کو ہم کمالِ افتخار و انبساط کے ساتھ آج

جامعہ میں شائع کرتے ہیں۔ شکرِ نعمت واظہارِ
عقیدت مندی کے لیے الفاظ کہاں سے آئیں کہ
جذباتِ دلی کی ترجمانی کرسکیں، لیکن یہ توقع
بیجا نہیں ہے کہ مولانا محمد علی مدظلہ، کی
تشریف آوری کے بعد ہم کو اس بارے میں سبک
دوشی ہوجائے گی، اس لیے کہ ڈاکٹر صاحب اس
وقت جو کچھ عنایت فرمائیں گے وہ تقاضائے
محبت ہوگا، محض ہماری خاطر نہیں۔[۱۲] (مدیر)

غزل مختصر ہے،اس لیے قارئین کی دل چسپی اور معلومات کے لیے ذیل میں پیش کی جاتی ہے:

عرب از سر شک خونم ہمہ لالہ زار بادا
عجم رمیدہ بو را نفسم بہار بادا

تپش است زندگانی، تپش است جاودانی
ہمہ ذرّہ ہائے حاکم دل بے قرار بادا

نہ بہ جادہ قرارش، نہ بہ منزلِ مقامش
دل من مسافر من کہ خداش یار بادا

حذر از خرد کہ بندد ہمہ نقش نامرادی
دل ما برد بسازے کہ گستہ تار بادا

تو جوان خام سوزے، سخنم تمام سوزے
غزلے کہ می سرایم بتو سازگار بادا

چو بجان من درائی دگر آرزو نہ بینی
مگر ایں کہ شبنم تو یم بے کنار بادا

حسبِ ذیل شعر کے اضافے کے ساتھ، یہ غزل پیامِ مشرق میں شامل ہے:

نشود نصیب جانت کہ دمے قرار گیرد
تب و تاب زندگانی بتو آشکار بادا

جامعہ کے ایک شمارے میں پیامِ مشرق پر **مولانا حافظ اسلم جیراجپوری مرحوم** کا ایک طویل مضمون شائع ہوا ہے، جس کی ابتدائی چند سطریں حسبِ ذیل ہیں:

ڈاکٹر اقبال کا یہ تازہ دیوان میں نے پڑھا۔ مجھے اس سے جو حظ اور لطف حاصل ہوا، وہ بیان سے باہر ہے، لیکن بعض احباب کا اصرار ہے کہ میں اس کو تحریر میں لاؤں، اس لیے سرسری طور پر اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہوں، اس کو نہ تنقید سمجھنا چاہیے نہ تقریظ۔[۱۳]

حواشی

۱۔ **گاندھی جی** کے کاغذات میں اس خط کا جو مسوّدہ ملا ہے اور جو **گاندھی سمارک ندھی** کے **میوزیم** میں محفوظ ہے، اس پر کوئی تاریخ نہیں ہے، **علامہ اقبال** کے جوابی خط سے واضح ہوتا ہے کہ نومبر کے آخری ہفتے میں لکھا گیا تھا۔

۲۔ مکاتیبِ اقبال (بنام **خان محمد نیاز الدین خاں**)،ص:۳۵،خط نمبر:۴۶

۳۔ ایضاً،ص:۳۶،خط نمبر:۴۷

۴۔ شرح بانگِ درا ،ص:۷۲

۵۔ مطبوعہ: لاہور،۱۹۳۹ء،ص:۱۹۲

۶۔ ذکرِ اقبال (**سالک**) پہلا ایڈیشن،ص:۱۱۰

۷۔ اقبال۔ دانائے راز —**عبداللطیف اعظمی**،ص:۲۳۳

۸،۹،۱۰۔ پیغام مشرق ’چھپا ہے۔

۱۱۔ ماہنامہ: جامعہ ،اپریل ۱۹۲۳ء،ص:۶۲-۶۱

۱۲۔ ایضاً،بابت ماہِ اگست ۱۹۲۳ء،ص:۱۱۷

۱۳۔ ایضاً،بابت ماہِ ستمبر ۱۹۲۳ء،ص:۱۴۵

جامعہ ملیہ اسلامیہ

تعلیمی شناخت

معین الدین

رواں صدی کے ربع اول کی سیاسی دھوپ چھاؤں میں جو چند قومی ادارے قائم ہوئے ان میں گجرات وِدیاپیٹھ، کاشی وِدیا پیٹھ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ میں قائم ہوئی۔ ۱۹۲۵ء میں علی گڑھ سے دھلی (قرول باغ) اور ۱۹۲۶ء میں جامعہ نگر (اوکھلا) میں منتقل ہوئی۔

جامعہ کے بانیوں نے سوچا تھا کہ جامعہ کو دینوی تعلیم اور دینی تعلیم کا سنگم بنائیں گے جس کی بنیاد قومیت پر ہوگی اور یہ ایک آزاد اور خودمختار ادارہ ہوگا جو دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ مغربی علوم وفنون کا بھی گہوارہ ہوگا اور ہر سطح پر اس کا ذریعۂ تعلیم اردو ہوگا۔

جامعہ کے چند ابتدائی برس کچھ ایسی افراتفری میں گزرے کہ جامعہ کا نصب العین

واضح نہ ہوسکا اور اس کے بنیادی خدو خال ضبطِ تحریر میں نہ آسکے۔ بعد میں جب ۲۰ ستمبر ۱۹۲۸ء کو انجمنِ تعلیمِ ملی کا قیام عمل میں آیا تو جامعہ کا دستور پہلی بار تحریری شکل میں منظرِ عام پر آیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب فروری ۱۹۲۶ء میں **ذاکر صاحب** جرمنی سے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ھندوستان تشریف لائے اور اپنے ساتھ اپنے دو رفیقوں کو بھی لائے۔ یہ دو رفیق **ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب** اور **پروفیسر محمد مجیب صاحب** تھے۔ ان دونوں حضرات کے آنے سے جامعہ میں ایک خوش گوار اضافہ ہوا۔ کچھ دن بعد **ذاکر صاحب** جامعہ کے نئے **شیخ الجامعہ** مقرر ہوئے اور جامعہ کے ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔

انجمنِ تعلیمِ ملی کے دستور میں جامعہ کے جن مقاصد کا ذکر ملتا ہے ان کی فہرست طویل ہے۔ ذیل میں محض ان مقاصد کا ذکر کیا جا رہا ہے جن سے جامعہ کی شناخت کی جانب اشارے ملتے ہیں۔

> **جامعہ ایک آزاد اور خود مختار ادارہ ہوگا جو حصولِ آزادی تک سرکاری اثرات سے آزاد ہوگا۔ یہاں ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں کی دینی اور دنیوی تعلیم کا انتظام کیا جائے گا۔ تمام مذاہب کے ساتھ رواداری برتی جائے اور تعلیم کی ہر سطح پر ذریعۂ تعلیم اردو ہوگا۔**

جامعہ کا تعلیمی پروگرام کالج کی سطح سے شروع ہوا لیکن کالج کا دائرۂ عمل بہت محدود تھا حالانکہ بانیانِ جامعہ کی نظر میں جامعہ کا مقصد یہ تھا کہ یہ ایک نمونے کی یونیورسٹی بنے اور اعلیٰ تعلیم کو قومیت اور وطنیت سے ہم آہنگ کردے لیکن جامعہ نے مدرسے کی تعلیم، بالغوں کی تعلیم، اساتذہ کی تربیت، بنیادی تعلیم اور تعلیمی ادب کی تیاری کے سلسلے میں بعض ایسے تجربے کیے جن کو تعلیمی دنیا میں تسلیم کیا جانے لگا اور ان تجربوں کی بہ تدریج نشو ونما ہوتی رہی لیکن ۱۹۴۷ء میں جب ملک تقسیم ہوگیا تو پورے ملک میں قیامت برپا ہوگئی۔ جامعہ اپنے اچھے نامۂ اعمال کی وجہ سے بال بال بچ گئی البتہ جامعہ کی تمام تعلیمی سرگرمیاں موقوف ہوگئیں۔ رفتہ رفتہ حالات معمول پر آنے لگے

اور جامعہ نے بدلی ہوئی صورتِ حال میں خود کو نئی زندگی کے لیے تیار کیا اور تعلیم کے ان کاموں کو ازسرِ نو شروع کیا جو موقوف ہو گئے تھے۔ اسی کے ساتھ ساتھ بعض ایسے شعبوں میں بھی جامعہ نے رہنمائی کا بیڑا اٹھایا جن میں دوسرے اداروں نے کوشش نہیں کی تھی۔ جامعہ نے خصوصیت کے ساتھ **مدرسے کی تعلیم، اساتذہ کی تربیت، تعلیمِ بالغان، بالغوں کے ادب اور تعلیمی ادب** کے کام کو نہ صرف جاری رکھا بلکہ بعض نئے تجربے بھی شروع کیے۔ خصوصیت کے ساتھ مدرسوں کی تعلیم اور استادوں کی تعلیم و تربیت کے دوران **اردو ذریعہ تعلیم** کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ جامعہ کالج کا کام چونکہ اور سمٹ گیا تھا اس لیے اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہ ہو سکی۔ آخر کار بانیانِ جامعہ کی نظر میں جامعہ کا مقصد یہ رہ گیا تھا کہ جامعہ کے مدرسوں اور تعلیمِ بالغان کے لیے معلم فراہم کر دے۔ اس طرح جامعہ کا تعلیمی سفر ہر چند کہ اعلیٰ تعلیم سے شروع ہوا۔ اعلیٰ تعلیم کا پہلو ہمیشہ کمزور رہا۔ البتہ مدرسوں کی تعلیم میں جامعہ نے نئی راہیں نکالیں اور **مدرسہ ابتدائی اور استادوں کے مدرسے** سے تعلیم کے میدان میں ایسے تجربے کیے جو اس دور کے سرکاری و نیم سرکاری مدرسوں کے خواب و خیال میں بھی نہ تھے۔ لہٰذا جامعہ کی تعلیمی شناخت خصوصیت کے ساتھ انہی اداروں سے ہوتی ہے لیکن تعلیمی شناخت بیان کرنے سے قبل اس بات کی وضاحت کی ضرورت ہے کہ شناخت سے کیا مراد ہے۔

اردو میں پہچان، تشخص اور شناخت تینوں الفاظ تقریباً ہم معنی ہیں یعنی دوسروں سے مختلف اور منفرد۔ جہاں تک لفظ شناخت کے عام استعمال کا تعلق ہے، اس میں عام طور پر اختلاف کی گنجائش نہیں ہے لیکن جب یہ مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ شناخت کن بنیادوں پر کی جائے تو اختلاف کی صورت پیدا ہو جاتی ہے کیوں کہ اس کے لیے موضوعی اور معروضی دونوں پیمانے استعمال کیے جاتے ہیں۔ **ادب اور فنونِ لطیفہ** میں عام طور پر موضوعی اور **سائنسی علوم** میں معروضی پیمانوں کو استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک مشہور ماہرِ سماجیات **درخائم** نے شناخت کو سوشل فیکٹ کہا ہے جیسے جات پات، قوم اور نسل وغیرہ۔ چوں کہ انھیں مخصوص ناموں سے جانا جاتا ہے اس لیے ان کی شناخت بھی انہی ناموں سے ہوتی ہے۔ اس مضمون میں لفظ شناخت کو محض انفرادیت اور امتیاز کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ یہاں یہ اعتراف بھی بے محل نہ ہوگا کہ اس میں احساس اور تاثر کو بڑا دخل ہے اور کسی حد تک زبانی

روایت کو بھی۔

اس مضمون میں اس پہلو کو بھی اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ جامعہ کے کردار کی انفرادیت اور شناخت پیدا کرنے میں اردو کا کیا منصب رہا ہے اور اس کے حوالے سے بھی جامعہ کی کیا شناخت بنتی ہے۔ کیا یہ رول اب بھی جاری ہے یا وقت کے دھندلکوں میں شناخت گم ہو چکی ہے۔

اس تناظر میں جامعہ کی امتیازی خصوصیات درجِ ذیل نظر آتی ہیں۔

کام کی اہمیت، منصوبی طریقِ تدریس، تفویضی طریقِ تدریس امتحان اور جانچ کے طریقوں میں جدّت، تربیتِ اساتذہ کے جدید ترین پہلو، تعلیمِ بالغان، تعلیمی ادب اور بالغوں کا ادب۔

یہ تمام وہ خصوصیات ہیں جن کا متفرق طور پر تقریر و تحریر میں ذکر ہوتا رہا ہے۔

جامعہ کی تعلیمی شناخت کا سلسلہ دراصل اس تصور سے شروع ہوتا ہے کہ جامعہ میں کتاب کے مدرسوں کو کام کے مدرسوں میں تبدیل کرنا ہے۔ گویا کام کو تعلیمی دستور میں ایک کلیدی حیثیت دی گئی ہے۔ ذاکر صاحب کے "تعلیمی خطبات" کا مطالعہ کرنے سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ ذاکر صاحب نے کام کو ایک نیا منصب عطا کیا ہے اور کام کے سلسلے میں بتایا کہ کام چاہے ہاتھ کا ہو یا دماغ کا، کام چاہے ہنرمندی کا ہو یا تخلیقی، اس سے فائدہ اسی وقت ہوتا ہے جب اس کا پورا پورا حق ادا کیا جائے۔ کام کا حق ادا کرنے کی ذاکر صاحب نے چار منزلیں بتائی ہیں۔

- **پہلی منزل ذہن کی تیاری ہے یعنی ذہن میں کام کا نقشہ اور خاکہ بنانا۔**
- **دوسری منزل بھی ذہنی ہے یعنی اس کو پورا کرنے کے لیے سوچنا، گویا صحیح راستے کا انتخاب۔**
- **تیسرا قدم ہوتا ہے ان چُنے ہوئے راستوں یا ذریعوں سے کام کو کر ڈالنا۔**
- **چوتھی منزل ہے کیے ہوئے کام کو جانچنا اور پرکھنا۔**

کام سے متعلق ذاکر صاحب کا ایک اور قول: "کام عبادت ہے" جامعہ کے تعلیمی

اداروں میں جگہ جگہ نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ کام کے اس وقیع اور دل کش منصب سے متاثر ہوکر از روئے عقیدت بعض حضرات نے رومانوی بصیرت سے کام لیا اور **فنونِ لطیفہ** کو بھی انہی کسوٹیوں پر پرکھنے لگے جو **دست کاری یا حرفے** سے متعلق تجویز کی گئی تھیں۔ اس پہلو سے قطع نظر حقیقت یہ ہے کہ کام کے اصول نے فکری اور عملی سطح پر **جامعہ** کو بہت متاثر کیا، اس کو قبولیت حاصل ہوئی اور **جامعہ** کے مدارس میں اس کو کلیدی حیثیت ملی۔

ذاکر صاحب کے علاوہ **مجیب صاحب** نے بھی کام کے فکری اور عملی پہلوؤں کو اجاگر کیا، کام کی قدر و منزلت کو نمایاں کیا۔ اس کی نوک پلک سنواری اور تہذیبی طور پر اس کو وقعت دی۔ **مجیب صاحب** نے کام میں نفاست اور نزاکت پیدا کرنے پر زور دیا اور فنی کاوشوں کو انفرادی شخصیت سے ہم آہنگ کیا۔

سلامت صاحب نے بھی کام کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس کے عملی پہلوؤں کی توسیع کی۔ کام میں نظم و ضبط پیدا کیا۔ ایک بڑے نفسیاتی اصول '**کر کے سیکھنے**' کی روشنی میں کام کے ذریعے علم حاصل کرنے پر زور دیا اور اس پہلو پر بھی زور دیا کہ ہاتھ کے کام سے سماجی زندگی میں حسن اور خوبی پیدا ہوتی ہے۔

دراصل کام کا تصور **جامعہ** کے مدرسوں اور دیگر اداروں میں جاری و ساری نظر آتا ہے۔

آیئے اب ذرا ان اداروں پر ایک نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ وہ کونسی امتیازی خصوصیات ہیں جن کی بنا پر **جامعہ** کی انفرادیت قائم ہوتی ہے اور **جامعہ** کے تعلیمی کام کی شناخت کی جاتی ہے۔...... **مدرسہ ابتدائی** .... **جامعہ** کی تعلیمی شناخت میں ابتدائی مدرسے کا بڑا رول رہا ہے اس لیے کہ اس مدرسے نے **جامعہ** کے **منصوبی طریقۂ تدریس** کو خوش اسلوبی کے ساتھ رواج دیا اور کام کی تمام شرطیں بھی پوری کیں۔ منصوبے کی کامیابی کا بہت کچھ انحصار منصوبے کے انتخاب پر ہوتا ہے۔ **مدرسہ ابتدائی** میں ایسے منصوبے منتخب کیے گئے جو بچوں کی زندگی کے لیے بامعنی تھے اور جن میں تعلیم کے پورے امکانات موجود تھے۔ ان منصوبوں میں تنوع نظر آتا ہے۔ مزید یہ کہ یہ منصوبے بچوں کی زندگی سے قریبی تعلق رکھتے تھے اسی لیے ان منصوبوں میں بچوں کی دلچسپی قائم رہی اور اکتاہٹ نہیں پیدا ہوئی۔ ان منصوبوں میں مل جل کر کام کرنے کی تحریک تھی، بچوں کی نشوونما کا سامان تھا اور درس و تدریس اور زندگی میں ایک خوش گوار تال میل تھا۔

منصوبی طریقے سے بچوں کی تعلیم اوران کے ذہنی نشو ونما کی تربیت جس انداز سے ہوتی ہے اس کا بخوبی اندازہ ان منصوبوں کے مطالعہ سے ہوتا ہے۔مثال کے طور پر **ھندوستان پروجیکٹ** اور **میلاد النبیؐ پروجیکٹ** جو **مدرسہ ابتدائی** نے چلائے،ان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح ان کے ذریعہ پورے نصاب کا احاطہ کیا گیا۔کتابوں اور رسالوں کا مطالعہ کیا گیا، چارٹ اور نقشے بنائے گئے، مضامین لکھوائے گئے، تصویریں جمع کرائی گئیں اور تصویروں کے البم تیار کرائے گئے۔سارے کام ہوگئے تو پورے کام کو پرکھا گیا۔طلبہ کے ذوق وشوق اور محنت کی ستائش کی گئی اوران کی محنت کوقدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔بحیثیت مجموعی **منصوبی طریقۂ تدریس** کوآزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد بھی بہتر سراہا گیا اوراس طریقۂ تدریس نے پورے ملک میں شہرت پائی۔

منصوبی طریقۂ تدریس کوبعض ہم نصابی مشاغل میں بھی استعمال کیا گیا جیسے **بچوں کی دکان**،**بچوں کا بینك**، **بچوں کا خوانچہ**،ان مشاغل کے ذریعہ تعلیم اورزندگی کواس طرح ہم آہنگ کیا گیا کہ کتاب اور لفظ کے جبر سے طالبِ علم کورہائی ملی اور تعلیم اور زندگی میں ایک خوش گوار تعمیری رشتہ قائم ہوا۔

آزادی کے بعد جب ملک میں امن وامان قائم ہوا، اور تدریس وتعلم کے لیے حالات سازگار ہوئے تو **مدرسہ ابتدائی** کے کاموں میں کچھ نئے مشاغل کا اضافہ ہوا جیسے **بچوں کی حکومت** ، **ایك دن کا مدرسہ**،**بچوں کی حکومت** کے ذریعے بچوں کوجمہوریت کی عملی تعلیم دی جاتی ہے اورانتخابی طریقوں سے روشناس کرایا جاتا ہے۔ **ایك دن کا مدرسہ** ،**بچوں کی حکومت** کے زیرِانتظام کام کیا جاتا ہے۔پورا **مدرسہ** بچوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔وہی **ہیڈ ماسٹر**، وہی **استاد** اور دوسرے **کارکن** بنتے ہیں،**مدرسہ** کمرہ جماعت اور بورڈنگ ہاؤس خوب سجائے جاتے ہیں۔ان کا معائنہ ہوتا ہے۔رات میں کسی کھلی جگہ یہ لوگ جمع ہوتے ہیں اور **کیمپ فائر** کی نقلیں پیش کی جاتی ہیں۔

کھلی ھوا کا مدرسہ بھی ایک مفید اور دلچسپ پروگرام ہوتا تھا۔قرب وجوار میں کوئی ایسی جگہ تلاش کی جاتی تھی جہاں آزادی کے ساتھ کھلی ہوا کے **مدرسہ** کا انتظام ہوسکے۔اس موقع پر گردوپیش کی زندگی کا مشاہدہ اورمناظرِ فطرت سے لطف اندوز کرایا جاتا ہے اوران سب پہلوؤں کوتعلیم کا

ذریعہ بنایا جاتا ہے۔

مدرسہ ابتدائی کی امتیازی نوعیت کا ایک اور پہلو یہ رہا کہ یہاں ۱۳؍اپریل کو ہر سال **قومی ہفتہ** منایا جاتا تھا۔ دراصل ہماری آزادی کی جدوجہد کی تاریخ **جلیاں والا باغ** کے بے دریغ قتل سے شروع ہوتی ہے۔ اسی کی یاد میں یہاں **قومی ہفتے** کا انعقاد کیا جاتا تھا۔ اس دن **ابتدائی مدرسہ** کے تمام طلبہ واساتذہ اور کارکن خود اپنے ہاتھ سے کام کرتے تھے۔ **بہشتی**، **خدمت گار**، **صفائی کرمچاری** اور **باورچی** سب کو چھٹی دے دی جاتی تھی اور ان کے فرائض **جامعہ** کے طلبہ اور اساتذہ انجام دیتے تھے۔

مدرسہ ابتدائی کے جن تعلیمی مشاغل کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اور جن سے **جامعہ** کے تعلیمی کردار کی شناخت منسوب کی گئی ہے، وہ رفتہ رفتہ ختم ہوتے گئے۔ ان کا سلسلہ اس وقت تک نظر آتا ہے جب تک **تعلیمی میلہ** ہوتا رہا لیکن جب سے تعلیمی میلے کی رسم ماند پڑی یہ تمام کام بند ہو گئے سوائے **بچوں کی حکومت** کے۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ **بچوں کی حکومت** کا سلسلہ اب بھی جاری ہے۔

مدرسہ ثانوی

مدرسہ ابتدائی کی طرح **مدرسہ ثانوی** نے بھی بعض تعلیمی تجربے کیے لیکن اس کا دائرۂ عمل بہت محدود تھا۔ **مدرسہ ثانوی** کے نصابی و ہم نصابی مشاغل میں اتنا تنوع نہیں تھا جتنا **مدرسہ ابتدائی** میں تھا۔ تاہم یہاں بھی بعض ایسے کام ہوتے تھے جن سے **جامعہ** کی انفرادیت قائم ہوتی تھی لیکن ایک بڑی دقت یہ تھی کہ **جامعہ** کی سندیں حکومت نے تسلیم نہیں کی تھیں اس لیے آٹھویں جماعت کے بعد اکثر والدین اپنے بچوں کو **ثانوی مدرسہ** سے اٹھا لیتے تھے اور کسی دوسرے منظور شدہ اسکول میں داخلہ کرا دیتے تھے تاکہ **میٹرک** کا امتحان پاس کر کے کسی دوسری **یونیورسٹی** میں داخلہ لے سکیں۔ ۱۹۴۵ء میں **علی گڑھ یونیورسٹی** نے جب **جامعہ جونیئر** کے امتحان کو **میٹرک** کے مساوی تسلیم کر لیا تو **ثانوی مدرسہ** کی نویں اور دسویں جماعتوں میں طلبہ کی تعداد بڑھنے لگی اور اس کی ترقی کی صورت نکل آئی۔

منصوبی طریقِ تدریس کو **ثانوی مدرسے** نے بھی اپنایا اور کئی پروجیکٹ چلائے۔ خاص طور سے بڑی تیاری کے ساتھ **شبلی پروجیکٹ** چلایا۔ اس پروجیکٹ کے ذریعے ایک **مؤرخ، ادیب** اور **شاعر** کی یاد تازہ کی۔ ان کی شخصیت اور کارناموں کا مطالعہ کیا اور اس پروجیکٹ کے تعلیمی امکانات سے پورا پورا استفادہ کیا۔

۱۹۴۲ء سے **ثانوی مدرسے** میں **تفویضی تدریس** کا تجربہ شروع ہوا۔ **تفویضی طریقۂ تدریس** سے مراد ہے کہ پورے نصاب کو دس مہینوں میں، مہینے کو ہفتوں میں اور ہفتے کو دنوں میں تقسیم کر دیا جائے تا کہ طلبہ استاد کی نگرانی میں اپنی استعداد کے مطابق مطالعے کے لیے مواد تلاش کر سکیں۔ یہ دراصل **انفرادی طریقۂ تدریس** ہے جس کے تحت اس بات کی گنجائش ہوتی ہے کہ ہر طالب علم اپنی تفویض ختم کرنے کے بعد اگلی تفویض پر کام شروع کر دے۔

مدرسہ ثانوی میں بھی ذریعۂ تعلیم **اردو** ہے لیکن پورے طور سے نہیں۔ آزادی کے بعد **مدرسہ ثانوی** میں بھی ترقی ہوئی لیکن محدود پیمانے پر۔ البتہ اس کے ڈھانچے میں کئی تبدیلیاں ہوئیں اور **مدرسہ ثانوی** پہلے ہائر سکنڈری اور بعد میں **سینئر سکنڈری** بنا۔ ترقی کی ہر منزل پر اس کا ذریعۂ تعلیم بھی **اردو** رہا۔

استادوں کا مدرسہ

جامعہ کی تعلیمی شناخت میں **استادوں کے مدرسے** کا بڑا حصہ ہے۔ **استادوں کا مدرسہ**، استادوں کی تعلیم و تربیت کا ایک واحد ادارہ ہے جہاں **ڈپلوما آف بیسک ٹریننگ** سے لے کر **بی ایڈ، بی ایڈ** (اسپیشل) **ایم ایڈ، ایم فل** اور **پی ایچ ڈی** کی تعلیم کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ اس طرح یہ ادارہ استادوں کی تربیت کا ایک جامع ادارہ بنتا چلا گیا۔

استادوں کا مدرسہ ۱۹۳۸ء میں باقاعدہ شروع ہوا۔ اس کی تخصیص یہ تھی کہ یہاں **بنیادی قومی تعلیم** کے لیے اساتذہ تیار کیے جاتے تھے۔ بعد میں عام اساتذہ کی تیاری کا کام بھی شروع ہوا۔ **سعید انصاری صاحب** اس کے پہلے پرنسپل تھے۔ ۱۹۴۹ء میں **ڈاکٹر سلامت اللہ صاحب** جب **امریکہ** سے اپنی تعلیم مکمل کر کے **جامعہ** واپس آئے تو **استادوں کے مدرسے** میں ایک نئے

باب کا اضافہ ہوا۔ کچھ دن بعد **استادوں کے مدرسے** کی ذمے داری **سلامت صاحب** کو سونپ دی گئی۔ انھوں نے **استادوں کے مدرسے** میں ایک نئی روح پھونک دی۔ **سلامت صاحب** نے ۱۹۷۶ء تک **استادوں کے مدرسے** کی رہنمائی کی۔ **سلامت صاحب** کے آخری دور میں **جامعہ** کے تعلیمی ڈھانچے میں تبدیلی شروع ہوئی اور **جامعہ** کے دیگر اداروں کی طرح یہاں بھی فیکلٹی نظائم قائم ہوا۔ اگر یہ فیکلٹی، تعلیم کے واحد شعبے پر مشتمل ہوتی تو بہت اچھا ہوتا لیکن مختلف شعبوں میں تقسیم ہوکر اس کے کام کی سالمیت ختم ہوگئی اور اس کی کارکردگی بڑی حد تک متاثر ہوئی۔

سلامت صاحب نے **استادوں کے مدرسے** میں اساتذہ کی تعلیم و تربیت کی ایک ایسی ڈگر ڈالی جو مختلف اعتبار سے ناقابلِ فراموش ہے۔ **استادوں کا مدرسہ** یہ نام بذاتِ خود ایک نئی سوچ اور فکر کا نتیجہ ہے۔

استادوں کے مدرسے میں اساتذہ کی تعلیم و تربیت کا نصاب تین حصوں پر مشتمل ہوا کرتا ہے۔ **نظری، مشقی اور عملی**۔ ہم نصابی مشاغل بھی نصاب میں شامل رہے ہیں۔ نظری تعلیم میں **استادوں کے مدرسے** کی انفرادیت اس اعتبار سے قائم ہوئی کہ ملک میں پہلی بار کسی تربیتی ادارے نے تعلیم کی سماجی معنویت کو تسلیم کیا اور تعلیم کی سماجی اساس کے نام سے **بی ایڈ** کی سطح پر ایک پرچہ نصاب میں شامل کیا۔ اس طرح **ایم ایڈ** کی سطح پر تعلیمی منصوبہ بندی نصاب میں شامل کرکے ایک نیا تجربہ ہوا۔ **نظری تعلیم** کے ساتھ **مشقی اور عملی کام** میں توسیع اور تنظیمِ نو ہوئی۔ مشقی تدریس میں جدید تعلیمی تقاضوں کے تحت بعض نئے تجربے ہوئے اور اصلاحی قدم اٹھائے گئے۔ **دست کاری، حرفے کی تعلیم، ہم نصابی مشاغل اور کمیونٹی ورک** کو عملی کام کے نصاب میں شامل کرکے ایک نئے تجربے کا آغاز ہوا۔ ان کاموں کی وجہ سے **استادوں کے مدرسے** کو وقار اور اعتبار حاصل ہوا۔ کام کا وہ تصور جو مدرسوں میں امتیازی خصوصیت کا حامل تھا یہاں بھی پیشِ نظر رکھا گیا۔

استادوں کے مدرسے کی ایک اور خصوصیت یہ رہی ہے کہ سرکاری طور پر **بنیادی قومی تعلیم** کے خاتمے کے بعد بھی یہاں **بنیادی قومی تعلیم** کے ان اصولوں کو تعلیم و تربیت میں برتا گیا جو تعلیمی اعتبار سے مفید تھے۔ **مربوط طریقۂ تعلیم** کو جدید نفسیاتی کسوٹیوں پر پرکھا گیا اور **دست کاری اور حرفے** کو مرکزِ تعلیم بنانے کے ساتھ ساتھ سماجی اور قدرتی ماحول کو بھی ربط کا مرکز بنایا گیا۔ اس

طرح درس وتدریس کے میکانکی طریقوں کو ترک کر کے جدید طریقے اپنائے گئے۔

ریسرچ اور تحقیق کے کام میں بھی جدت پیدا کی گئی اور ملکی تقاضوں کے پیشِ نظر دیہی تعلیم کے میدان میں تحقیق کے لیے ایک چھوٹا سا ادارہ **انسٹی ٹیوٹ آف رورل ایجوکیشنل ریسرچ** کے نام سے قائم کیا گیا۔ **سلامت صاحب** اس کے روحِ رواں تھے۔ **سلامت صاحب** کی پہل سے طریقۂ امتحان میں اصلاحات کی گئیں اور جانچ کے نئے طریقے اپنائے گئے۔ **اندازۂ قدر** کے تصور کو عملی شکل دی گئی۔ یہ دونوں موضوعات **سلامت صاحب** کے خصوصی مطالعے کے موضوعات ہیں۔ **مشقی تعلیم اور عملی کام** کے لیے بیرونی امتحان کو ختم کر کے اندرونی جانچ کا طریقہ اپنایا گیا۔ اس میں جو تصور کارفرما تھا وہ یہ کہ جو پڑھائے وہی جانچے۔ جانچ کے موضوعی طریقوں کی جگہ معروضی طور طریقے اپنائے گئے۔ **مشقی تدریس** میں معروضی بنیادوں پر گریڈنگ کا نظام رائج کیا گیا۔ اس طرح **استادوں کا مدرسہ** اپنی جدت طرازی اور نئے تعلیمی تجربوں کے باعث ساتویں اور آٹھویں دہے تک ہندوستان کے چند بہترین اداروں میں شمار ہونے لگا۔

اساتذہ کی ٹریننگ کے ساتھ ساتھ آرٹ کے اساتذہ کی ٹریننگ بھی **جامعہ** کا ایک بے مثال کام ہے۔ اس کام کے لیے ۱۹۵۲ء میں **انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس ایجوکیشن** کے نام سے ایک ادارہ قائم ہوا۔ **ابوالکلام صاحب** اس کے روحِ رواں تھے۔ جدت طرازی ان کا شیوہ تھا۔ وہ دُھن کے پکے تھے اور ارادے کے مضبوط۔ نئی ڈگر کو ڈھونڈ نا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ انھوں نے **جامعہ** میں **آرٹس ایجوکیشن** کو **جامعہ** کے تعلیمی مزاج سے ہم آہنگ کیا۔

اساتذہ کی تیاری کے ساتھ ساتھ یہاں کے اساتذہ میں سے بعض نے ادب کی تیاری میں پہل کی اور تعلیم سے متعلق بیش تر موضوعات پر کتابیں لکھیں۔ خاص طور سے **اردو ذریعۂ تعلیم** کے لیے نفسیات، اصولِ تعلیم، اقبال مضامین **مدرسہ** اور **تدریس وتعلیم** پر کتابیں لکھیں اور **اردو** میں مواد فراہم کر کے **اردو** کی بڑی خدمت کی۔ **اردو ذریعۂ تعلیم** کے فروغ میں ماہنامہ: **نئی نصابی تعلیم**، کا بھی بڑا حصہ ہے۔ **ہندوستانی تعلیمی سنگھ** کی جانب سے بنیادی تعلیم کے فروغ کے لیے استادوں کے **مدرسہ** میں یہ ماہنامہ نکلنا شروع ہوا۔ اس کی ادارت کے فرائض بھی **سلامت صاحب** نے انجام دیے اور چند برس تک بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ اس رسالے کو چلایا۔

اردو ذریعۂ تعلیم کے حوالے سے بھی استادوں کے مدرسے کی ایک اور امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں نہ صرف اردو اساتذہ کی ٹریننگ کا مخصوص انتظام ہے بلکہ اردو میڈیم کے لیے استادوں کی تیاری بھی اس کے پروگرام کا ایک اہم حصہ ہے چنانچہ اردو میڈیم کے امیدواروں کے داخلے کے وقت پانچ فی صد نمبروں کی رعایت بھی دی جاتی ہے۔ بی ایڈ کی سطح پر اردو ذریعۂ تعلیم کے طالب علموں کے علاحدہ سیکشن ہیں جن کا ذریعۂ تعلیم اردو ہے، اردو میں لکچر دیے جاتے ہیں۔ اردو میں اسائنمنٹ لکھوائے جاتے ہیں اور اردو میں امتحان کی بھی اجازت ہوتی ہے۔

درج بالا خصوصیات کی وجہ سے استادوں کا مدرسہ، ہندوستان کے چند بہترین اداروں میں شمار ہوتا ہے اور جامعہ کی تعلیمی شناخت قائم کرنے میں اس کا ایک اہم رول رہا ہے۔

ادارہ تعلیم وترقی

آج سے تقریباً پچاس سال قبل تعلیمِ بالغان کا کام جامعہ میں حافظ فیاض صاحب کی نگرانی میں شروع ہوا، اور اس کا نام شعبۂ تعلیمِ بالغان رکھا گیا۔ اس شعبے کے تحت رات کے وقت بالغوں کو پڑھنا لکھنا سکھانے کا کام شروع ہوا، لیکن تعلیمِ بالغان کا کام اطمینان بخش نہیں تھا بلکہ کسی قدر منتشر اور غیر منظم حال میں تھا۔ بعد میں اس کا نام ادارہ تعلیم وترقی پڑا، اور تعلیمِ بالغان کا کام شفیق صاحب کے سپرد ہوا۔ شفیق صاحب نے نئے سرے سے اس ادارے کی تنظیم کی اور تعلیمِ بالغان کے کام میں ایک نئی طرح ڈالی۔ انھوں نے تعلیمِ بالغان کے کام کو پیشوں سے منسلک کر دیا اور ان کے درمیان خواندگی کی مہم چلائی۔ خواندگی کی مہم کے علاوہ انھوں نے کتابیں اور پوسٹر بھی تیار کرانے شروع کیے لیکن وسائل کی تنگی کے باعث کتابوں کی تعداد میں اضافہ نہ ہو سکا۔

۱۹۴۷ء کے فسادات کے دوران جب جامعہ کے تمام کام موقوف ہو گئے تو یہ کام بھی رک گیا۔ فسادات کا طوفان جب ختم ہوا تو جامعہ کے سامنے ایک نیا چیلنج تھا۔ جامعہ نے اس چیلنج کو قبول کیا اور پرانی دلّی کے ان علاقوں میں جہاں مسلمان کچھ باقی رہ گئے تھے۔ نئے سرے سے تعلیمِ بالغان کا کام شروع کیا۔ ان میں مٹیامحل، بیری والا باغ اور قصاب پورہ کے مرکز خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان مراکز میں بالک ماتا سنٹر، بچوں کے کلب اور بچوں

کی برادری کے ذریعے **ادارہ تعلیم وترقی** نے نہ صرف مسلمانوں میں اعتماد پیدا کیا بلکہ قومی ایکتا کے لیے بھی ایک سازگار ماحول کی داغ بیل ڈالی۔ **جامعہ نگر** منتقل ہونے کے بعد **ادارہ تعلیم وترقی** نے **تعلیمِ بالغان** کا کام نئے سرے سے شروع کیا۔ بالغوں کے لیے **اردو** میں ایسے موضوعات پر کتابیں لکھوائیں جو دیہی زندگی سے تعلق رکھتی تھیں۔ بہرحال، ان کا فوکس زراعت، مویشیوں کی افزائشِ نسل اور پنچایت پر تھا۔ **مکتبہ جامعہ** نے ان کتابوں کو سلیقے سے شائع کیا۔ ان کتابوں کو جانچا اور پرکھا بھی گیا۔ اپنے موضوعات، زبان وبیان اور تنوع کے باعث ان کتابوں کو بہت پسند کیا گیا اور ان کی اتنی شہرت ہوئی کہ حکومت نے بھی انھیں سراہا اور پھر یہ کتابیں پنچایتوں کے ذریعے ملک کے گوشے گوشے میں پہنچ گئیں۔

ادارہ تعلیم وترقی کے زیرِاہتمام **اردو** میں ایک ماہنامہ: رسالہ تعلیم وترقی، نکلتا تھا جو اس اعتبار سے اہم تھا کہ **تعلیمِ بالغان** اور جاری تعلیم سے متعلق اس میں **معلومات** فراہم کی جاتی تھیں۔

ادارہ تعلیم وترقی کی ایک اور خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس شعبے نے آس پاس کی بستیوں میں بھی رسائی حاصل کرلی تھی۔ اس کے پیچھے یہ خیال کارفرما تھا کہ اس پروگرام کے ذریعہ سماج کی رہنمائی کی جائے۔ جو اَن پڑھ ہیں انھیں خواندہ بنایا جائے، جو خواندہ ہیں انھیں ان کی زندگی اور پیشوں سے متعلق مفید معلومات فراہم کی جائیں اور انھیں کوئی ایسا ہنر بھی سکھایا جائے جس سے ان کی آمدنی میں اضافہ ہوسکے۔ تعلیم وترقی کے اس پروگرام کی اتنی شہرت ہوئی کہ **جمنا پار** کے بعض لوگوں نے فرمائش کی کہ ان کے گاؤں میں بھی ایسے مراکز قائم کیے جائیں جن میں ناخواندہ لوگوں کو خواندہ بنانے اور کوئی مفید دست کاری سکھانے کا انتظام ہو، لیکن دقت یہ تھی کہ گاؤں اور **جامعہ** کے درمیان **جمنا** حائل تھی۔ لہٰذا **جمنا** پر ایک عارضی پل بنانے کا خیال آیا۔ اس سلسلے میں **جامعہ** کے ایک **جرمن آرکیٹیکٹ ہائنس صاحب** سے رجوع کیا گیا۔ انھوں نے **جمنا پار** ایک عارضی پل بنواکر اس مشکل کو حل کردیا۔

اس اعتبار سے **جامعہ** ایک واحد ادارہ تھا جہاں **اردو** میں اَن پڑھ بالغوں کو خواندہ بنانے کا پروگرام شروع ہوا۔ بالغوں کی دلچسپی کو ملحوظ رکھتے ہوئے دینی، سماجی، سیاسی اور ہلکے پھلکے ادبی

موضوعات پر کتابیں اور پمفلٹ بھی لکھوائے گئے اور پوسٹر بھی تیار کرائے گئے تاکہ نوبالغوں اور بالغوں میں زندگی کے مسائل سے آگہی پیدا کی جاسکے اوران میں پڑھنے اور پڑھانے کا شوق بھی پیدا کرایا جاسکے۔ **جامعہ** کے پاس ان کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ تھا۔ **ہندوستان** کے گوشے گوشے میں ان کتابوں کی اشاعت ہوئی اور یہ نہایت مقبول ہوئیں لیکن حکومت کی بے اعتنائی سے مالی وسائل بند ہوگئے۔تھوڑے عرصے تک **تو ادارہ تعلیم وترقی** انتشار کی کیفیت میں مبتلا رہا لیکن حسبِ سابق **جامعہ** نے پھر حوصلہ کیا، اور حکومت کے مشورے سے ایک نیا منصوبہ بنایا۔حکومت نے اس منصوبے کو منظوری دے دی۔لہٰذا، **۱۹۵۵ء** میں **ریسرچ سینٹر اور پروڈکشن سنٹر** کے نام سے **جامعہ** میں ایک نیا ادارہ قائم ہوا۔اس ادارے نے مابعد خواندگی کے ادب کو جانچا پرکھا اور اس کا تفصیلی جائزہ لیا تاکہ یہ اندازہ ہوسکے کہ کس حد تک اس کے ذریعے بالغوں میں مطالعے کا شوق پیدا کرایا جاسکتا ہے۔

اردو ذریعۂ تعلیم کی موجودہ صورتِ حال

جامعہ کے مدارس میں **اردو** کے ذریعے تمام مضامین پڑھائے جاتے تھے۔ان مضامین کو پڑھانے کے لیے **اردو** میں کتابیں بھی دستیاب تھیں۔ درس وتدریس کا سارا کام چاہے وہ **حرفے** سے متعلق ہو، چاہے عملی مضامین سے، سب **اردو** کے ذریعے ہی انجام پاتے تھے۔ **اردو** طلبہ کی مادری زبان اور ذریعۂ تعلیم دونوں تھی یعنی **جامعہ** کے مدارس میں ایک مضمون کی حیثیت سے ہر سطح پر پڑھائی جاتی تھی اور ہر منزل پر اس کا ذریعۂ تعلیم **اردو** تھا۔نصابی مضامین کے علاوہ ہم نصابی مشاغل میں بھی **اردو** کا چلن تھا۔جلسوں کا اہتمام **اردو** میں ہوتا تھا۔تقاریر یا بحث مباحثے **اردو** میں منعقد ہوتے تھے۔نظام الاوقات **اردو** میں ہوتا تھا۔اعلانات **اردو** میں ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ دفتری حساب کتاب بھی **اردو** میں رکھے جاتے تھے۔

مدارس کے علاوہ **جامعہ** کے مرکزی دفاتر کی زبان بھی **اردو** تھی، مجالس کے لیے ایجنڈا **اردو** میں جاری ہوتا تھا، روداد **اردو** میں لکھی جاتی تھی، دفاتر کے درمیان باہمی خط کتابت **اردو** میں ہوتی تھی۔شکایت وحکایت **اردو** میں بیان ہوتی تھی۔غرض **اردو جامعہ** کی تہذیب تھی۔

۱۹۹۰ء کے بعد **جامعہ** کے حالات میں کچھ ایسی تبدیلیاں آنی شروع ہوگئیں کہ **اردو** کا

چلن پہلے توجامعہ کے دفاتر اور بعد میں مدارس سے بالخصوص ثانوی مدرسے سے ختم ہونے لگا۔ کچھ دن بعد ثانوی اور اعلیٰ ثانوی سطح پر اردو کو اختیاری مضمون بنادیا گیا اور اردو ذریعۂ تعلیم کی جگہ انگریزی ذریعۂ تعلیم اختیار کرلیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اردو کے حوالے سے مدارس کی جو تخصیص تھی وہ ختم ہونے لگی۔ آج سے تقریباً پچاس برس پہلے خواجہ غلام السدین صاحب نے جامعہ کی تعلیمی صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہوئے ایک جلسے میں فرمایا تھا کہ جامعہ کا اصل سرمایہ تو ختم ہو چکا ہے اب تو محض ماضی کے سود پر چل رہی ہے۔

جامعہ کی انفرادیت اور شناخت جن کاموں سے تھی انھیں بیان کردیا گیا ہے لیکن افسوس کا مقام ہے کہ اب جامعہ کی کوئی قابلِ ذکر شناخت نہیں رہی۔ اب تو دوسری یونیورسٹیوں کی طرح جامعہ بھی ایک یونیورسٹی ہے جہاں سے فارغ ہونے کے بعد نوجوانوں کو نوکریاں مل جاتی ہیں۔ یقیناً یہ بھی ایک بڑی قومی خدمت ہے۔ بعض شعبوں کے قیام سے جامعہ کو اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک شہرت بھی ملی لیکن وہ عزت نہ ملی جس کا ادارہ مستحق تھا۔

◆

جامعہ ملیہ اسلامیہ
کے
قدیم شعبے

غلام حیدر

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے حالات کے سرسری مطالعے سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس کے بانیوں کے ذہنوں میں اس ادارے کا تصور ایک عام نہج کے تعلیمی ادارے جیسا نہیں تھا، جس میں خالص مدرسے، کالج یا روایتی تعلیم کے مختلف شعبے مصروفِ کار رہوں اور ہر سال کچھ ڈگریاں، ڈپلوما سرٹیفکیٹ وغیرہ تقسیم کریں اور ان کے اعداد و شمار کی بنیاد پر اس کی ترقی کو ناپا جاتا رہے۔ جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا گیا کہ یہ ادارہ ایک سیاسی ہیجان کی پیداوار ضرور تھا، مگر بہت جلدی اسے ایک ترقی پسند، آزاد، قومی تعلیم و تربیت کی منفرد نہج کا ادارہ بنانے کی کوشش شروع کر دی گئی تھی، جس کی جھلک اس کے ہر ہر قدم اور تحریک میں نظر آ جاتی ہے۔ یہ ادارہ تعلیم کے ساتھ ذہن سازی، کردار سازی اور ایک گہرے قومی شعور کی نشو و نما کا ایک منصوبہ پیشِ نگاہ رکھ کر آگے بڑھایا جا رہا تھا۔ جامعہ کے شعبوں کی فہرست پر ایک نگاہ ڈالنے سے ہی اس ادارے کی اس خصوصیت کا پتا چل ہو جاتا ہے

کہ جامعہ والوں کے ذہنوں میں اس ہمہ جہت منصوبے کا تصور یا ہدف اتنا واضح تھا کہ اسے کم تعلیم یافتہ اور کم شعور سماج کی مخالفتوں، عام طور پر سرکاری بے رخی بلکہ معاندانہ رویے اور ذرائع کے فقدان کے باوجود ہر قدم پر پیشِ نگاہ رکھا جاتا تھا۔

پچھلی صدی کی دوسری ، تیسری اور چوتھی دہائی میں خالص دینی مدارس کو چھوڑ کر ہندوستان میں تعلیم ایک مخصوص انداز میں یا تو سرکاری اسکولوں اور کالجوں کے ذریعے دی جاتی تھی، جس میں کسی اختراع، تجربے اور نئے پن کی گنجائش تھی ہی نہیں، یا **اینگلو انڈین اور نوابوں راجاؤں** کے لڑکوں کے لیے خالص **انگریزی اسکول** تھے جن کا ہندوستانی سماج سے صرف اتنا ہی رشتہ تھا کہ وہ دھرہ دون ،نینی تال یا گوالیار وغیرہ میں واقع تھے۔ ان حالات میں کوئی ایسا تعلیمی نظام قایم کرنا بعید از قیاس لگتا تھا جس میں حرفوں، دست کاریوں اور محنت مشقت کو نہ صرف تعلیمی اصولوں میں شامل کیا جائے بلکہ **مرغی خانہ، باغبانی یا کھیتی باڑی، بچوں کی دکان، ڈیری فارم اور چڑیا گھر** جیسے شعبوں کو اپنی پوری تعلیمی اور تربیتی قدر و منزلت کے ساتھ طالب عالموں کی زندگی کا حصہ بنایا گیا ہو۔ آج ان میں سے چند شعبے یا اس کی کچھ معمولی سی شاخیں ہمیں کچھ پبلک اسکولوں کے پراسپیکٹس میں نظر آنے لگی ہیں مگر ان کی حیثیت زیادہ تر ضمنی یا اسکولوں کے نظام الاوقات کو پرکشش بنانے سے زیادہ نہیں ہوتی۔

اس باب میں جامعہ قدیم میں قایم ہوئے ان مختلف شعبوں پر توجہ مرکوز رکھی جائے گی جو جامعہ کی ابتدا سے لگ بھگ ۱۹۶۲ء....یعنی جامعہ کو Deemed University Status ملنے سے پہلے جامعہ میں قایم ہوئے اور مصروفِ عمل رہے، اور یا تو دوسرے شعبوں میں ضم ہو کر انھوں نے اپنے پرانے روپ کو کسی نئے سانچے میں ڈھال لیا یا پوری طرح جامعہ کی تاریخ کا حصہ بن گئے۔ زیرِ نظر سروے کی محدودیت اور دوسرے ذرائع سے پوری طرح مستفیض نہ ہو سکنے کی وجہ سے اس فہرست کے ہر طرح سے مکمل ہونے کا دعویٰ بھی ممکن نہیں ہے نہ اس کے متن کو حرفِ آخر سمجھا جا سکتا ہے۔

بہرطور ہمارے جواب دہندہ حضرات کے انٹرویوز میں دیے ہوئے بیانات کے علاوہ **عبد الغفار مدہولی** کی دو جلدوں پر مشتمل کتاب: ایک معلم کی زندگی اور جامعہ کی کہانی ، **شمس**

الرحمٰن محسنی کی کتاب: ہندستانی مسلمانوں کی قومی تعلیمی تحریک – جامعہ ملیہ اسلامیہ اور کچھ دیگر کتب سے مدد لی گئی ہے۔ ان کے علاوہ جامعہ کے ریکارڈس میں اور ادھر ادھر بکھری ہوئی تحریروں میں جو مواد موجود ہے اس سے اس تحریر میں استفادہ نہیں کیا جاسکا ہے۔

شاخ جامعہ رنگون (برما)

ہمارے ایک جواب دہندہ جناب **مشتاق اعظمی** نے بتایا:

> میں شاید پرانی جامعہ کا سب سے پرانا آدمی ہوں ...... اب مجھے یاد آیا ...... جامعہ کی ایک شاخ برما (موجودہ میا ن مار) میں قائم ہوئی تھی۔ رنگون میں۔ وہاں گاندھی جی بھی آئے تھے، استاد یہیں سے جایا کرتے تھے۔ میں اسی کا طالب علم ہوں۔ سنہ تو قیام کا مجھے یاد نہیں ہے لیکن میں نے اسے Join کیا ہوگا ۱۹۲۷ء میں ...... میں نے وہاں پانچویں تک پڑھا۔ مجھے ایک آدھ استاد کا نام بھی یاد ہے۔ اسرائیل خاں... شمشاد خان ......

اس کے بارے میں **عبدالغفار مدھولی صاحب** نے یہ بھی بتایا ہے کہ **حامد علی خاں صاحب** جامعہ کے پرانے طالب علم اور حیاتی رکن بھی وہاں استاد رہ چکے تھے۔ افسوس ہے کہ اس سے زیادہ تفصیلات موجودہ سروے میں حاصل نہیں کی جاسکیں۔ مزید تحقیق کے بعد جامعہ کی اس شاخ کی تاریخ کا پورا خاکہ مرتب کیا جاسکتا ہے۔

جامعہ سے اسکولوں کا الحاق

شمس الرحمٰن محسنی نے لکھا ہے:

> ترکِ موالات سے پہلے مسلم رہنما علی گڑھ کالج

کو ایک ایسی مسلم یونیورسٹی بنانا چاھتے تھے
جسے ملک کے ھر حصے کے اسکولوں اور
کالجوں کے الحاق کا حق حاصل ھوتا که وہ
مسلمانوں کے لیے ایک همه گیر قومی نظام تعلیم
کی تعمیر کر سکیں۔ حکومت نے مجوزہ علی
گڑھ یو نیورسٹی کو یه حق دینے سے انکار کر
دیا تھا۔ لیکن جامعه ملیه اسلا میه نے حکومت کے
اثر سے آزاد رہ کر اس قدر مقبولیت حاصل کر
لی تھی که تھوڑے عرصے ھی میں اس سے ملک کے
کئی اسکولوں اور کالجوں نے الحاق کرا لیا اور
جامعه کو ایک ناظر المعارف (انسپکٹر آف
اسکولز) کا عھدہ قائم کرنے کی ضرورت پیش
آئی۔[1]

عبدالغفار مدہولی صاحب نے جامعه کی کھانی ، میں ضمیمہ:۳ میں ۱۷/ایسے اداروں کی فہرست دی ہے جنھوں نے جامعہ سے الحاق کیا تھا۔ ان میں چار اسکول پشاور کے، اور ایک برما کا بھی شامل ہے۔ ان اسکولوں میں زیادہ تر اسلامیہ اسکول ہیں لیکن انہی میں راشٹر سر سوتی پاٹھ شالہ (جھانسی) کا نام بھی نظر آتا ہے۔[2] یہ الحاقی نظام کب اور کیوں ختم ہوا، اور اس نظام کے تحت اسکولوں پر کس طرح نگرانی یا رہنمائی کے فرائض انجام دیے جاتے تھے، یہ تفصیلات مزید تحقیق طلب ہیں۔

مندرجہ بالا دو شعبوں کو فی الحقیقت کل جامعہ ملیہ اسلامیہ کا ہی ایک رخ مانا جانا چاہیے۔ یہ الگ شعبے نہیں تھے۔ ان کے بعد ابجدی اعتبار سے صرف جامعہ قدیم کے ان شعبوں کا مختصر تعارف پیش کیا جا رہا ہے جو کسی نہ کسی زمانے میں مصروفِ کار تھے اور ان کے بارے میں کچھ معلومات موجود ہیں۔ ان سے جامعہ کے اندازِ فکر و کارکردگی پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔

آ رایش بلدہ / امور عامّہ / میونسپلٹی

۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۰ء تک جامعہ کے زیادہ تر شعبے جامعہ نگر منتقل ہو گئے تھے۔ یہاں کسی قسم کی زندگی کی سہولتیں موجود نہیں تھیں۔ بجلی ۱۹۵۱ء کے بعد آئی، پینے کے پانی کے نل تو بہت بعد میں ساتویں یا آٹھویں دہے میں لگے۔ بہر طور، جامعہ نے اپنی زندگی کو بالکل ابتدا سے ہی سوچے سمجھے انداز میں منظّم کرنا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ یہاں ۴۴-۱۹۴۳ء سے ایک شعبہ **امورِ عامہ** (آرایش بلدہ) کا بھی قایم کیا گیا۔ اس کے سُپرد جامعہ کے علاقے میں لالٹینوں کے ذریعے روشنی، پختہ سڑکوں کی غیر موجودگی میں متعینہ راستوں کی صفائی، جامعہ کے باغات اور نرسری کا انتظام، عام سامان کی حفاظت اور جامعہ کی غیر آباد زمینوں کی دیکھ بھال وغیرہ کام شامل تھے۔ ان کاموں میں جامعہ کے طالبِ علم اور اساتذہ رضا کارانہ طور پر شامل ہوتے تھے کیونکہ ملازم رکھنے کے لیے جامعہ کے پاس مالیت موجود نہیں تھی۔ اس شعبے کے پہلے ناظم، جامعہ کے ایک حیاتی رکن، جامعہ کے ہی پرانے طالب علم اور علی گڑھ سے ساتھ آنے والے **ارشاد الحق صاحب** تھے۔ تذکرتاً، **ارشاد الحق صاحب** جامعہ کے ان خدمت گاروں میں سے تھے جو جامعہ نگر میں اپنا کوئی چھوٹا سا گھر بھی نہ بنوا سکے۔ جامعہ کے پچیس سالہ **جشنِ سیمیں** کے موقع پر اس ادارے نے بے حد قابلِ قدر کام انجام دیا جبکہ اس کے پاس تنخواہ دار اسٹاف لگ بھگ نہ ہونے برابر تھا اور صرف **فقیرا** نامی ایک مالی تھا۔ بعد میں یہ شعبہ ایک اور اہم شعبے **تعمیرات** میں ضم ہو گیا اور اس کے کام بڑھنے کے ساتھ اس کے اور کئی شعبے بن گئے۔

اس سلسلے میں ایک قابلِ ذکر بات یہ بھی ہے کہ مدرسہ ابتدائی نے، جامعہ کے پرانے طالبِ علم اور پھر استاد، **حفیظ الدین صاحب** کی رہنمائی میں ایک **میونسپلٹی پروجیکٹ** چلایا جس میں **امورِ عامہ** کے شعبے کی مدد لے کر میونسپلٹی کے تمام کاموں کو بچوں نے سیکھا اور ان کو عملی انداز میں کرنے کی مشق کی۔ ان میں پورے علاقے کی پیمائش، میونسپل حدود کا تعین، آبادی کو مختلف وارڈوں میں بانٹ کر ان کی مردم شماری، رائے دہندوں کی فہرست سازی، پورے اہتمام کے ساتھ الیکشن، **میونسپل قانون سازی** وغیرہ وغیرہ تمام کام شامل تھے۔ اس عملی تعلیم کے بعد **مدرسہ ابتدائی** کا ہر بچہ میونسپلٹی کے پورے نظام سے واقف ہو گیا تھا۔ بیش تر میدانوں میں جامعہ کا

یہی طرزِ تعلیم رہا، جس کی مثالیں مختلف پروجیکٹوں کے بیانات میں مل جائیں گی۔

آرٹس انسٹی ٹیوٹ

سب سے پہلے ۴۴-۱۹۴۳ء میں **ابوالکلام صاحب** جو ٹیچرس ٹریننگ کالج کے استاد تھے، اور شانتی نکیتن میں پڑھ چکے تھے، انھوں نے آرٹس کے استادوں کے لیے چھ ہفتے کا ایک ٹریننگ کورس چلایا۔ پھر کچھ صوبوں کے استادوں کے لیے الگ الگ یہ کورس چلائے گئے۔ ان کورسوں کی کامیابی سے جامعہ والوں نے یہ طے کیا کہ آرٹس کے استادوں کی تربیت کا مستقل انتظام کیا جائے۔ اسی سلسلے میں **ابوالکلام صاحب** کو ٹریننگ کے لیے امریکہ بھی بھیجا گیا۔ انھوں نے واپس آکر ۵۲-۱۹۵۱ء میں نو مہینے کا ایک کورس شروع کیا جو استادوں کے مدرسے کا ہی ایک حصہ تھا۔ اس کے کچھ عرصے بعد انسٹی ٹیوٹ آف آرٹ ایجوکیشن قایم ہوا، مالی ذرائع کی کمی کی وجہ سے اس انسٹی ٹیوشن کے قیام اور جماؤ میں بہت سی دشواریاں بھی پیش آئیں اور اس میں **ابوالکلام صاحب** اور دوسرے لوگوں کو خاصی محنت کرنی پڑی لیکن ان لوگوں نے اس جگہ کو جہاں گہرے گہرے گڑھے اور ٹیلے تھے بہت آہستہ آہستہ جامعہ کا سب سے خوب صورت علاقہ بنا دیا۔ اس کے رکھ رکھاؤ میں **ابوالکلام صاحب** کا شغف اور کام اس حد تک تھا کہ بعض لوگ اسے طنزاً کلام صاحب کی جاگیر بھی کہا کرتے تھے اور ان کے مزاج کے کچھ کھردرے پن کی وجہ سے بچے تو اس حصے میں گھُستے ہوئے بھی ڈرتے تھے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ ان کے اس انداز کی وجہ سے آرٹس انسٹی ٹیوٹ کا علاقہ اپنی سادگی لیکن خوبصورتی کے اعتبار سے بے مثال حصہ تھا۔

آرٹس انسٹی ٹیوٹ برابر ترقی کرتا رہا اور آج بھی آرٹس کے تمام تر جدید ساز و سامان اور طریقۂ تعلیم کے اعتبار سے ایک قابلِ قدر ادارہ بن چکا ہے۔ ہمارے جواب دہندہ حضرات میں **پروفیسر رضا حسین زیدی** جو اس انسٹی ٹیوٹ کے سربراہ بھی رہ چکے ہیں، ان کے انٹرویو میں اس کی مزید تفصیلات دیکھی جاسکتی ہیں۔

اتحادی دکان / بچوں کی دکان

لگ بھگ ۲۵-۱۹۲۴ء میں ایک اتحادی دکان، علی گڑھ میں ہی قایم کر لی گئی تھی جو

طالب علموں اور اساتذہ کی روزانہ ضروریات اور اسٹیشنری وغیرہ کی فراہمی کے کام کو پورا کرتی تھی۔ کھانے پینے کی تازہ چیزیں بھی اسی دکان میں مل جاتی تھیں اور لڑکے اور اساتذہ اس میں رضا کارانہ طور پر کام کرتے تھے۔ اس دکان کی خصوصیت یہ تھی کہ روزانہ اس کے اسٹاک، آمد و خرچ کا باقاعدہ حساب ہوتا تھا اور کسی وقت بھی ان کی صحیح پوزیشن معلوم کی جاسکتی تھی۔ شام کو دن بھر کا حساب اتالیق یا انچارج کو دے دیا جاتا تھا۔ یہ دکان **امدادِ باہمی** (کوآپریٹو) اصول پر قایم کی گئی تھی۔ بعد میں ۱۹۳۰ء میں جب **بچوں کا بینک** قایم ہوا تو بینک کا سرمایہ دکان میں لگایا جانے لگا اور اس کا نام **بچوں کی دکان** ہوگیا۔ یہ دکان بینک کے لیے منافع کمانے والے اداروں میں سے ایک سب سے اہم ادارہ تھی۔ **جامعہ نگر** کی زندگی میں طالبِ علموں کی لگ بھگ تمام ضروریات کو پورا کرنے والا یہی ادارہ تھا۔ اس میں کام کرنے کے بعد طالبِ علم کو کاروباری امور کا نہ صرف شعور پیدا ہو جاتا تھا بلکہ اتنا عملی تجربہ بھی ہو جاتا تھا کہ بعد میں اگر ضرورت پڑے تو وہ پورے اصولی انداز میں دکان چلاسکتا تھا۔

اس تربیت کی ایک عملی مثال بھی دیکھنے کو ملی۔ **جامعہ** میں آخری کھیپ کے ایک حیاتی رکن **برکت علی فراق صاحب**، جنھوں نے **جامعہ** سے ہی (بی اے) کیا تھا اور تعلیمِ بالغان کے ان ماہروں میں سے تھے جو ایکسپرٹ کی حیثیت سے **ہندوستان** سے باہر بھی کام کرچکے تھے، **شعبۂ تعلیم و ترقی** کے بند ہونے کے بعد کچھ عرصے کے لیے غالباً ۶۱-۱۹۶۰ء میں بے کار اور غالباً بے روزگار ہوگئے۔ اس عرصے میں انھوں نے **اوکھلا گاؤں** میں ایک بہت معمولی **پرچون کی دکان** کھولی جس میں وہ خود ہی بیٹھتے تھے۔ لباس وہی کھدر کی شیروانی اور ٹوپی رہا، لیکن دکان پورے اصولی انداز میں چلاتے تھے۔ نہ صرف اوقات مقرر تھے بلکہ کسی وقت بھی دکان کا اسٹاک اور آمد و خرچ کا میزانیہ ان کے رجسٹر سے حاصل کیا جاسکتا تھا۔ گوکہ **پرچون کی دکان** ان کی علمی اور عملی حیثیت سے بہت بعید تھی لیکن نہ انھیں اس کام میں کسی قسم کا عار محسوس ہوتا تھا نہ کبھی **جامعہ** کے لیے کوئی حرفِ شکایت ان کی زبان پر آیا۔

اصل میں **جامعہ** اپنے طالبِ علموں اور کارکنوں میں وہ تعمیری ذہن بنانے کی کوشش کر رہی تھی جس میں علم یا ڈگری کسی قسم کے کام میں سدِ راہ نہیں ہوتے۔

اردو اکادمی

علمی تصنیف وتالیف سے جامعہ کے لوگوں کے شوق وشغف کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۹۲۰ء میں قیام کے لگ بھگ ساتھ ہی ساتھ **شعبہ تصنیف و تالیف** بھی قایم ہوگیا تھا اور اگلے دو تین سال کے عرصے میں کتب خانے اور جامعہ کے اپنے پریس نے بھی کام شروع کر دیا تھا۔ **شعبہ تصنیف و تالیف** کے پہلے ناظم خود **ڈاکٹر ذاکر حسین** ہی تھے۔ جنوری ۱۹۲۳ء سے رسالہ 'جامعہ' کی اشاعت باقاعدگی سے شروع ہوگئی تھی جس میں طلبا اور اساتذہ کے علمی مضامین شائع ہوتے تھے۔ ۱۹۲۶ء سے 'پیامِ تعلیم' کی اشاعت بھی شروع ہوگئی تھی۔

۱۹۲۵ء میں جامعہ، علی گڑھ سے دھلی منتقل ہوئی اور فروری ۱۹۲۶ء میں **ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب** جرمنی سے واپس آ کر جامعہ کے کاموں میں لگ گئے۔ ان کے ساتھ جامعہ کی دو اہم شخصیتیں **ڈاکٹر عابد حسین** اور **پروفیسر محمد مجیب** بھی شامل ہوگئے۔ جامعہ کی طرف سے اشاعت کا کام **ذاکر صاحب** نے جرمنی کے قیام کے دوران ہی شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ دیوانِ غالب (جرمن ایڈیشن) اور دیوانِ شیدا، **حکیم اجمل خاں** کا دیوان اسی دور کی دین ہیں۔ بہرنوع **ذاکر صاحب** اور ان کے ساتھیوں کے ھندوستان آنے کے بعد جامعہ کے کاموں کی تنظیمِ نو عمل میں آئی اور مختلف شعبوں کو مختلف افراد کے سپرد کر دیا گیا۔ **شعبہ تصنیف و تالیف** کے بارے میں **عبدالغفار مدھولی صاحب** نے بتلایا ہے:

> ......ڈاکٹر عابد حسین صاحب جو کتابیں لکھنے اور ترجمہ کرنے میں کامل سمجھے جاتے ھیں، شعبہ تصنیف و تالیف کے ناظم بنائے گئے۔ انھوں نے ایک ایسی تجویز نکالی جس پر عمل کرنے سے لوگوں کو ھر سال نئی نئی کتابیں پڑھنے، رسالہ جامعہ اور پیام تعلیم (جس کی ذمہ داری بھی عابد صاحب کے پاس تھی) کا مطالعہ کرنے کا

شوق با قاعدہ جاری رہے۔ اعلان ہوا کہ جو
شخص سال میں چوبیس روپیے دے اسے ہر
تیسرے مہینے اس کی پسند کی نئی نئی کتابیں دی
جائیں گی۔ پھر رسالہ 'جامعہ' مفت ملا کرے گا، 'پیام
تعلیم' کے لیے رعایت رہے گی۔ جس شعبے کے تحت
یہ سب کچھ ہونے لگا اس کا نام شعبہ تصنیف و
تالیف کی بجائے اردو اکادمی رکھا گیا۔[۳]

اردو اکادمی کا سب سے اہم کام اعلیٰ معیاری تصانیف، تراجم اور تالیفات کی تلاش و تیاری اور ان کی پوری چھان بین کے بعد انھیں اشاعت کے لیے مکتبہ کے سپرد کر دینا تھا۔ اس کے طفیل مکتبہ جامعہ کی تصنیفات ملک بھر کی اردو اشاعتوں میں ایک مخصوص معیار و اعتبار کی حامل ہوتی تھیں۔ اردو اکادمی کے دوسرے قابلِ قدر کاموں میں توسیعی لکچرز منعقد کرنا، مشاعرے اور اعلیٰ معیار کی ادبی اور ثقافتی مجلسیں منظم کرنا بھی تھا۔ توسیعی لکچرز کا ذکر علاحدہ کیا جائے گا۔

اردو اکادمی کا کام آہستہ آہستہ مکتبہ جامعہ کے کاموں میں ضم ہوتا چلا گیا اور اس کے آخری آثار ۱۹۴۷ء کے انقلابی دور میں بالکل ہی ختم ہو گئے، جس میں خود مکتبہ جامعہ کی بقا ہی خطرے میں پڑ گئی تھی۔ بہرطور اردو اکادمی کے تمام عرصۂ حیات میں اس کی رہنمائی اور سربراہی ڈاکٹر عابد حسین کے پاس ہی رہی۔ شاید مشکل سے ہی کوئی اشاعت ایسی ہوئی ہو جو آخری منزل سے پہلے ان کی ناقدانہ نگاہ سے نہ گزری ہو۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کو اردو اکادمی اور تصنیف کے علمی اور انتظامی امور کی کتنی فکر تھی اس کا اندازہ خواجہ غلام السیدین کو لکھے ان کے خط سے ہوتا ہے۔

استادوں کا مدرسہ

جامعہ میں تعلیم کے کام کو صرف بنیادی حیثیت ہی نہیں ایک مخصوص اہمیت بھی حاصل تھی۔ یہاں کا طریقۂ تعلیم یا اندازِ تدریس عام اسکولوں سے خاصا مختلف تھا، استادوں کے مدرسے

کا ذکر کرنے سے پہلے یہاں کے طرزِ تعلیم کو کچھ مثالوں سے بتانا آسان ہوگا۔اس کی ایک چھوٹی سی مثال ہمارے ایک جواب دہندہ **سید حسن صاحب** نے یاد دلائی کہ یہاں نصاب کی مقررہ کتابیں بہت کم ہوتی تھیں۔خصوصاً ثانوی درجوں میں سائنس، ریاضی، جغرافیہ یہاں تک کہ تاریخ میں بھی کوئی کتاب مقرر نہیں تھی۔نصاب میں صرف ادب کی کتابیں متعین تھیں جو عام طور پر **مکتبہ جامعہ** ہی شائع کرتا تھا۔تاریخ کے مضمون میں استاد چند کتابوں کے مختلف بابوں کو پڑھ لینے کی رہنمائی یا ہدایت کر دیتے تھے۔مجھے ذاتی طور پر یاد ہے کہ میں نے **مدرسہ ثانوی** کے کتب خانے سے حاصل کر کے **ڈاکٹر تارا چند**، **ایشوری پرشاد** اور **سید ہاشمی مطلبی فرید آبادی** کی کتابیں پڑھی تھیں۔بالکل آخری سال یعنی دسویں جماعت میں، **انگریزی** میں **ملک راج آنند** کی ایک بہت اچھی کتاب *The Story of India* ہم لوگوں نے خریدی تھی جو فی الحقیقت کہانی کے سے انداز میں لکھی گئی تھی۔

پھر اس کے ساتھ **پروجیکٹ طریقہ تعلیم** اور **تفویضی طریقہ تعلیم** کی وجہ سے ان مضامین کے اساتذہ کی محنت کئی گنا بڑھ جاتی تھی۔اور انھیں اپنے اندازِ تدریس اور اس کے متن کو متواتر جلا دیتے رہنے کی ضرورت ہوتی تھی۔ریاضی کی تعلیم **جامعہ** کی ایک مشہور شخصیت اور حیاتی رکن **جناب برکت علی** (استادِ ریاضی) کے سپرد تھی جو **علی گڑھ** میں پہلے دن سے **جامعہ** کے ساتھ تھے۔سائنس کے استاد اور حیاتی رکن **علی احمد خاں صاحب** تھے جو تھیوری کے ساتھ ساتھ عملی تجربات کے ذریعے سائنس پڑھانے پر زیادہ زور دیتے تھے۔**جامعہ کیمیکل انڈسٹری** ان ہی کی کارکردگی میں **جامعہ** کا ایک خاصا جانا پہچانا ادارہ بنی۔

ظاہر ہے ایسے طرزِ تعلیم کے لیے، خصوصاً مقصدی یا **پروجیکٹ میتھڈ** سے پڑھانے کے لیے بہترین تربیت یافتہ اور مخلص استادوں کا ہونا ضروری تھا۔جہاں تک **جامعہ** کے استادوں کے اخلاص اور درس و تدریس کے عمل سے لگن کا سوال تھا، اس کے لیے تو یہی ثبوت کافی سمجھنا چاہیے کہ انھوں نے **جامعہ** کو منتخب کیا تھا اور وہ یہاں رکے ہوئے تھے لیکن جہاں تک ان کی تکنیکی تربیت کا سوال ہے اس وقت **ہندوستان** میں استادوں کی تربیت کے بہت زیادہ ادارے بھی نہیں تھے۔**جامعہ** ان کو مختلف انداز میں یا تو خود کرو اور سیکھو کے اصول پر تربیت کا موقع دیتی تھی یا اپنی بساط بھر استادوں کو **موگا (پنجاب)** کے ایک **ماڈل ٹریننگ اسکول** میں بھیجتی تھی۔اس میں سب سے پہلے جو استاد

بھیجے گئے وہ خود **عبدالغفار مدہولی صاحب** تھے۔ اس کے بعد متواتر یہاں سے ایک ایک کر کے پانچ استادوں نے تربیت حاصل کی۔ کچھ وہاں کی تربیت کے اثرات اور کچھ یہاں کی ضرورتوں کے تحت یہ خیال پیدا ہوا کہ خود جامعہ میں ہی اس اہم ترین کام کی ابتدا کر دی جائے۔ جامعہ کے ایک حیاتی رکن **سعید انصاری صاحب**، جنھیں **استادوں کے مدرسہ** کا معمار کہا جا سکتا ہے، انھیں پڑھنے پڑھانے کے طریقوں کا مشاہدہ کرنے **شانتی نکیتن** بھی بھیجا گیا تھا۔ خود **ڈاکٹر ذاکر حسین** کی ابتدائی درجوں کی تعلیم پر خاص توجہ تھی اور انھوں نے ایک تقریر میں کہا بھی تھا:

> ملت اسلامی کی اصلاح و ترقی کے لیے سب سے
> ضروری چیز چھوٹے بچوں کی تعلیم کا معقول
> انتظام کرنا ہے۔ یہی وہ بنیاد ہے جس پر قومی
> تعلیم کی بنیاد کھڑی کی جاسکتی ہے۔[۴]

اس وقت کے کچھ اسکولوں اور تعلیمی انجمنوں نے جنھوں نے **مدرسہ ابتدائی** کے کام کو دیکھا تھا، ان کی خواہش تھی کہ خود ان کی ضرورت پورا کرنے کے لیے **جامعہ** استادوں کی تربیت کا بھی ایک ادارہ قایم کرے۔ **ذاکر صاحب** نے ماہرِ تعلیم **خواجہ غلام السیدین** سے **ابتدائی** کے استادوں کی تربیت کا ایک نصاب تیار کروایا، اس کی مدد سے **عبدالغفار مدہولی صاحب** نے مدرسے کا ایک نظام الاوقات تیار کیا۔ آخر ۱۹۳۸ء میں جب **سعید انصاری صاحب** امریکہ سے تعلیم کے مضمون میں ہی اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے **جامعہ** واپس آئے تو انہی کی نگرانی میں **استادوں کا مدرسہ** قایم کر دیا گیا۔ ۱۹۳۷ء میں جب کانگریس نے **قومی بنیادی تعلیم** کو منظوری دی تو اس اسکیم کو بھی، **گاندھی جی** کے کہنے پر ایک کمیٹی نے تیار کیا تھا جس کے صدر خود **ڈاکٹر ذاکر حسین** تھے۔ **جامعہ** کے **استادوں کے مدرسے** نے اسی اسکیم کے مطابق اپنے یہاں ابتدائی کے استادوں کی تربیت شروع کر دی۔

استادوں کے مدرسے کی زندگی کا پہلا سال **قرول باغ** میں گزرا، اور اس وقت خود **ذاکر صاحب** کے ساتھ **سعید انصاری صاحب**، **عبدالغفار مدہولی صاحب**، **ماسٹر عبدالحیٔ صاحب** اور **نور محمد صاحب** اساتذہ تھے۔ ۱۹۳۸ء میں مدرسے کی کلاسیں **مجیب صاحب** کی کوٹھی کے کمروں میں بھی ہوتی تھیں۔

استادوں کا مدرسہ اپنی ترقی کی منزلیں طے کرتا ہوا، اپنے ناموں میں تبدیلی (ٹیچرس ٹریننگ کالج یا ٹیچرس ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ TTI) کے ساتھ آج فیکلٹی آف ایجوکیشن ہو چکا ہے۔ بالکل ابتدائی دور سے ہی یہ جامعہ کا بہت قابلِ قدر شعبہ رہا ہے اور اس کی وہ شہرت اور قدر و منزلت آج تک باقی ہے۔ **استادوں کے مدرسے** نے سماجی اہمیت کا ایک بڑا، اہم فرض ۱۹۴۷ء کے فوراً بعد یہ بھی ادا کیا تھا کہ پاکستان سے آئے ہوئے اساتذہ کے لیے حکومت کی اسکیم کے تحت تین تین مہینے کے کئی Refresher Courses منعقد کیے تھے۔ ان گروپوں میں مرد اور عورتیں دونوں ہوتے تھے اور ان کا ایک اہم سماجی فائدہ یہ تھا کہ وہ مسلمان ادارے میں اپنے ماضی قریب کے حالات سے متاثر ایک خاص طرح کی سماجی تلخی لیے آتے تھے اور عام طور پر یہاں کے رکھ رکھاؤ، استادوں اور جامعہ والوں کے اخلاق سے متاثر ہو کر ایک خوش گوار تبدیلی لے کر جاتے تھے۔ اس کا اظہار ہمارے یہاں بھی بعض جواب دہندگان نے کیا ہے۔

ظاہر ہے **استادوں کے مدرسے** کی تاریخ اور کل تفصیلات ایک مختصر سے نوٹ کی بجائے مکمل تحقیقی تفصیلات کی متقاضی ہے اور یہ کام ابھی باقی ہے۔

اسٹاف کلب

جامعہ نگر میں خالی وقت گزارنے کے لیے کسی قسم کی تفریح گاہ یا پکچر دیکھنے کے مواقع بالکل نہیں تھے اس کے منفی اثرات جو بھی ہوں، کچھ مثبت اثرات واضح طور پر ضرور نظر آئے۔ مثال کے طور پر یہاں کے تمام جشنوں، فنکشنوں اور تقریبات میں تمام لوگ ایک کنبے کی طرح بڑے جوش و خروش سے حصہ لیتے تھے۔ ان کا تذکرہ اپنے اپنے مقام پر کر دیا جائے گا۔ اساتذہ نے اپنے فرصت کے اوقات کو تفریحی انداز میں گزارنے کے لیے **اسٹاف کلب** خاصا پہلے قایم کر لیا تھا۔ **عبدالغفار مدہولی صاحب** نے ۳۴-۱۹۳۳ء کے سال کے بیان میں اظہار کیا ہے:

> دو ایک تو اسٹاف کلب۔ یہ تمام استادوں کے لیے
> ہے اس میں اخبارات کھیل کود کا انتظام، سیر و

تفریح کا پروگرام اور دعوتوں کی چهل پہل رهتی هے۔ [۵]

ہمارے ایک جواب دہندہ **پروفیسر انور رضا رضوی** نے ساتویں آٹھویں دہے میں یہاں کی کلچرل زندگی کے بارے میں بتایا:

شام کو جو جامعه اسٹور کے پیچھے دو کمروں
میں اسٹاف کلب کے نام سے کلب تھا وہ کافی بڑا
سنٹر تھا، اس معنی میں که وهاں هر طبقے کے
لوگ......چپراسی تو شاید نهیں...... (مگر میرا
مشاهده هے که کیرم کے شوقین ، چهارم درجے
کے ملازمین اور کچھ بیرونی حضرات بهی
آجاتے تهے) اور باقی سب لوگ وهاں آتے تهے۔
کیرم تها ، چیس تها، بیڈ منٹن ...... اور شام کو
اچهی خاصی تعداد...... ۳۰ سے ۴۰ فی صد تک لوگ
وهاں آتے تهے اور ایک چهوٹا سا چائے خانه جو
نیم کے پیڑ کے نیچے تها۔

بہرطور **اسٹاف کلب** کی اہمیت **جامعہ** کی آبادی بڑھنے کے ساتھ اور آس پاس کی آبادی میں **سنیما گھر** اور بڑے بڑے بازار کھلنے سے کم ہوتی چلی گئی۔

انجمن اتحاد

یہ کالج کے لڑکوں کی انجمن تھی اور ان کی تقریر و تحریر کے شوق اور اس کی نشو ونما کے علاوہ **جامعہ** کے منتظمین تک ان کے تاثرات پہنچانے کا ذریعہ بھی تھی۔ اس کا قیام بھی **جامعہ** کے قیام کے دوسرے تیسرے سال ہی ہو گیا تھا۔ **عبدالغفار مدھولی صاحب** نے بتایا ہے کہ ۲۳-۱۹۲۲ء میں اس کے ابتدائی نائب صدروں میں **سید نوراللہ شاہ**، **مولوی سعدالدین** اور **شفیق الرحمٰن قدوائی** تھے۔ آخرالذکر

دو حضرات بعد میں جامعہ کے حیاتی اراکین بھی ہوئے اور جامعہ کی ممتاز شخصیتوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ اس کا ایک **قلمی رسالہ** جوہر بہت بعد تک یعنی چھٹے ساتویں دہے تک جاری رہا جس نے طالبِ علموں میں صحافت اور تحریری صلاحیتوں کی نشو و نما میں بہت مدد کی۔ رسالہ جوہر غالباً انجمن اتحاد کے قیام سے کچھ عرصے پہلے ہی جاری ہو گیا تھا اور اس کے بانی اور پہلے ایڈیٹر: **محمود حسین خاں صاحب** تھے جو ذاکر صاحب کے چھوٹے بھائی تھے۔

انجمن اتحاد کو جامعہ کی روایت کے مطابق، اس کے تمام کاموں میں شریک کیا جاتا تھا اور لگ بھگ تمام بڑے جلسوں اور انتظامی امور میں اس کا مشورہ بھی شامل ہوتا تھا۔ چونکہ جامعہ کی زندگی میں انجمن اتحاد کا خاصا تاریخی رول رہا ہے اور اس کے علمی رسالے بھی بڑی اہمیت کے حامل رہے ہیں اس لیے جامعہ کی مکمل تاریخ کی تدوین کے لیے رسالہ جوہر (جس کے تمام پرچے جامعہ لائبریری کے ریکارڈس میں مل سکتے ہیں) بہت کارآمد ماخذ ثابت ہوں گے۔ ۱۹۳۱ء میں **جواہر لال نہرو** کو اس کا اعزازی ممبر بھی بنایا گیا تھا جس پر انھوں نے فخر کا اظہار کیا تھا۔ بہت بعد میں غالباً ۳۹-۱۹۳۸ء میں انھوں نے اس انجمن کے ایک بڑے جلسے کی صدارت بھی کی تھی جس میں مصر سے آئے ہوئے ایک وفد کو استقبالیہ دیا گیا تھا۔

ہمارے سروے میں پرانی جامعہ سے متعلق زیادہ تر حضرات نے انجمن اتحاد اور اس کی تعمیری اور قابلِ قدر روایات کا ذکر کیا ہے، قومی ہفتے کی تقریبات میں، جب جامعہ کے اسٹاف کے ہر چھوٹے بڑے کارکن کو ایک دن کی چھٹی دے دی جاتی تھی اور جامعہ کے تمام کام خود طالبِ علم ہی کرتے تھے، اس دن عام طور پر کھانا پکانے کا انتظام انجمن اتحاد ہی کے سپرد ہوتا تھا۔ خاصا وقت گزرنے کے بعد یعنی ساتویں دہے میں جب جامعہ میں **رورل انسٹی ٹیوٹ** قایم ہوا، اور مختلف جگہوں سے ایسے طالبِ علم بہت بڑی تعداد میں آنے لگے جو جامعہ کی روایات سے واقف نہیں تھے، تو انھوں نے اپنی ایک الگ یونین بنانے کی کوشش کی، پھر کچھ عرصے ان دونوں انجمنوں نے مشترک طور پر بھی کام کرنے کی کوشش کی۔ آخر انجمن اتحاد نام کی تنظیم ختم ہو گئی اور جامعہ کے طالبِ علموں کی ایک مشترکہ یونین بن گئی اور کچھ عرصے بعد وہ بھی سیاست کا شکار ہو کر بے عمل ہو گئی۔

انجمن خواتین

جامعہ کی خواتین جو ۱۹۴۷ء تک پردے میں رہتی تھیں، ان کی ایک باقاعدہ انجمن اس نام سے تھی۔ گو کہ اس کی ابتدا کب ہوئی، اس کو تو یقینی طور سے بتانے والی اب کوئی خاتون حیات نہیں ہیں مگر مختلف بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں **جرمن آپا جان** (**مس گرڈا فلپس بورن**) کی تحریک ضرور شامل ہوگی چونکہ ان کی بڑی خواہش تھی کہ عورتوں کو جامعہ کے کاموں میں شرکت کرنی چاہیے۔ بہرطور یہ انجمن قایم ہوئی، اس کے باقاعدہ جلسے اور ادبی نشستیں ہوتی تھیں۔ مجھے اس کا کہیں حوالہ تو نہیں مل سکا مگر اغلب یہی ہے کہ **جشنِ سیمیں** میں خواتین کا جو بہت بڑا جلسہ ہوا تھا جس کی صدارت **بیگم محمد علی جوہر** نے کی تھی وہ اسی انجمن کے تحت منعقد ہوا تھا۔ اس انجمن کے عہدیداروں میں **بیگم ذاکر حسین**، **بیگم آصفہ مجیب**، **بیگم صالحہ عابد حسین** اور **اختر جمال فاطمہ صاحبہ** (**بیگم اختر حسن فاروقی**) کے نام ملتے ہیں۔

انجمن طلبائے قدیم/اولڈ بوائز لاج

جامعہ کے طلبائے قدیم کی انجمن کے قیام کا سنہ تو فی الوقت نہیں مل سکا لیکن خیال ہے کہ یہ دوسرے دہے کے آخر یا تیسرے دہے کے ابتدائی برسوں میں قایم ہوگئی ہوگی، کیونکہ **عبدالغفار مدھولی** نے اپنی کتاب میں مارچ ۱۹۳۹ء کو **اولڈ بوائز لاج** کی عمارت کے سنگِ بنیاد رکھے جانے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ......ذاکر صاحب جامعہ کے سب سے پرانے اور سب سے پہلے طالب علم ہیں۔ آپ نے سنگِ بنیاد رکھتے ہوئے فرمایا:
>
> جب بھی جامعہ میں کسی نئی عمارت کا سنگ بنیا د رکھا جاتا ہے تو میرا دل تھر تھراتا ہے ... عمارتوں کی کثرت کسی ادارے کے لیے قابلِ فخر نہیں ہے۔ اکثر عمارتیں یا تو مقبرے ثابت ہوتی

ھیں یا قید خانہ۔ اگر عمارت میں رہنے والے ان
کے مقاصد کو بھول جائیں تو وہ عمارتیں ان
مقاصد اور ان ارادوں کا مقبرہ بن جاتی ھیں
...... اگر ھم ایسا کریں تو آئندہ آنے والی نسلوں
کو یہ حق ھوگا کہ ھم کو ان عمارتوں سے دھکا
دے کر نکال دیں اور ھمارے مقاصد اور ارادوں
کے ان مقبروں کو گرادیں، مجھے یقین ھے کہ
جامعہ کے پرانے لڑکے اس مقصد کو نھیں بھولیں
گے۔[۶]

اولڈ بوائز ایسوسی ایشن نے توو قتاً فو قتاً **جامعہ** کے کاموں میں ہاتھ بٹایا ہی مگر چونکہ اس کے عہدے دار متواتر بدلتے رہتے تھے اور کچھ لوگ **جامعہ** سے دور بھی رہتے تھے اس لیے اس انجمن سے زیادہ اس کے مکان یعنی **اولڈ بوائز لاج** نے **جامعہ** کی خدمت کی۔

جامعہ کالج کی موجودہ عمارتیں بننے سے پہلے، سڑک سے کوئی سوسوا سو گز دور کھڑی یہ عمارت عرصے تک **جامعہ** کی آبادی کا پہلا نشان رہی۔ ایک عرصے تک اس کے کمرے کالج کی کلاسوں کے لیے استعمال ہوتے رہے۔ عمارت کے اوپر کے حصے میں غالباً شروع سے ہی **ای جے کیلاٹ صاحب** کی رہایش رہی جو **جامعہ کالج** کے ہوسٹل کے اتالیق تھے جبکہ **ھوسٹل غفار منزل** کے کمروں میں تھا۔ **اولڈ بوائز لاج** کے مکین **ای جے کیلاٹ صاحب** **جامعہ** کے حیاتی رکن ہونے کے علاوہ پوری زندگی **جامعہ** کے بڑے لڑکوں کی صحت و ورزش کی عملی دیکھ بھال کے لیے سب سے زیادہ جانے پہچانے جاتے ہیں، دوسرے مکین **ابوالکاظم قیصر زیدی صاحب** تھے جو گو کہ حیاتی رکن تو نہیں تھے مگر **جامعہ** میں ایک غیر معمولی حیثیت کے حامل ضرور تھے۔ ضرورت کے مطابق وقتاً فو قتاً اس عمارت کا استعمال بدلتا رہا۔ یہاں **لائبریری** بھی رہی۔ نیچے کے کمروں کو **جامعہ** کے کارکنوں کو رہایش کے لیے بھی دیا گیا، دفاتر بھی رہے اور اب اس پوری عمارت میں **سنٹرل بینک** کی شاخ کافی عرصے سے کام کر رہی ہے۔

انجمن کا سبین (روزی کمانے والوں کی انجمن)

جامعہ کی مالی حالت دوسرے اور تیسرے دہے میں اتنی خراب تھی کہ ۱۹۲۸ء میں سب سے پہلے گیارہ افراد نے یہ وعدہ کیا کہ وہ کم سے کم بیس سال یا اپنی حیات تک جامعہ میں ہی کام کریں گے اور ڈیڑھ سو روپے سے زیادہ تنخواہ☆ نہیں لیں گے (گو کہ یہ تنخواہ بھی عام طور پر نصیب نہیں

☆ مناسب محسوس ہوتا ہے کہ ۱۹۲۸ء میں جب جامعہ کی باگ ڈور پوری طرح **انجمن تعلیم ملی** کے ہاتھ میں تھی (جو بعد میں **انجمن جامعہ ملیہ اسلامیہ** کہلائی) اس وقت جامعہ میں تنخواہوں کی صورتِ حال کا کسی قدر تفصیل سے اظہار کر دیا جائے جس سے ان کارکنوں کے جذبہ ایثار اور اپنی مادی زندگی کی قربانیوں کا کچھ اندازہ لگایا جاسکے۔ **پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی** نے 'شہید جستجو' میں لکھا ہے:

> اب ذاکر صاحب اساتذہ کی ایک ایسی جماعت کے سر براہ تھے جس کا خود کوئی حق نہیں تھا اور سر براھی کی ساری ذمے داریاں انھی کے سر تھیں ... یوروپ سے واپسی پر جب انھوں نے جامعہ میں دوبارہ کام کرنا شروع کیا تو انھیں صرف سو روپے تنخواہ ملتی تھی، جبکہ ان کے دو ساتھیوں کو جن کے پاس یوروپ کی یونیورسٹیوں کی ڈگریاں تھیں تین تین سو روپے ماھانہ ملتے تھے۔ لیکن جلد ھی معلوم ھو گیا کہ ان تنخواھوں کی ادائیگی جامعہ کے بس کی بات نہ تھی، ان کے دونوں ساتھیوں نے پیش کش کی کہ وہ سور وپے سے زیادہ نھیں لیں گے اور خود ذاکر صاحب نے اپنی تنخواہ اسّی روپے کر لی اور چونکہ پابندی سے ھر ماہ سب کو پوری تنخواہ نھیں دی جاسکتی تھی اس لیے قاعدہ یہ بنایا گیا تھا کہ سب سے کم تنخواہ پانے والے ملازمین کو سب سے پھلے تنخواہ دی جاتی تھی۔ اس لحاظ سے ذاکر صاحب سب سے بعد میں تنخواہ پانے والوں میں تھے۔ بعد میں اس خیال سے کہ تنخواھوں کی ادائیگی میں کچھ باقاعدگی آئے۔ یہ طے کیا گیا کہ ساٹھ روپے یا اس سے زیادہ تنخواہ پانے والوں کو نصف تنخواہ دی جائے اور نصف ان کے حساب میں جمع کر دی جائے۔ اس طرح ذاکر صاحب کی تنخواہ گھٹ کر چالیس روپے ماھانہ رہ گئی اور ۱۹۴۴ء تک جب تنخواھیں پوری ☜

ہوئی) ان لوگوں کو جامعہ کا حیاتی رکن کہا جاتا تھا۔ بعد میں ۱۹۵۷ء تک یہ تعداد چھبیس افراد تک پہنچ گئی تھی۔ بہرِ حال، ہوا یہ کہ جب ان حیاتی اراکین نے یہ عہد کیا تو دوسرے استادوں نے بھی عملی طور پر خود اپنی خواہش سے اپنی تنخواہوں میں کمی کرالی۔ **عبدالغفار صاحب** نے لکھا ہے:

ڈیڑھ سو روپے جن کی تنخواہیں تھیں وہ سو لینے لگے۔ سو والوں نے پچھتر کرائے۔ پچھتر والوں نے پچاس۔ اس سے کم پانے والوں نے پانچ پانچ ، دس دس روپے کم کرا لیے۔ میں نے بھی تیس کی بجائے پچیس کرالیے۔

بہرِنوع اس قربانی میں وہ طالبِ علم بھی شریک ہوگئے جو اپنی مالی پریشانیوں کی بنیاد پر وظیفہ پاتے تھے۔ **غفار صاحب نے بتایا:**

مالی حالت کے خراب ہونے کی وجہ سے

☞ ملنے لگیں اور اساتذہ کے سارے معاملات بے باق ہو گئے، انھیں اسی قدر تنخواہ ملتی رہی۔ ۱۹۴۴ء سے ۱۹۴۸ء تک، جب وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر بنے، ان کو اسّی روپے ماہانہ بطور تنخواہ ملتے رہے۔ (صفحات ۸۱-۱۸۰)

جامعہ کے کاموں میں باغبانی کی حیثیت اتنی اہم رہی ہے کہ اگر اسے غیر درسی عمل کے بجائے درسی عمل سمجھا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اور چونکہ یہ عمل دیواروں اور چھت کی قید سے آزاد کھلے میدان (Oper Air) میں ہوتا تھا اس لیے نفسیاتی طور پر بچوں کو اس سے غیر معمولی رغبت اور لگن ہوتی تھی۔ ۳۱-۱۹۳۰ء میں مدرسہ ابتدائی کی زندگی میں باغبانی کا شروع ہونا ایسا ہی تھا جیسے تہذیبِ عالم کے ارتقا میں کھیتی باڑی کی ابتدا۔ اس ایک عمل نے اتنی نئی نئی شاخوں کو جنم دیا کہ مدرسہ ابتدائی خود ایک نمونے کا اسکول بن گیا۔ چونکہ باغبانی بچوں کے کتب خانے اور بچوں کے بینک دکان اور خوانچہ کے قیام میں ایک براہِ راست تعلق رہا ہے اس لیے ان تمام شعبوں کو سلسلہ وار ایک ہی ساتھ رکھ لیا گیا ہے۔

مدرسہ ابتدائی کے جامعہ نگر میں آنے کے بعد تو باغبانی کے کام کے لیے زمین کی کوئی کمی نہیں تھی لیکن قرول باغ میں بھی تعلیمی مرکز کی عمارت سے ملحق ایک بہت بڑا پلاٹ ۳۱-۱۹۳۰ء میں صرف اسی کام کے لیے خرید لیا گیا اور اگلے دن سے ہی لڑکوں نے اس بنجر زمین کو قابل کاشت بنانے کے لیے محنت مشقت شروع کر دی تھی۔ نالیاں بنوائی گئیں۔

وظیفہ پانے والے خود دار طالب علموں نے تہیہ
کیا تھا کہ چھوٹے موٹے کسی نہ کسی کام کو
انجام دے کر فیس کا ایک حصہ ادا کریں گے۔ اس
مطلب کے لیے انجمن کا سبین کی بناء ڈالی۔ ؎

غالباً اس وقت ادارے کی مالی پریشانیوں کا یہ اشاریہ آخری حدوں کی نشان دہی کرتا ہے لیکن خصوصاً **باغبانی، مرغی خانے** وغیرہ کی پیداوار گھر گھر جا کر بیچنے پر طالبِ علم کو مقررہ شرح سے ادائیگی کی جاتی تھی۔ میں نے بھی اپنے انٹرویو میں ذکر کیا ہے کہ میں نے جامعہ کے لوگوں کے جوتوں کی مرمت کر کے ۴۹-۱۹۴۸ء میں باقاعدہ پیسے کمائے تھے۔ لیکن مرمت کے لیے جوتے لانے اور ان کی اجرت وصول کرنے کا کام ہمارے نگرانِ مدرسہ **عبدالرزاق صاحب** خود کیا کرتے تھے۔

باغبانی، مرغی خانہ، کتب خانہ، بچوں کا بینک، بچوں کی دکان، بچوں کا خوانچہ رہٹ لگوایا گیا اور پھر اس کام کو ہر رخ سے ذریعہ تعلیم بنالیا گیا۔ زمین کی نپائی، پلاٹوں اور چھوٹے ٹکڑوں کی تقسیم جسے مختلف کلاسوں اور کلاسوں میں چھوٹے چھوٹے گروپوں میں بانٹا گیا، زمین کے اعتبار سے مختلف پیداواروں، خصوصاً سبزیوں کی قسمیں طے ہوئیں اور کام چل پڑا لڑکوں سے کھیتی کے مختلف موضوعات پر مضمون لکھوائے گئے، چنانچہ ایک طالب علم نے لکھا:

...... ماسٹر صاحب ہم لوگوں کو باغیچے میں لے
گئے (غفار صاحب نے نوٹ میں لکھا ہے کہ خود
لڑکے ہی انہیں لے گئے تھے) وہاں جا کر سب
سے پہلے لڑکوں نے پارٹی بنائی، پھر کھیت ناپے
تو ہر ایک لڑکے کو بارہ فٹ لمبا اور چھ فٹ
چوڑا کھیت ملا۔ ہر ایک کھیت میں بڑی بڑی
جھاڑیاں تھیں۔ میرا ساتھی جمیل الدین تھا۔ جب
ہم لوگ جھاڑیاں کاٹنے کو کھڑے ہوئے تو ایسے
ایسے کانٹے چبھے جیسے کسی نے پیروں میں آگ

لگادی۔ ہم نے سب چیزیں کاٹ لیں پھر زمین کو
کھودا اور یہ چیزیں بوئیں۔ مولی، شلجم، میتھی،
گاجر، چقندر و غیرہ۔[۸]

اسی کام کے تعلق سے بچوں کو حساب بھی پڑھایا گیا، **عبدالغفار صاحب** نے بتایا:

سبزیوں کا بونا اور ان کا بیچنا کوئی غیر
معمولی بات نہیں ہے لیکن جس مدرسے میں پہلے
پہل یہ کام ہو اور وہ بھی لڑکوں کے ہاتھوں،
اس کی جتنی قدر کی جائے کم ہے۔ پہلی دفعہ
کوئی تیس روپے جمع ہوئے۔ اب سوال یہ پیدا
ہوا کہ ان روپیوں سے کوئی یادگار قایم کی
جائے۔ باغبانی کے متعلق معلومات حاصل کرنے
کے لیے کتابیں نہیں تھیں طے ہوا کہ یہ کتابیں
منگوائی جائیں۔[۹]

لاھور کے کسی **پروفیسر** نے سبزیوں کی کاشت کے بارے میں کچھ کتابیں لکھی تھیں جب انھیں یہ روداد لکھ کر بھیجی گئی تو وہ بہت خوش ہوئے اور انھوں نے اپنی کتابیں کم قیمت پر بچوں کو بھجوادیں۔ ایک رسالہ: 'مشیرِ باغبانی' بھی جاری کرالیا گیا۔ درجہ چہارم کے ایک بچے **فضل الرحمٰن** نے اپنے مضمون میں اطلاع دی:

ہمارا کتب خانہ جنوری ۱۹۳۰ءمیں کھلا۔ یہ اس
طرح قایم ہوا کہ ہم نے اپنے باغیچہ میں سبزی
بوئی تھی۔ اس سبزی کو ہر ایک ماسٹر صاحب
کے گھر تحفے کے طور پر لے گئے۔ کسی نے چار
آنے، کسی نے آٹھ آنے، کسی نے ایک روپیہ دیا۔
سب مل کر تین روپے ہوئے ان روپیوں سے ہم نے

اپنا کتب خانہ قایم کیا۔ [۱۰]

اس طرح مدرسہ ابتدائی میں بچوں کی لائبریری کی ابتدا ہوئی جو متواتر ترقی کرتی رہی اور اب میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ پچھلے پچھتر برسوں میں بچوں کی کتابوں کا جتنا اچھا ذخیرہ، خصوصاً اردو میں، جامعہ میں بچوں کی لائبریری نے جمع کیا ہے شاید ہندوستان بھر میں کسی ایک جگہ ملنا مشکل ہے۔

اسی سلسلے میں جامعہ نگر آنے کے بعد ایک مرغی خانہ قایم کیا گیا۔ اس کی حیثیت بھی تعلیمی اور کاروباری دونوں طرح کی تھی۔ اس کا سارا کام بہت صحت منداور سائنٹفک انداز میں بچوں کو سکھایا جاتا تھا اور وہی اسے انجام دیتے تھے۔ بڑے پیمانے پر مرغی خانہ پروجیکٹ چلا کر مرغی پالن سے متعلق تمام معلومات بچوں کو اس طرح فراہم کر دی گئیں کہ اگر زندگی میں انھیں ضرورت پیش آئے تو تھوڑی بہت تحریک کے ساتھ وہ یہ کام بہت سکون سے کر سکتے تھے۔ مرغی خانے کے انڈے جامعہ نگر میں عام طور پر استادوں کے گھروں پر بچے ہی فروخت کرنے جاتے تھے۔ اور ایک متعینہ شرح سے انھیں کمیشن ملتا تھا۔ اس طرح باغبانی، دکان، بینک، خوانچہ، چڑیا گھر اور دوسرے متعدد حرفوں سے بچوں میں غیر معمولی دلچسپی اور عملی طور پر متحرک اور منہمک رہنے کے مواقع موجود تھے۔

باغبانی کی تربیت کی افادیت کی دو مثالیں اپنے جواب دہندہ حضرات سے دے کر اس کے توسط سے بینک کی ابتدا، اور بینک کے پھیلاؤ پر روشنی ڈالی جائے گی۔ **شمس الاسلام فاروقی صاحب** جو کچھ برس جامعہ کے طالبِ علم رہ کر علی گڑھ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے **انڈین ایگریکلچر ریسرچ انسٹی ٹیوٹ** سے سینیر سائنٹسٹ کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ انھوں نے بتایا:

> یعنی ہم تیسری اور چوتھی جماعت میں پڑھ رہے ہیں، ہمارے پاس جامعہ سے متعلق جو تھوڑی سی زمین تھی، ابتدائی مدر سے کے قریب ، وہاں ہمیں ہر بچے کو ، کیاریاں جو تھیں وہ ہمارے نام سے مخصوص تھیں۔ ہمیں الاٹ ہوئی تھیں با قاعدہ۔ ہمیں معلوم تھا کہ کس زمانے میں

اس میں کیا چیز ہونا ہے، اسے کس طرح ہونا
ہے، اس میں کس وقت پانی دینا ہے، اس میں
ترائی کرنا ہے تو کس وقت کرنا ہے، اس کی
صفائی کیسے ہونا چاہیے۔ اس کی اپج بڑھانے کے
لیے ہم کیا کیاانتظامات کریں گے ......

جامعہ میں باغبانی پروجیکٹ لگ بھگ مسلسل چلتا رہا۔ اس سے لڑکوں نے کتنا حاصل کرلیا تھا اس کی ایک دلچسپ مثال **مشتاق اعظمی صاحب** نے اپنے انٹرویو میں بتائی:

ایک آپ کو دلچسپ بات بتاؤں کہ جو باغبانی
پروجیکٹ تھا وہ...... اتنا بچے کرتے تھے اور کرایا
جاتا تھا کہ زامبیا (افریقہ) میں میری پوسٹنگ
ہوئی تو ایک دن میں نے دیکھا کہ ایک صاحب آکر
میرے کمرے میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں پہچان
نہیں پایا، کے کے بنسل (نام تھا) بتایا میں
جامعہ کا پرانا طالب علم ہوں۔ بات کرتے ہوئے
معلوم ہوا کہ وہاں ایک ہائر سکنڈری اسکول
ہے، وہاں یہ صاحب Botany پڑھاتے ہیں۔ ہیڈ
ہیں اس کے۔ میں نے کہا تم نے جامعہ سے کیا کیا
تھا کہ تم Botany کے ہیڈ ہو؟ وہ جو ہم نے
باغبانی کا پروجیکٹ کیا تھا ، اس میں ہم نے اتنا
سیکھا، پریکٹکل کہ آج میرا ڈنکا بج رہا ہے اور
سارے Animal اور اس کا مجھے انچارج بنا دیا
گیا ہے۔ پریکٹکل ایکسپرینس میں اتنا تھا کہ......
اور ابھی کالج کا پرنسپل ہے۔ جامعہ کا پرانا

پرائمری کا پڑھا ہوا......

*زیرِ نظر سروے کے **ایک** جواب دہندہ **ڈاکٹر دھرمیندر ناتھ صاحب** نے **ایک** اور رخ کی طرف نشان دہی کی:*

......پانچویں کلاس میں ہم لوگوں کے پاس بینک کا کام تھا اور چھٹی کلاس میں باغبانی کا کام تھا۔ جو پیسے اس میں سے بچے ، بینک سے اور باغبانی سے ، ان کو لے کر ہم تعلیمی سفر پر گئے......

*جیسا اوپر بیان کیا گیا، **بچوں کے بینک** کی ابتدا بھی باغبانی کے کام کی مرہونِ احسان ہے۔**عبدالغفار** نے ۳۱-۱۹۳۰ء کے حال میں لکھا ہے:*

باغبانی میں لڑکے جو کام کرتے تھے، اس کی اجرت مقرر کر دی گئی تھی۔ کام ختم ہونے کے بعد ہر لڑکے کو ایک پرچی دے دی جاتی تھی۔ یہ طے تھا کہ جمعرات کے دن سب لڑکے اپنی اپنی پرچیوں کے دام دفتر مدرسہ سے لے لیں گے ...... دوسری جمعرات کو اعلان ہوا کہ جو لڑکے نقدی نہ لینا چاہیں ان کے دام محفوظ رہیں گے۔اس طرح ہر لڑکے کی ایک پاس بک بن گئی جس میں پیسے جمع ہونے اور نکالنے کا حساب نوٹ کیا جانے لگا ...... بعض دفعہ سادہ پرچی (رسید) کے ذریعے لڑکے اپنی رقم نکال بھی لیتے تھے۔ یہ رقم ان کے حساب سے گھٹا دی جاتی تھی۔ یہ کاروبار ایک چھوٹے سے کمرے میں ہوتا تھا ......

لیـن دیـن ایك استاد کی نگرانی میں ہوتا تھا......
جـب لڑکوں کو یقین ہو گیا کہ اس کا روبار میں
ان کے پیسوں میں کوئی گڑ بڑ نظر نہیں آتی اور
نہ داموں کے بروقت ملنے میں کوئی رکاوٹ ہوتی
ہے تـو وہ جیـب خـرچ کے بـچـے ہوئے دام اور
والـدیـن کے عـطیـے بھی جمع کرنے لگے۔ یہ تھی
بچوں کے بینك کی ابتدا۔[۱۱]

لین دین سے بچے ہوئے پیسوں سے پہلے **بچوں کی دکان** کھولی گئی۔ پھر **بچوں کا خوانچہ** کھولا گیا جو **بچوں کے بینک** کے مستقل آمدنی والے اثاثے (*Assets*) بن گئے۔ مئی ۱۹۳۱ء میں **بچوں کے بینک** کا پہلا سالانہ جلسہ جو **حافظ فیاض احمد صاحب** کی صدارت میں ہوا، اس کے بارے میں **عبدالغفار مدہولی صاحب** نے بتایا:

......منافع تقسیم ہوا ، منافع ہی کیا تھا ، لین دین
کے بـعـد سـال کے آخر میں کوئی چھبیس روپے
جـمـع تھے۔ کسی کو پیسہ کسی کو دو پیسے نفع
دیـا گیـا۔ حسـاب جـو لـگایا گیا تو یہ پچیس فی
صـدی بیـٹھـا ، یـعنی ایك روپے پر چار آنے۔ مگر
ایك روپیہ کس کا جمع تھا !! ......اوسطاً چار چھے
آنے (آج کے ۲۵یا۳۵ پیسے) کے دام جمع تھے۔[۱۲]

بچوں کے بینک اور اس کے ذیلی اداروں کو محض بچوں کی دلچسپی بڑھانے یا انھیں کسی کام میں مشغول رکھے رہنے کے ہتھکنڈے کے طور پر ہی نہیں چلایا جاتا تھا، یہ تو اس کا ذیلی حصول تھا۔ جو بچہ پہلی سے پانچویں چھٹی تک ان چیزوں کو خود کرتا تھا، ان پر لکھتا تھا۔ ان کے حسابات کرتا تھا، کتابیں پڑھتا تھا اور پھر ان اداروں کے آپسی معاشی رشتوں کو عملی طور پر سمجھتا تھا، اپنی رائے دیتا تھا تو ان چیزوں کے بڑے بڑے **نظریات** اور **اصول** (*Theories*) پڑھائے بغیر بھی اس کے تحت الشعور میں

ہمارے پورے معاشی نظام کے خط وخال نقش ہوجاتے تھے، جو بعد میں ان نظریات کو سمجھنے کا کام بہت آسان کردیتے تھے۔

جامعہ کے بچوں کے بینک کے کاموں نے اتنی ترقی کرلی تھی کہ ۳۳-۱۹۳۲ء میں بینک کی باقاعدہ چیک بک ملنے لگی تھی اور پہلا چیک بچوں نے **ذاکر صاحب** (شیخ الجامعہ) کو عطیے کے طور پر دیا تھا جسے انھوں نے بینک کے پورے قواعد وضوابط کے ساتھ کیش کروایا۔ بچوں کے بینک کی کرنسی کے بارے میں **عبدالغفار مدہولی صاحب** ۳۴-۱۹۳۳ء کے احوال میں لکھتے ہیں:

> ...... اس انقلابی سال میں نوٹوں کا اجراء بھی خاص چیز ہے۔ اب لوگ بینک کے پرزوں پر بھی ایسا ہی اعتبار کرنے لگے تھے جیسے سونے چاندی کے سکوں پر۔ چنانچہ ایک پیسے والے اور ایک آنے والے نوٹ جاری کیے گئے۔ دفتر جامعہ، مکتبہ، بچوں کی دکان ، خوانچہ اور بعض منظور شدہ دکانوں پر ان کا لین دین بغیر کسی رکاوٹ کے ہونے لگا۔ [۱۳]

ان تمام کاموں میں حصہ لینے سے بچوں کی نہ صرف ذہنی تربیت ہوتی تھی بلکہ ان میں ایک غیرمعمولی خود اعتمادی (*Self Confidence*) پیدا ہوجاتا تھا۔ مجھے کسی بزرگ نے (جن کا نام مجھے اس وقت یاد نہیں آرہا) بتایا کہ **جواہر لال نہرو** نے اپنا ایک کھاتہ بچوں کے بینک میں بھی کھول رکھا تھا۔ ایک بار وہ جب یہاں آئے تو انھوں نے غالبًا بطور امتحان ایک چیک بھر کر کیش کرانے کے لیے دیا۔ طالبِ علم جو کھڑکی کے دوسری طرف بیٹھا کیش دے رہا تھا، اس نے چیک دیکھا، پھر رجسٹر میں موجود دستخطوں کا معائنہ کیا اور چیک یہ کہہ کر واپس کردیا کہ اس چیک کے دستخط اور ریکارڈ میں موجود دستخط نہیں ملتے، اس لیے اسے کیش نہیں کیا جاسکتا۔ **جواہر لال نہرو** نے لڑکے سے پوچھا: "تم مجھے نہیں پہچانتے ہو؟ "لڑکے نے جواب دیا: "میں تو آپ کو پہچانتا ہوں ، مگر بینک آدمیوں کو نہیں صرف دستخطوں کو پہچانتا ہے۔ "راوی بزرگ نے بتایا کہ **جواہر لال**

نے اس لڑکے کو نہ صرف شاباش دی بلکہ **مجیب صاحب** (شیخ الجامعہ) کو اس مکمل تربیت پر مبارک باد بھی دی۔ فی الحقیقت **بچوں کے بینک** اور اس کے ان کاموں میں حصہ لینے سے جو خود اعتمادی طالب علموں میں پیدا ہوتی تھی اس کا اعتراف **پروفیسر انور رضا رضوی** نے جو جامعہ کے کبھی طالبِ علم نہیں رہے، ان الفاظ میں کیا ہے:

......زیادہ مجھے جو اپیل کیا وہ مدرسہ ابتدائی کی تعلیم نے کیا ...... اور جو بچے وہاں پڑھتے تھے وہ ذاتی طور پر اتنے سمجھدار ہوجاتے تھے جو ان کو Calss room education کے علاوہ ملتی تھی۔ اور اس چیز کو شاید یہاں کا جو بہترین اسکول ماڈرن اسکول میں نے کئی بار دیکھا ۶۰-۱۹۵۹ء اور ۱۹۶۱ء میں کہ وہ اپنے پرائمری اسکول کے بچوں کو لا کر اس اسکول کو دکھاتے تھے (اس زمانے میں دون اسکول کے پرنسپل اور اساتذہ بھی مدرسہ کے کاموں کو دیکھنے آئے تھے) اور جو وہ Concept تھا، پولٹری فارم، ایک بچوں کا بینک تھا ، تفریح کا جو ایک میدان تھا، ایک خوانچہ بہت خاص تھا ......اور ایک عجیب قسم کی بیداری جو دوسرے اسکولوں کے اس Level کے بچوں میں نہیں پائی جاتی تھی . وہ ایک Unique چیز تھی...... ذاتی توجہ اساتذہ کی ان بچوں کی طرف رہتی تھی اور اسی کا نتیجہ تھا کہ حالانکہ یہاں کا Medium of Instruction اردو تھی۔ جو یہاں

سے لڑکے پاس کر کے گئے، ان میں سے بہت سے
لڑکے ایسے تھے کہ جنھوں نے علی گڑھ میں بہت
نمایاں پوزیشن حاصل کی۔ میری سروس کے
دوران چار لڑکے، بلکہ آٹھ دس لڑکے ایسے ہوں
گے جو بہت ہی نمایاں مقام پر رہے...... ان بچوں
میں بہت Confidenceتھا جو یہاں سے جاتے تھے
اور اس کی وجہ وہی تھی کہ ابتدائی میں جو
تعلیم حاصل کرتے تھے اور ان کی جو تربیت
ہوتی تھی اور Higher Secondary میں اسے
اور Encouragement ملتا تھا جب وہ باہر جاتے
تھے تو دوسری جگہ کے لڑکوں میں وہ بات نہیں
تھی......

ان اداروں کی تفصیلات اور بچوں کی مکمل اور مجموعی ذہنی تربیت میں ان کی افادیت فی الحقیقت مختصر تبصرے یا نوٹس کی بجائے پوری تحقیق کے بعد ایک مکمل کتاب کی متقاضی ہے۔

بالک ماتا سنٹر

یہ ادارہ جامعہ قدیم کے انتظامیہ کے ایک غیر معمولی یا انوکھے اصول کی بہترین مثال ہے۔ جامعہ والوں کا، خصوصاً **ذاکر صاحب** کا کہنا تھا کہ کام تو اس ملک اور سماج میں کرنے کے لیے بے شمار ہیں البتہ لگن اور اپنی افتادِ طبع سے کام کرنے والے کم ہیں۔ لہٰذا پہلے ڈھنگ کا آدمی تلاش کرلو، پھر کام اور اس کے ذرائع تو پیدا کیے ہی جا سکتے ہیں۔ **مشتاق احمد اعظمی صاحب** نے اس کی کئی مثالیں دیتے ہوئے ایک جگہ بتایا:

میں چونکہ ہندوستان میں بہت گھوما کرتا تھا
تو ذاکر صاحب مجھ سے اکثر کہا کرتے تھے کہ

تمھیں اگر اچھا ڈھنگ کا آدمی ملے تو مجھے
بتانا، میں اسے نوکری دلا دوں گا۔ میں نے کہا،
ایسے کیسے آپ کسی ڈھنگ کے آدمی کو نوکری
دلا دیں گے؟ اگر کوئی پوسٹ ہو، کام ہو تبھی
تو آپ نوکری دلا سکتے ہیں! کہنے لگے یہی تو
ہمارا در بھاگیہ ہے کہ ہم پہلے پوسٹ نکالتے
ہیں، پھر آدمی ڈھونڈتے ہیں۔ پہلے آدمی ڈھونڈ
لو، پھر تو پوسٹ ہی پوسٹ ہیں۔

بالک ماتا سنٹر کی ابتدا، اس طرح ہوئی کہ ۱۹۴۷ء کے بعد تعلیم وترقی نے شہر میں سماجی کاموں کے سلسلے میں کئی مرکز قایم کیے ہوئے تھے جو **شفیق الرحمٰن قدوائی صاحب** کی زیرِ نگرانی بہت مفید سماجی اور تعلیمی خدمات انجام دے رہے تھے۔ **شفیق صاحب** کچھ عرصے UNESCO کے ایک ایکسپرٹ کی حیثیت سے ہندوستان سے باہر گئے، پھر وہاں سے آئے تو دھلی اسمبلی کے ممبر اور وزیرِ تعلیم ہو گئے۔ بہرطور ان کی دلچسپی ان مراکز سے کافی حد تک برقرار رہی لیکن بدنصیبی سے ۱۹۵۳ء میں ان کا بے وقت انتقال ہو گیا، ظاہر ہے یہ صدمہ بحیثیت مجموعی جامعہ اور خصوصی طور پر تعلیم وترقی اور اس کے کاموں کے لیے بہت سخت تھا۔ پھر بھی اس وقت کام نہیں رکا۔

بالک ماتا سنٹر قایم ہونے کی وجہ اور اس کے کاموں کے بارے میں **پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی** کا بیان سب سے مستند ہے کیونکہ **شفیق الرحمٰن قدوائی صاحب صدیق صاحب** کے والد تھے اور **بالک ماتا سنٹر** کو قایم کرنے والی **صدیقہ قدوائی صاحبہ** ان کی والدہ تھیں۔ اس سے جامعہ کی کچھ روایات اور اندازِ فکر پر بھی بڑی قابلِ قدر روشنی پڑتی ہے۔ **صدیق صاحب** کا بیان ہے:

...... جب ہمارے والد کا انتقال ہوا تو...... شوہر
کے مرنے کے بعد ایک گھر یلو عورت کیا کرے؟ تو
سب کا یہ خیال تھا کہ وہ گھر پر بیٹھیں گی۔
لیکن مر دولا سارا بھائی، سبھد را جوشی، ذاکر

صاحب، مجیب صاحب، سب لوگ اور وہ پورا
جو گاندھین حلقہ تھا جس میں ہمارے والد تھے،
انھوں نے کچھ ایسا اثر ڈالا کہ......'نہیں صاحب
ہم کام کریں گے!......' جب وہ (وطن سے) یہاں
(دھلی) واپس آئیں تو ذاکر صاحب ان سے ملنے
آئے اور ذاکر صاحب نے کہا کہ دیکھیے جامعہ کا
طریقہ یہ ہے کہ جو Life Members ہیں(ان کے
انتقال کی صورت میں) ان کے بیوی بچوں کی
پرورش اور تعلیم و تربیت کی ذمے داری جامعہ
کی ہوتی ہے......تو والدہ نے کہا ایسا نہیں ہو
سکتا۔ اس لیے کہ میں کچھ کام کرنا چاھتی ہوں۔
اور جو میں کام کروں اس کا معاوضہ مجھے
دیجیے گا...... تو مجھے آپ کوئی کام دیجیے تو یہ
بنیاد تھی بالک ماتا سنٹر کی۔ تو انھوں نے کہا کہ
یہاں کی عورتوں کو کرافٹ اور ان کے بچوں کی
تربیت اور ان کے لیے نرسری اسکول اور یہ جو
گھریلو چیزیں ہیں......انھیں اگر Develop کیا
جائے تو یہ Professions بن سکتے ہیں......

اس ادارے کی نشو ونما اور اس کے سماجی وثقافتی اور تربیتی کاموں کی تفصیلات بیان کرنے کے بعد ***قدوائی صاحب*** *نے بیان کیا:*

......اور پھر وہ بچیاں، جنھوں نے کبھی زندگی
میں ریل نہیں دیکھی تھی ، یعنی نکلی ھی نہیں
تھیں اپنے محلے سے...... وہ آج IAS و غیرہ میں

آچکی ھیں مٹیامحل کی لڑکیاں......

یہ ادارہ ۱۹۵۵ء سے متواتر کام کر رہا ہے۔ موجودہ **شیخ الجامعہ شاہد مہدی صاحب** نے اپنے انٹرویو میں ذکر کرتے ہوئے بتایا:

آپ نے بالك ما تا سنٹر کا ذکر کیا...... اور پھر یہ
سوچا ھم نے کہ یہ لڑکیاں ھائی اسکول کرتی
ھیں وھاں کی۔ اکثر جو ھیں وہ پردے میں رھتی
ھیں۔ تو ایك Discover کی کہ Computer is a
very pardah-friendly......تو ھم نے اپنے
ساتھیوں سے آکے بات کی...... وھاں پے ھم نے
کمپیوٹر سنٹر کھول دیا۔ کافی سیکھ گئیں وھاں
سے اور ان کو چند ھزار ھی سھی ان کی
(تنخواہ) مل جاتی ھے وھاں سے۔

اس طرح یہ ادارہ پچھلے پچاس برس سے مصروفِ عمل ہے۔

بچوں کی برادری

۱۹۲۷ء کے بعد تعلیم و ترقی نے شہر میں کچھ علاقوں میں سماجی کام، خصوصاً فرقہ واری ہم آہنگی برقرار رکھنے کے لیے کچھ مراکز قایم کیے تھے۔ دھلی شہر کا ماحول تقسیم ملک اور تبادلہ آبادی کی دین، فرقہ واریت کی وجہ سے بہت تلخ ہو گیا تھا۔ اس میں کچھ بہتری اور بھائی چارے کے جذبے کے جذبات پیدا کرنے کے لیے ان مراکز کے تحت بچوں کی ایک تنظیم قایم کی گئی جسے **بچوں کی برادری** کا نام دیا گیا۔ شہر میں کئی جگہ بچوں کے کلب تھے جن کے مجموعے کو **بچوں کی برادری** کہا جاتا تھا۔ یہ کلب ہر فرقے کے بچوں کو آپس میں ملنے جلنے کھیلنے کودنے اور کلچرل اور تعلیمی اور تفریحی پروگرام منعقد کرنے کے بہت سے مواقع فراہم کرتے تھے۔ **قومی تہوار گاندھی جینتی، نہرو بال دوس، یومِ آزادی، یومِ جمہوریت** کے علاوہ مختلف فرقوں کے تہواروں میں بھی مل جل کر شریک ہوئے تھے۔ جامعہ کے تعلیمی میلوں اور

محمد علی ٹرافی کے مقابلوں میں بھی ان کی شرکت سے انھیں جامعہ کو دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملتا تھا۔ ان کلبوں سے متعلق بہت سے غیر مسلم بچوں نے جامعہ میں باقاعدہ تعلیم پائی۔ ہمارے جواب دہندہ حضرات میں **جتندر کمار آنند صاحب** نے اپنی زندگی کی ابتدا بیری والا باغ کے کلب سے ہی کی جس کا ذکر انھوں نے بڑی محبت اور عقیدت سے کیا ہے۔ **بچوں کی برادری** نے ۱۹۵۱ء میں بچوں کا ایک پندرہ روزہ **کشمیر کیمپ** بھی منعقد کیا تھا جس میں ہر فرقے کے لڑکے شریک تھے۔ **جتندر کمار صاحب** نے لکھا ہے:

> بیری والا باغ میں ایک چھوٹا سا گھر تھا (بچوں کی برادری کا کلب) جس میں بیچ میں ایک بڑی سی کھلی جگہ تھی اور ادھر ادھر دو کمرے تھے، بہر حال، اس کے قایم کرنے والے قیصر نقوی کی رہائش اور (ان) بہت سے بچوں کے لیے کافی تھے جو وہاں کھیلنے آتے تھے اور کبھی کبھی میٹنگیں کرتے تھے۔ اسی جگہ ان کی زندگی کا زیادہ وقت گزرتا تھا اور یہیں سے یہ لوگ زندگی کا وہ خوبصورت ڈھنگ سیکھتے تھے کہ ایک ٹیم میں کیسے رہتے ہیں اور مل جل کر کیسے کھیلتے اور زندگی گزارتے ہیں۔
>
> ......میں سیکرٹری رہا، ہم لوگ بھائی صاحب (قیصر نقوی) کے ساتھ کبھی کبھی دہلی کے گاؤں میں بھی جاتے تھے اور وہاں کے بچوں کے ساتھ کھیلتے کودتے تھے۔ قیصر صاحب کے ساتھ ہم لوگ بہت سے سماجی فنکشنس میں حصہ لیتے تھے۔ ایسے موقعوں پر ہم بچوں کو ملک کے وزیر اعظم

(نہرو) اور دوسری بڑی بڑی شخصیتوں سے
ملنے کے کافی مواقع ملتے رہتے تھے۔ ہاں مجھے
یاد آیا کہ ایک بار ہماری بچوں کی میٹنگ میں
اندرا گاندھی بھی ہمارے ساتھ اسی دری پر
بیٹھی اپنی آپ بیتی کا کوئی قصہ سنا رہی
تھیں۔ یہ ہماری ذہنی تربیت ہورہی تھی۔
پچھلے بیان میں میں نے ذکر کیا تھا کہ قیصر
صاحب نے مجھے شفیق میموریل اسکول میں
داخل کرا دیا ...... بھر حال اسی زمانے میں میں
بچوں کی برادری میں جوش و خروش سے
شامل ہو گیا......

تعلیم وترقی کے کاموں کے خاتمے کے ساتھ ساتھ بچوں کی برادری وغیرہ کے کام لگ بھگ چھٹے دہے میں ختم ہو گئے۔

بچوں کی عدالت (پولس / بچوں کی حکومت)

اگست ۱۹۳۴ء میں **مدرسہ ابتدائی** میں بچوں کی عدالت قایم ہوئی۔ جس کی ایک پولیس بھی تھی۔ پولیس، یعنی مقررہ لڑکے، شکایتیں چنے ہوئے منصف کے سامنے پیش کرتے، گواہیاں ہوتیں تھوڑی بہت جرح ہوتی اور پھر منصف استاد کے مشورہ سے سزا سناتا۔ عام طور پر پہلی بار کی غلطی پر معمولی سرزنش کے بعد معافی دے دی جاتی تھی۔ لیکن عادی مجرم کو سزا بھی دی جاتی تھی جو عام طور پر کسی کام کی شکل میں ہوتی تھی، جسے لڑکے کی جماعت کا استاد طے کرتا تھا۔ تماشائیوں کا آنا ضروری نہیں تھا۔ لیکن لڑکے اپنے شوق میں خاصی تعداد میں پہنچتے تھے۔ عدالت جمعرات کو اسکول کے اوقات کے بعد لگتی تھی۔

اس طرح لڑکوں میں ایک ذمہ داری کا احساس پیدا ہوتا تھا اور چونکہ ملزم کو اپنی بات کہنے کا

بھی پورا موقع مل جاتا تھا تو دوسرے اسکولوں کی طرح سزا ایک طرفہ نہیں ہوتی تھی، جس کی تلخی بچے کے ذہن میں کبھی کبھی مشکلیں پیدا کر دیتی ہے۔

بعد میں یہی ادارہ **بچوں کی حکومت** میں تبدیل کر دیا گیا اور اس نے ابتدائی کے بچوں کی پرانی انجمنوں **انجمن کمال** اور **بچوں کی مجلس** کی جگہ لے لی۔ **بچوں کی حکومت** میں صدر اور کچھ ممبروں کا انتخاب ہوتا تھا اور اس کی کابینہ میں وزیرِ اعظم، وزیرِ صحت وصفائی، وزیرِ کھیل وغیرہ چنے جاتے تھے۔ اس حکومت کے انتخابات اور مسند نشینی کا جلسہ ابتدائی کی زندگی میں بڑی دلچسپی اور ہلچل کا زمانہ ہوتا تھا۔ مسند نشینی میں باقاعدہ حلف برداری کی رسم ہوتی تھی اور پرانی کابینہ نئی کابینہ کو کام سونپتی تھی۔

جامعہ میں جب کوئی مہمان آتا تھا تو بچے ہی اسے **مدرسہ ابتدائی** دکھاتے تھے جس میں **بچوں کی حکومت** کا صدر اس کا استقبال کرتا تھا اور سارے وقت ساتھ ساتھ رہتا تھا۔ **جناب حسن ثانی نظامی**، جنھیں **جامعہ** کی ہر چیز سے عقیدت اور عشق ہے، انھوں نے اپنے انٹرویو میں **بچوں کی حکومت** کے سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ نقل کیا ہے، جس سے اس وقت کے صدر کی خود اعتمادی اور حاضر جوابی کا احساس ہوتا ہے:

> ...... میرے جامعه چھوڑنے کے...... برسوں بعد کی بات ھے۔ افریقه کے ایك طالب علم تھے جو میری نگرانی میں دیے گئے تھے...... پھر بورڈنگ میں چلے گئے تھے۔جامعه میں جو وھاں بچوں کی حکومت تھی وہ اس کے پریزیڈنٹ ھوگئے۔ کسی غیر ملك کے پرائم منسٹر آئے تھے اور جامعه دیکھنے کے لیے آئے تو وھاں بچوں کی حکومت والوں نے ان کا استقبال کیا۔ عبدالحفیظ خاں آگے آگے تھے استقبال کرنے کے لیے تو مھمان نے عبدالحفیظ سے مصافحه کرتے ھوئے کھا میں

فلاں ملک کا پرائم منسٹر ہوں۔ حفیظ نے فوراً
Shot back کیا کہ میں یہاں بچوں کی حکومت
کا پریسیڈنٹ ہوں۔

بزمِ کمال / بزمِ سعد / بزمِ ادب

بزمِ کمال بچوں کے اسکول کی انجمن جس کا نام **علی گڑھ** کی زندگی سے ہی ملنا شروع ہوجاتا ہے۔ بعد میں غالبًا اسی کو **مولانا سعدالدین انصاری** (حیاتی رکن) کے انتقال کے بعد **بزمِ سعد** کردیا گیا تھا۔ **مدرسہ ثانوی** کے طالبِ علموں کے تمام پروگرام میرے زمانے میں (۵۱-۱۹۴۷ء) **بزمِ ادب** کے تحت ہوتے تھے جن میں مباحثے، بچوں کا مشاعرہ، تمثیلی مشاعرہ، ڈرامے، الیکشن، مسند نشینی، پکنک اور 'المصور' رسالے کی تیاری وغیرہ وغیرہ بہت سی دلچسپیاں شامل تھیں۔

بنیادی اسکول

استادوں کے مدرسے کے قیام کے بعد اوکھلا گاؤں میں ایک اسکول کھولا گیا جس کے اخراجات تو سرکار برداشت کرتی تھی لیکن تعلیم کا کام اور انتظام جامعہ کے ہی سپرد تھا۔ جامعہ نے اسے **مدہولی صاحب** کو سونپ دیا جنھوں نے لگ بھگ تنہا اس کو ایک نمونے کا اسکول بنادیا جو تازہ طور پر منظور شدہ قومی بنیادی تعلیم کے اصول پر کام کرتا تھا۔ **غفار صاحب** کی مدد کے لیے کسی میٹرک پاس طالبِ علم کو کل وقتی یا جز وقتی ملازم رکھ لیا جاتا تھا۔ چوتھے پانچویں دہوں میں یہ اسکول اپنی خوبصورتی اور اپنے پوری طرح دیہی ماحول کے اعتبار سے بے حد خوبصورت اور نمونے کا اسکول تھا۔

پیامِ تعلیم (پیامی برادری)

جامعہ سے ایک پندرہ روزہ اخبار: 'پیامِ تعلیم' نام سے اپریل ۱۹۲۶ء سے جاری کیا گیا۔ اس کا مقصد جامعہ کے کاموں کی تفصیل، اس کے مقاصد اور چندے کے سلسلے کی اور دوسری اطلاعات لوگوں تک پہنچانا تھا۔ اس کے نگراں **ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب** تھے اور منیجر **عبدالغفار مدہولی**

صاحب تھے۔اس لفظ 'منیجر' سے وہ مطلب نہیں لینا چاہیے کہ جو آج کل کمپنیوں کے 'منیجر' سے لیا جاتا ہے۔اس وقت پیامِ تعلیم یا جامعہ 'رسالے کے منیجر یعنی **غفار صاحب** کے پاس خطوط کے جواب دینے سے لے کر وی پی کرنا اور پتے لکھنا وغیرہ سارے کام شامل تھے۔ کچھ عرصے بعد اس میں دلچسپی کے لیے بچوں کے ایک دو کالم اور پھر کچھ صفحات شامل کیے جانے لگے۔ کچھ برس **سعید انصاری صاحب** بھی اس کے **مدیر** رہے۔آخر ۲۹/اکتوبر ۱۹۳۲ء کو پیامِ تعلیم 'صرف بچوں کا رسالہ بنادیا گیا اوراس کے **ایڈیٹر**: جامعہ' کے پرانے طالبِ علم **حسین حسان صاحب** بنائے گئے

پیامِ تعلیم ' اوراس کے مدیر حضرات بذاتِ خود ایک اتنا بڑا موضوع ہے کہ اس پر ایک مکمل تحقیقی کام ہونا چاہیے۔ **اردو** کے بچوں کے ادب کی تخلیق، فروغ، تجدید، اصلاح اور دلچسپی پیدا کرنے میں رسالہ: پیامِ تعلیم 'ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔اس کے فیض سے **اردو** میں نہ صرف پرانے لکھنے والوں کو بچوں کے لیے اپنی تخلیقات چھپوانے اور متواتر لکھتے رہنے کا موقع مل گیا، بلکہ اس نے طالبِ علموں، نوجوانوں، نوآموزوں کو بھی لکھنے کی ترغیب فراہم کی اور فی الحقیقت ان کی ایسی تربیت اور اصلاح کی کہ وہ بچوں کے ادیب اور شاعر کہلانے کے مستحق ہوگئے۔ بچوں کی معلومات میں اضافے کی غرض سے اس رسالے نے بڑے بڑے عالموں، ادیبوں اور شاعروں کو مجبور کیا کہ وہ بھی بچوں کے لیے لکھیں۔ چنانچہ ۱۹۴۷ء سے پہلے کے پرچوں میں اس میں لکھنے والوں میں **گاندھی جی، جواہر لال نہرو، مختار احمد انصاری، پریم چند، کنہیالال کپور، ڈاکٹر محمد اشرف، راہل سنکرتائن، پروفیسر علیم، رشید احمد صدیقی، کرنل بشیر حسین زیدی، ظ۔انصاری، قرۃ العین حیدر** جیسے بے شمار نام مل جاتے ہیں۔ **ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر مجیب، ڈاکٹر عابد حسین، صالحہ عابد حسین، الیاس احمد مجتبیٰ، عبدالواحد سندھی، عبدالغفار مدھولی، شفیع الدین نیر، برکت علی فراق** اور جامعہ کے بیش تر اساتذہ تو جامعہ سے متعلق ہونے کی وجہ سے اس رسالے کے لیے '**گھر کے لوگ**' مانے جاتے تھے۔

ڈاکٹر سید عابد حسین کے علاوہ **حسین حسان صاحب** اوران کے بعد **محمد ولی صاحب** تو اس کے ان ایڈیٹروں میں سے تھے کہ جنھوں نے ان گنت نئے لکھنے والوں کی اصلاح کر کر کے ان کو پختہ کار لکھنے والا بنادیا۔ پیامِ تعلیم ' کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس نے خالص کاروباری رخ کبھی نہیں

اپنایا، ہمیشہ تعلیمی، تربیتی اور تعمیری رخ پیشِ نگاہ رکھا۔

یہ رسالہ اکتوبر ۱۹۲۶ء سے جولائی ۱۹۴۷ء تک اکیس سال تو متواتر پابندی سے پہلے نکلتا رہا پھر ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے چند سال کے وقفے کے بعد اب تک متواتر نکل رہا ہے۔

پیامی برادری ،اسی رسالے میں شروع میں ایک قلمی دوستی کی برادری تھی جس کے ذریعے سے دور بیٹھے لوگ ایک دوسرے سے واقفیت حاصل کرتے تھے۔ جامعہ کے چھوٹے بچوں کی **جرمن آپا جان (مس گیرڈا فلپس بورن)** بچوں کے لیے چھوٹے چھوٹے دل چسپ نوٹ لکھتی تھیں جو ترجمہ کر کے **پیامی برادری** کے تحت 'پیامِ تعلیم' میں شائع ہوتے تھے۔ **پیامی برادری** کے توسط سے بچے دل چسپی کے مشغلوں، جیسے ٹکٹ، سکے، تصویریں جمع کرنے وغیرہ میں ایک دوسرے کے معاون ہوتے تھے۔ کچھ عرصے مختلف مقامات پر اس کی منظّم انجمنیں بھی بنیں مگر ۱۹۴۷ء کے بعد یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔

تعلیمِ بالغان تعلیم و ترقی، مراکزِ تعلیم و ترقی ، دیہی مراکز

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے کاموں میں **تعلیم و ترقی** کا شعبہ اتنا اہم شعبہ رہا ہے کہ چند صفحات میں اس کے بنیادی خط و خال ابھارنا بھی مشکل ہے۔ یہ بات کہنا بھی شاید غلط نہ ہوگا کہ **تعلیم و ترقی**، **جامعہ** کے عوامی رخ یا عوام سے رشتے کا نام تھا اور اس کے قیام کا مقصد ہی عام لوگوں کی سیاسی، سماجی تربیت کرنا تھا۔ یہ شعبہ بانیانِ **جامعہ** اور اس کی پہلی نسل کے اس ذہن کا بین مظہر بھی تھا کہ وہ **جامعہ** کو ایک خالص تعلیم و تعلم کا ادارہ نہیں بنانا چاہتے تھے بلکہ ملک اور قوم کے ذہن کی تعمیر کی ایک ہمہ جہت تحریک کے روپ میں ڈھالنا چاہتے تھے۔ **تعلیم و ترقی** کی سوچ یا اس کا خیال کب اور کس طرح پیدا ہوا، اس کے لیے تو ایک گہری تحقیق درکار ہے اور اس کے ایک پرانے اور معتبر کارکن **مشتاق احمد اعظمی** نے اس پر ایک طویل کام بھی کیا ہے، جو ابھی غیر مطبوعہ صورت میں ہے (جسے دیکھنے کا مجھے موقع نہیں ملا)۔ زیرِ نظر سروے میں بھی **مشتاق صاحب** نے اس سلسلے میں اپنے خیالات خاصی تفصیل سے ظاہر کیے ہیں۔ دوسرے حضرات نے بھی خصوصاً **پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی** نے اس کے کاموں وغیرہ پر خاصی روشنی ڈالی ہے۔

عبدالغفار مدھولی صاحب کے بیان کے مطابق ۲۶-۱۹۲۵ء میں **حافظ فیاض احمد صاحب**

نے قرول باغ میں ایک مدرسہ شبینہ (رات کا مدرسہ) کھول لیا تھا۔ اس وقت اس میں کچھ لڑکے اور کچھ استاد رضا کارانہ طور پر کام کرتے تھے۔ اس کے بعد خود **عبدالغفار صاحب** کو جب یہ کام سونپا گیا تو انھوں نے گھر گھر جا کر ان پڑھ اور کم پڑھے لکھے لوگوں کو جن میں مزدور، تانگہ چلانے والے اور بالکل نچلے طبقے کے لوگ شامل تھے۔ تیار کرنا شروع کیا۔ **غفار صاحب** نے لکھا ہے:

> صرف ایک ھفتے کے عرصے میں چھوٹے بڑے تین سو آدمی آنے لگے۔ کھیں قصے کھانیاں سنائی جارھی ھیں تو کھیں اخبار، کسی طرف کتابیں پڑھوائی جا رھی ھیں تو کھیں تصویروں کے ذریعے مفید باتیں سمجھائی جارھی ھیں۔ انھی بڑے لوگوں میں مدرسے کی پنچایت بنائی تھی۔ ان کے اپنے جلسے اس اھتمام سے ھوتے تھے کہ بستی کے معز ز لوگ اور جامعہ کے استادوں کو شرکت کی دعوت دی جاتی تھی۔ اس قسم کے جلسوں کا ان پر اتنا اچھا اثر ھوا کہ انھوں نے اپنی اندرونی تنظیم کو اور مضبوط کر لیا۔ [۱۴]

عبدالغفار صاحب نے اس کے بہترین مثبت اثرات کو لکھا ہے کہ لوگ ان سے اور جامعہ والوں سے بے حد محبت اور ان کی قدر و احترام کرنے لگے تھے، مگر میں اس میل ملاپ اور برادرانہ تعلقات کا سب سے مثبت ثبوت یہ محسوس کرتا ہوں کہ ۱۹۴۷ء میں ایک فرد کے علاوہ وہاں سے سب لوگ زندہ واپس آ گئے۔ بہت سا مالی نقصان ضرور ہوا مگر وہیں کے لوگوں نے بہت کچھ بچانے کی بھی کوشش کی اور اس کو بہ حفاظت جامعہ کو واپس کیا۔ اس سلسلے میں پچھلے باب میں **بیگم انیس قدوائی** نے **گاندھی جی** اور **ذاکر صاحب** کی جو گفتگو نقل کی ہے اس کا حوالہ دیا جا چکا ہے۔ بہر طور **تعلیم و ترقی** کے کاموں کی پہلی اینٹ ۲۶-۱۹۲۵ء میں رکھ دی گئی تھی۔ ۳۸-۱۹۳۷ء کا حال لکھتے ہوئے **عبدالغفار**

مدہولی صاحب نے بیان کیا:

> اس سال کی ایک تبدیلی یا اضافہ یہ ہے کہ شفیق الرحمن صاحب قدوائی نے حلقہ ہمدردانِ جامعہ سے علاحدہ ہو کر ایک نیا شعبہ تعلیم و ترقی قایم کیا۔ یہ شعبہ پہلے مدرسہ شبینہ کے نام سے حافظ فیاض احمد صاحب نے قایم کیا تھا لیکن ایک ایسے آدمی کی ضرورت تھی جو باہر کے ملکوں کی کوششوں کا غور سے مطالعہ کرے اور اپنے ملک میں اپنے حالات کے مطابق خصوصاً مسلمانوں کے لیے مضبوط اور صحیح بنیادوں پر اس ادارے کو چلائے۔ یہ کام اب صرف مدرسہ شبینہ تک محدود نہیں ہے بلکہ بالغوں کو تعلیم دینے کے جو ذرائع اور موقعے نکل سکتے ہیں ان سب کو پروگرام میں شامل کر لیا گیا۔[۱۵]

اس منصوبے میں موٹے موٹے طور پر جو کام شامل کیے گئے تھے ان میں تختیوں پر **قرآن و حدیث** کے کتبے تیار کرنا، مذہبی، معاشی، سیاسی امور پر چھوٹے چھوٹے کتابچوں کے ذریعے رائے عامہ کی تربیت کرنا، **دیواری اخبار** کے ذریعے لوگوں کو موجودہ حالات سے واقف رکھنا، جلسوں، ڈراموں اور دوسرے پروگراموں کے ذریعے سماج سدھار کا کام، **گشتی کتب خانہ**، **شبینہ مدرسہ** وغیرہ وغیرہ شامل تھے۔ **تعلیم و ترقی** کی غرض وغایت اور خصوصاً سیاسی مقصدیت کو بیان کرتے ہوئے **مشتاق اعظمی صاحب** نے بتایا:

> اصل میں تعلیم و ترقی کا مقصد تو اس زمانے میں سب کا وہی ہوتا تھا... تعلیم بالغان *Adult literacy* جامعہ میں پہلی دفعہ ذاکر صاحب اور

> شفیق صاحب نے شروع کیا۔ اور ایک خاص بات یاد رکھنے کی ہے کہ شروع تو انھوں نے اس سے کیا، یعنی پڑھنا لکھنا سکھانا، بعد میں چونکہ یہ خود کام کرتے تھے تانگے والوں میں بیٹھ کر، اور سکنڈ ورلڈ وار کا زمانہ تھا، اور یہ سب کے سب کانگریسی تھے تو Actually یہ لوگ Anti British feelling (پیدا کرنے) کا کام انجام دینا چاہتے تھے۔ لیکن اس کے لیے انھیں کوئی Vehicle چاہیے تھی ... تو یہ ایک بہانہ مجھے Political Education کا......

تعلیم و ترقی سے ملحق یا اس کے ذیلی اداروں کی فہرست بہت طویل ہے۔ مدرسہ شبینہ سے لے کر قرول باغ کے **تعلیمی مرکز نمبر ۲**، آزادی کے بعد دھلی کے مختلف علاقوں میں قایم کیے گئے **مراکز تعلیم و ترقی** (جن کا تفصیلی ذکر خاص طور پر **منظور عبدالرحمٰن** اور **پروفیسر رفاقت علی خاں** کے انٹرویوز میں دیکھا جا سکتا ہے) **بچوں کی برادری** اور اس کے تحت **بچوں کے کلب** (جس کے کاموں کی کچھ تفصیل **جتندر کمار صاحب** کے بیانات میں ملتی ہے) **کشمیر کیمپ** اور دوسرے بہت سے سماجی کام شفیق میموریل اسکول کا قیام، **بالک ماتا سنٹر** کا قیام اور اس کے کام جو آج تک چل رہے ہیں، یہ سب شامل ہیں۔ دیہی مراکز اور دیہات میں کاج سدھار کام، سماجی لٹریچر اور دوسرے ذرائع **فلمیں**، **چارٹس** وغیرہ کی تیاری کے لیے **ریسرچ ٹریننگ اور پروڈکشن سینٹر اور اسٹیٹ ریسورس سینٹر**، جو قومی پیمانے پر آج بھی پورے انہماک سے **تعلیمِ بالغان** کے لیے مواد فراہم کرنے میں مصروف ہے، یہ سب شعبے بھی تعلیم و ترقی کے تحت ہی آتے تھے۔ جیسا اوپر بھی اظہار کیا گیا **تعلیم و ترقی** بذاتِ خود ایک اتنا بڑا نام ہے کہ اس کے ایک ایک کام اور ایک ایک شعبے اور اس کے یوگ دان پر مکمل تحقیق و تلاش کی ضرورت ہے جو **مشتاق اعظمی صاحب** نے غالباً پورا کر لیا ہے۔

افسوس ہے کہ اتنا مفید اور قابلِ قدر کام، بطور ادارہ ختم ہو گیا گو کہ اس کے ایک دو شعبے اب بھی

الگ الگ اپنے کاموں میں مصروف ہیں۔اس کے ختم ہو جانے کی وجوہات پر ہمارے جواب دہندگان میں سے کئی حضرات نے اظہارِ رائے کیا ہے جن میں **پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی**،**مشتاق اعظمی**،**پروفیسر نذیرالدین مینائی** وغیرہ کے بیانات خاصے اہم ہیں۔ بہر طور مختصراً اس کی اہم ترین وجوہات میں سے ایک وجہ اس کے بانی اور روحِ رواں **شفیق الرحمٰن قدوائی صاحب** کا جامعہ سے باہر دوسرے کاموں میں مصروف ہو جانا اور پھر ان کا بے وقت انتقال ہے۔ دوسری وجہ اس وسیع ادارے کی سمتِ کارکردگی گم ہو جانا ہے۔ بہر طور ایک اہم وجہ یہ تھی کہ جامعہ کا UGC سے براہِ راست تعلق ہو جانے کی وجہ سے اس توسیعی ادارہ کے کاموں کے لیے مالیات کی فراہمی مشکل بلکہ ناممکن سی ہو گئی تھی، جس کے نتیجے میں سرکاری قواعد وضوابط کے بے جان شکنجوں کے دباؤ میں ایک ایسا ادارہ دم توڑ گیا جس کی افادیت آزاد ہندوستان میں پہلے سے بھی زیادہ تھی۔اب لگ بھگ وہی کام دوسری یونیورسٹیاں کسی نہ کسی شکل میں انجام دے رہی ہیں جو تعلیم و ترقی نے تیسری اور چوتھی دہائی میں پورے شعوری انداز سے شروع کیا تھا۔

توسیعی لکچرز

جامعہ کی ابتدا سے ہی یہاں کی علمی فضا کو بہت اعلیٰ معیار پر قایم کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ بالکل ابتدائی دنوں میں جب ابھی با قاعدہ کلاسوں کا انتظام بھی نہیں ہوا تھا۔ جامعہ میں اسلامی تہذیب، تاریخ، اس وقت کی مسلم دنیا کی سیاست اور ہندوستان کی جنگِ آزادی پر لکچرز ہوا کرتے تھے۔ ظاہر ہے جس ادارے میں **مولانا محمد علی**،**حکیم اجمل خاں**، **ڈاکٹر مختار احمد انصاری**،**مولانا اسلم جیراجپوری** اور **ڈاکٹر ذاکر حسین** جیسے لوگ سرگرمِ عمل ہوں وہاں کا علمی اور سیاسی ماحول کس پیمانے کا ہوگا۔ چنانچہ اس دور میں **مولانا محمد علی**، **ڈاکٹر سر محمد اقبال**،**مولانا شوکت علی**،**مولانا اسلم جیراجپوری** وغیرہ کے لکچروں کا خاصا ذکر ملتا ہے۔

اردو اکادمی، جس نے بنیادی طور پر معیاری تصنیف وتالیف کی تیاری اور اشاعت وغیرہ کا کام سنبھالا تھا اس کی زیرِ نگرانی لگ بھگ ہر سال ایک اعلیٰ معیار کا لکچر یا مقالہ پیش کیا جاتا تھا۔ ان خطبات یا مقالہ نگاروں میں ملک اور بیرونِ ملک دونوں جگہوں کے عالم اور ماہرینِ فن

شامل ہوتے تھے۔ **شمس الرحمٰن محسنی صاحب** نے ہندوستانی علما اور ماہرینِ فن کے جو نام اس سلسلے میں گنائے ہیں وہ ہیں' **پروفیسر وہاج الدین، غلام یزدانی**: ڈائرکٹر آثارِ قدیمہ **شمس العلماء مولانا عبد الرحمٰن، خواجہ غلام السیدین، قاضی عبدالغفار، مولانا سلیمان ندوی، ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین** اور **مولانا اسلم جیراجپوری۔ محسنی صاحب** نے آگے بیان کیا:

> باہر سے جن لوگوں کو ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی مدد سے ان توسیعی خطبات کے لیے بلایا گیا وہ تھے ترکی کے مشہور رہنما حسین رؤف بے...... (چار لیکچرس)...... ترکی کے مشہور عالم بھجت و ھبی (اسلام کے عروج و زوال پر چار تقریریں)...... اور ترکی کی مشہور عالم خاتون خالدہ ادیب خانم جنھوں نے مشرق مغرب کی کشمکش پر آٹھ لیکچرس دیے۔[۱۶]

ان جلسوں کی صدارت کے سلسلے میں بھی جو نام نظر آتے ہیں وہ خود ہندوستان کی نامور شخصیتیں تھیں۔ ان میں **مہاتما گاندھی، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر اقبال، بھولا بھائی ڈیسائی، مسز سروجنی نائیڈو اور ڈاکٹر بھگوان داس** وغیرہ کے نام شامل تھے۔

جامعہ اسٹور

یہ ادارہ ۱۹۴۷ء کے بعد **امدادِ باھمی** (کوآپریٹو) بنیادوں پر **جامعہ** کی آبادی کی گھریلو ضروریات پوری کرنے کے لیے قایم کیا گیا تھا۔ اس کے نگراں **محمد شبیر ندوی صاحب** تھے۔ بعد میں اس ادارے کی تو اتنی اہمیت نہیں رہی جتنی اس جگہ کی ہوگئی جہاں یہ واقع تھا۔ **مدرسہ ابتدائی اور ثانوی** کے لگ بھگ مخالف سمت میں سڑک کے پار جہاں اس وقت **ایڈ منسٹریٹو بلاک** کا مین گیٹ ہے، اس پورے علاقے کا نام **جامعہ اسٹور** ہوگیا تھا کیونکہ یہیں اسٹور کی دکان واقع تھی اور اس کے اغل بغل کچھ ہوٹل اور مختلف چھوٹی بڑی بے ڈھنگی دکانیں آہستہ آہستہ ابھر آئی تھیں جس نے اس علاقے

کو **جامعہ** کا ایک مرکزی مقام ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بھونڈا سا مقام بھی بنادیا تھا جو کسی تعلیمی ادارے، خصوصاً **جامعہ** کے شایانِ شان نہیں تھا۔ موجودہ **شیخ الجامعہ سید شاہد مہدی** نے بہت بروقت اس طرف توجہ دی اور یہاں سے وہ تمام ناگوار خاطر اثرات کو یکسر ختم کر دیا۔ اب یہ علاقہ ایک پر سکون تعلیمی ادارے میں داخل ہونے کا تاثر پیدا کرتا ہے۔

جامعہ اسکاؤٹس

اسکاؤٹنگ کی اسکیم **جامعہ علی گڑھ** میں ۱۹۲۳ء سے ہی شروع کر دی گئی تھی مگر شاید اس کا نام **جامعہ اسکاؤٹنگ** بعد میں پڑا، کیونکہ **عبدالغفار مدہولی صاحب** نے جب پہلی بار اس کا ذکر کیا ہے تو صرف اتنا لکھا ہے:

> ...... تربیت جسمانی کے سلسلے میں اسکاؤٹنگ
> کی ابتدا بھی ہوئی۔[۷]

اس وقت اس کے نگراں **جامعہ** کی جانی پہچانی ہستی **حامد علی خاں صاحب** تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس کے بعد اس کے کاموں میں شاید کچھ عرصے کے لیے بہت زیادہ تحریک نہیں رہی تھی لیکن ۳۹-۱۹۳۸ء میں **غفار صاحب** نے پھر اس کا ذکر کیا ہے۔ غالباً اسی سال سے اس تنظیم کی سب سے متحرک شخصیت **اخلاص احمد صدیقی صاحب** کا نام آنا شروع ہوجاتا ہے جو **ہندوستان اسکاؤٹ ایسوسی ایشن** سے تربیت یافتہ تھے اور غیر معمولی طور پر فعال اور متحرک شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے زمانے میں ایک ایک دو دو ہفتے کے اسکاؤٹنگ کیمپس، کیمپ فائرز، گاؤں میں سماجی اور صحت وصفائی کا کام اور اسکاؤٹنگ کی ٹریننگ بڑی دل چسپی پیدا کرتے تھے۔ **ڈاکٹر دھرمیندر ناتھ** نے اس وقت کو یاد کرتے ہوئے بتایا:

> جامعہ اسکاؤٹس کا میں خاص طور پر ذکر کرنا
> چاہوں گا، کیونکہ میں اب بھی اسکاؤٹس سے
> منسلک ہوں......جہاں تک سوال ہے اپنے جامعہ
> اسکاؤٹس کا تو اس کے اندر اخلاص احمد

صدیقی صاحب کا نام میرے ذہن میں ہے . تو وہ
کیمپ لے گئے ہمارا نجف گڑھ کے پاس......لیکن
رات کی ڈیوٹی لگتی تھی گھومنے پھرنے کی۔ اور
ٹارچ لے کر ہم پھرے داری پر رہتے تھے۔ اور وہ
روٹیاں بنائیں کہ جغرافیہ تو کبھی نہیں سیکھ
سکے نقشہ بنانا سیکھ گئے . وہ پہلا کیمپ میں
نے Attend کیا ۱۹۴۵ء کے آس پاس ......مجھے
راشٹرپتی نے نوازا ہے اسکاؤٹس کے...... تو اس
وقت بھی میں نے کہا کہ ۴۵ء سے جامعہ میں، میں
نے کام شروع کیا ہے......

۱۹۴۶ء میں جامعہ کی پچیس سالہ جوبلی میں **جامعہ اسکاؤٹس** نے اپنے انتظامی امور کی دھاک بٹھادی اور یہ تنظیم آہستہ آہستہ اتنی پھیلی کہ شہر کے اسکول، تعلیمی مرکز میں اس کا کافی مضبوط مرکز بنا اور شہر میں مختلف جگہوں پر اس کے نونہال، نوخیر اور نوجوان دستے قایم تھے۔ **اخلاص احمد صدیقی صاحب** کے ساتھ ایک اتنی ہی متحرک اور فعال شخصیت، **قیصر نقوی** بھی مصروفِ کار تھے۔ ان دونوں نے کچھ اور ساتھیوں کے ساتھ مل کر صرف دھلی کے گردونواح میں ہی اسکاوٹ کیمپ نہیں کیے، ۱۹۴۶ء میں شملہ اور ۱۹۴۷ء میں نینی تال کیمپ بھی منظّم کیے جو اپنے تنظیمی اور لڑکوں کے لیے تربیتی اعتبار سے بے حد منظّم اور مفید تھے۔

میری ذاتی خوش نصیبی تھی کہ میں ۴۷-۱۹۴۴ء کے درمیان تمام کیمپوں میں شامل رہا اور اس تربیت نے جتنا زندگی میں Contribute کیا اس کی قدر کو زندگی بھر محسوس کیا اور اس کا لطف اٹھایا۔ اصل میں **جامعہ اسکاؤٹنگ تربیت** محض جسمانی مستعدی اور چستی اور ذہنی تربیت کے مواقع ہی نہیں فراہم کرتی تھی بلکہ اس کے ضابطے اور قواعد اس طرح سے بنائے گئے تھے کہ بچوں میں اسی عمر سے کچھ انسانی اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کی بنیاد بھی پڑ جائے۔ مجھے یاد ہے کہ نونہال اسکاوٹ کو جو عہد کروایا جاتا تھا اس میں اس قسم کے وعدے بھی شامل تھے...... کہ میں ہر بات سچی سچی بیان کروں گا، میں ہر وقت کسی بھی

انسان کی مدد کے لیے مستعد رہوں گا، میں دن بھر میں کم سے کم ایک کام جان بوجھ کر نیکی کا کروں گا، وغیرہ وغیرہ۔

اسی **اسکاؤٹنگ** نے لڑکوں میں صحت مند مقابلے کی ایک روح پیدا کی، ہر حال میں کام کرنے کے لیے تیار رہنے کا جذبہ اور اس کی راہیں اختراع کرنے کا ذہن بنانا، ضرورت مندوں اور محتاجوں کی مدد کرنا، ہر طرح سے چاق چوبند رہنا وغیرہ وغیرہ نہ جانے کتنی قابلِ قدر خصوصیات اپنے ممبروں میں پیدا کر دیں۔ ۱۹۴۷ء میں **پرانا قلعہ** اور **ہمایوں رفیوجی کیمپ** کے رضا کاروں میں جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے، **اخلاص احمد صدیقی** اور **قیصر نقوی** کے علاوہ اور بھی کئی لوگ ایسے تھے جو **جامعہ اسکاؤٹس** کے تربیت یافتہ تھے۔

جامعہ فاؤنڈری

۱۹۴۷ء کے بعد اس علاقے میں جہاں اب **آرٹس انسٹی ٹیوٹ** کی عمارتیں ہیں لڑکوں کو ابتدائی تکنیکی پیشہ ورانہ ٹریننگ دینے کے لیے ایک **جامعہ فاؤنڈری** قایم کی گئی تھی جس کے انچارج ایک امریکی کارکن **مسٹر بینہم** تھے۔ مجھے افسوس ہے کہ اس کے بارے میں کوئی خاص معلومات حاصل نہ کر سکا۔ بہر حال اس میں اسکول کے اوقات کے بعد **مدرسہ ثانوی** اور کالج کے کچھ لڑکے لوہے اور دوسری دھاتوں سے چیزیں ڈھالنے اور کل پرزوں کی تربیت حاصل کرتے تھے۔

جامعہ ڈیری

جامعہ کو ایک خود کفیل ادارہ بنانے کے لیے یہ شعبہ کاروباری بنیادوں پر ۱۹۴۳ء میں قایم کیا گیا تھا۔ اس کو ڈھنگ سے چلانے کے لیے **جامعہ** نے اپنے ایک گریجویٹ طالبِ علم **ظفر علی منصوری** کو **الہ آباد** ٹریننگ کے لیے بھیجا اور **آٹھ ہزار روپے** کے سرمایے سے ۱۹۴۴ء سے انھوں نے اس ادارے کو پورے کاروباری اصولوں پر چلانا شروع کر دیا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد بھی یہ کچھ عرصے تک کام کرتا نظر آیا اور **جامعہ** کے مطبخ میں یہیں سے دودھ سپلائی ہوتا تھا۔ پھر بعد میں یہ ادارہ ختم ہو گیا۔

جامعہ کالج

جامعہ کے ہنگامی قیام کے وقت حقیقت میں سب سے پہلے **کالج** ہی وجود میں آیا۔ کچھ لڑکے جو **علی گڑھ کالج** میں پڑھ رہے تھے، وہ جب وہاں سے اپنی تعلیم چھوڑ کر آئے تو جلدی ہی ان کی تعلیم کا انتظام کیا گیا۔ یقیناً، شروع میں اس میں تنظیم کی کمی تھی، پھر **خلافت تحریک** اور **ترکِ موالات** وغیرہ کے سیاسی اثرات ان نوجوان طالبِ علموں اور ان استادوں پر بہت زیادہ تھے اور بقول ذاکر صاحب:

> جامعہ کالج میں اقبال کے 'اسرار خودی' اور 'رموز بے خودی' پر مولانا محمد علی کے لکچرس ہوا کرتے تھے، مگر بہت جلدی کالج کی کلاسوں کو ایک مستقل اور منظم نظام عطا کر دیا گیا۔

جامعہ کالج کے طالبِ علموں کو چونکہ ذہنی طور پر اس طرح تیار کیا جاتا تھا کہ انھیں سرکاری خدمات انجام نہیں دینی ہیں بلکہ ملک اور قوم کی ترقی کے منصوبوں میں بہت تعمیری انداز میں شامل ہونا ہے، اور چونکہ ہر طالبِ علم کو یہ معلوم تھا کہ اس کی ڈگری کسی سرکاری ادارے میں اور نہ آگے تعلیم کے لیے منظور ہے، نہ سرکاری ملازمت کے لیے، اس لیے با قاعدہ Recognition حاصل ہونے سے پہلے اس میں طالبِ علموں کی تعداد بہت کم رہتی تھی۔ مگر اس کم تعداد کی وجہ سے اور انھیں بہترین اساتذہ **مولانا اسلم جیراجپوری**، **ڈاکٹر ذاکر حسین**، **ڈاکٹر عابد حسین**، **پروفیسر محمد مجیب**، **پروفیسر محمد عاقل**، **ای جے کیلاٹ**، **محمد سرور** اور **ابوالکاظم قیصر زیدی** وغیرہ وغیرہ کی پوری توجہ حاصل ہونے کی وجہ سے جتنے بھی طالبِ علم یہاں سے نکلے وہ نہ صرف ایک خاص ذہنی آزادی کے حامل تھے، اور غیر ملکی حکومت سے غالباً بلا استثنا ایک باغیانہ طبیعت رکھتے تھے، بلکہ اپنے چنے ہوئے میدانوں میں ایک غیر معمولی استعداد کے بھی مالک ہوتے تھے۔

شمس الرحمٰن محسنی نے **جامعہ کالج** کے نصاب کے بارے میں بتایا:

> جامعہ کالج میں طلبہ اور اساتذہ دونوں کی تعداد کم تھی، اس لیے کالج میں ایک ایسا نصاب

> جاری رکھا گیا جو ان طلبہ کے لیے مفید ہو جو آگے چل کر معلّمی یا صحافت کی تربیت حاصل کرنا چاہتے ہیں …… جامعہ کالج سے فراغت پا کر طالبِ علم اخبار نویسی یا معلمی کا پیشہ اختیار کر لیتے تھے۔ یا پھر دوسرے قومی اداروں میں کام کرنے لگتے۔ جامعہ کے بہت سے پرانے طالب علم ہندوستان سے باہر کی یونیورسٹیوں میں رہ کر اعلیٰ تعلیمی ڈگریاں حاصل کر لیتے اور واپس آکر ہندوستان کے اعلیٰ تعلیمی اداروں سے وابستہ ہو جاتے۔[۱۸]

اس میں شک نہیں، خود جامعہ میں ہی بحیثیت کارکن شامل ہوجانے والوں کے علاوہ جامعہ سے نکلے ہوئے جو چند نام اس وقت بھی مجھے یاد آرہے ہیں وہ اپنے اپنے میدانوں میں ایک مخصوص اہمیت کے حامل تھے۔ جیسے **ڈاکٹر محمد اشرف**، **پروفیسر محمد علیم**، **پروفیسر حلیم ندوی**، **رانا جنگ بہادر** (صحافت) **پروفیسر مشیر الحق** (وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی) **شفیق الرحمٰن قدوائی**، **سید حسن صاحب** (بانی انسان اسکول، بہار) **ڈاکٹر مجاہد حسین زیدی**، ھائیڈل برگ یونیورسٹی (جرمنی) **معین الدین حارث** (ایڈیٹر: روزنامہ اجمل' روزنامہ) **ایوب سید** (ایڈیٹر: کرنٹ) **یوسف جامعی** (ایڈیٹر: شاھراہ) **حامد علی خاں** (مکتبہ جامعہ) کے **سی۔نائر** (سیاسی میدان) **حسین حسان صاحب** (ایڈیٹر: پیامِ تعلیم) **فیاض حسین جامعی** (موجد تعلیمی تاش) وغیرہ یہ تو چند نام ہیں ورنہ ہمارے ایک جواب دہندہ **حسن ثانی نظامی** کے قول کے مطابق اگر اوسطاً دیکھا جائے تو جامعہ کی ذہنی تربیت ایسی ہی تھی کہ یہاں سے جو لوگ نکلتے تھے وہ ایک اعلیٰ مقصد اور ہدف ذہن میں لے کر نکلتے تھے اور عام طور پر اپنے میدانوں میں کافی اہم Contribution چھوڑتے تھے۔

کالج کے طریقۂ تعلیم کے انداز پر **ڈاکٹر مجاہد حسین زیدی** کا تفصیلی بیان دلچسپی کا حامل ہے

لیکن یہاں مختصر شمس الرحمٰن محسنی کے حسبِ ذیل بیان سے بھی کچھ اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

...... استاد اپنے لکچروں کے ذریعے نصاب کے ایک مقررہ حصے کو ختم کرنے کے بعد طلباء کو ہدایت کرتے کہ وہ اس موضوع پر مختلف کتابیں پڑھیں اور ایک مقررہ مدت میں ایک مضمون لکھ کر استاد کو دکھلائیں اور اس کے مشورہ کے مطابق مضمون کے نقائص دور کریں۔ یہ سلسلہ نصاب کے ختم ہونے تک برابر جاری رہتا۔ اس طرح ہر طالب علم کو موقع ملتا کہ وہ اپنے پڑھنے لکھنے اور سوچنے کی صلاحیتوں کو ساتھ ساتھ ترقی دیتا رہے۔ نصابی تعلیم کے علاوہ اس کی بھی کوشش کی جاتی تھی کہ ہر طالب علم غیر نصابی سرگرمیوں میں شریک ہو اور اس طرح اپنی مل جل کر کام کرنے کی صلاحیتوں کو اجاگر کرے۔[۱۹]

جامعہ کیمیکل انڈسٹریز

یہ ادارہ فی الحقیقت ایک کثیر المقاصد ادارہ تھا۔ اس میں جامعہ والوں کی ضرورت کی کچھ چیزیں کاروباری اور بیوپاری اصولوں پر تیار کی جاتی تھیں، جن کے بنانے میں لڑکوں کی تربیت بھی ہوتی تھی اور ان کی کچھ آمدنی بھی ہوتی تھی۔ یہ ادارہ مدرسہ ثانوی کی کیمسٹری لیباریٹری سے ملحق تھا اس لیے چیزیں بنانے اور تجربات کرنے میں بھی سہولت ہوتی تھی۔

عبدالغفار مدہولی صاحب نے ۳۸-۱۹۳۷ء کے احوال میں اس کے بانی **علی احمد صاحب** (حیاتی رکن جو ۱۹۴۷ء کے بعد پاکستان چلے گئے تھے) اور **جامعہ کیمیکل انڈسٹریز**،

کیمسٹری لیباریٹریز وغیرہ کا تعارف اس طرح کرایا ہے:

علی احمد صاحب جامعہ کے سابق طالبِ علم اور سائنس کے استادھیں معلوماتِ عامہ کے مضمون سے خاص دلچسپی ھے۔ معمل حکمیات (کیمسٹری لیب) سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آپ نے اپنے شاگردوں سے کئی چیزیں بنوائی ھیں۔ گویا یہ جامعہ کیمیکل انڈسٹریز کے نام سے انھیں فروخت کرنے کا انتظام بھی ھے۔ چیزوں کے انتخاب میں اس بات کا خیال بھی رکھا گیا ھے کہ لڑکے اپنے روز مرہ کے کام کرتے ہوئے انھیں آسانی سے بنا لیں۔ اب تک روشنائی، منجن ، ویسلین ، مچھر بچاؤ تیل، آئس کریم کا سفوف رائج ہوئے ھیں۔[۲۰]

عبیدالحق صاحب نے علی احمد صاحب اور سائنس کی تعلیم کے بارے میں بات کرتے ہوئے بتایا:

......بہر حال، وہ سائنس پڑھاتے تھے، سائنس تو پڑھائی ھی مگر انھوں نے سائنس کو Practical بنا دیا۔ مختلف چیزوں کاProduction با قاعدہ انھوں نے شروع کر دیا تھا۔ جس کو Jamia *Chemical Industries* کھا جاتا تھا ، جس میں بہت ساری چیزیں جام ، جیلی مکھن وغیرہ بنتے تھے۔ پنڈت جی (جواھر لال) کو بڑا شوق تھا اس کا۔ وہ ضرور منگواتے تھے۔ پیکٹ بھیجا جاتا

تھا۔ہمیں یاد ہے اب تک۔

بہرطور، یہ ادارہ ہر طرح سے ایک مفید ادارہ تھا۔لگ بھگ پانچویں دہے کے آخر تک کام کر کے یہ بھی جامعہ کی تاریخ کا حصہ ہو گیا۔

جامعہ لاری

گو کہ اسے کوئی باقاعدہ شعبہ کہنا تو ضرور کچھ عجیب سا محسوس ہوگا مگر جامعہ کی زندگی میں اپنی بس، جسے **جامعہ لاری** کہا جاتا تھا اس کا اتنا Contribution رہا ہے کہ اسے جامعہ کی شہ رگ کہنا مناسب ہوگا۔قرول باغ میں شہر کے مختلف کونوں سے طالبِ علموں کو لانے لے جانے کے علاوہ تمام پکنکوں اور کیمپوں میں اس کا سہارا لینا، اس دور میں، لگ بھگ لازمی تھا۔**ڈاکٹر دھرمیندر ناتھ** نے اپنے انٹرویو میں طالبِ علم کی حیثیت سے اس کے سفر کو بڑے پر لطف انداز میں بیان کیا ہے۔

جامعہ کی **جوبلی تقریبات** میں بھی اس نے اپنے فرائض بساط سے زیادہ ہی نبھائے ،لیکن اس **لاری** کا سب سے بڑا فیض ۱۹۴۷ء میں جامعہ والوں اور دوسرے لوگوں کو قرول باغ سے نکال کر محفوظ جگہوں پر پہنچانے ، **ہمایوں** کے مقبرے اور **پرانا قلعہ** کیمپوں تک رضا کاروں کو پہنچانے اور پناہ گزینوں کے لیے رسد ڈھونے اور اس کے بعد کالکا جی کیمپ سے شرنارتھی لڑکوں کو جامعہ لانے لے جانے میں سب سے زیادہ رہا۔

اس بحرانی دور کے برسوں بعد تک بھی یہ **لاری** جامعہ نگر کے لوگوں کی اس طرح خدمت کرتی رہی کہ ہر جمعہ کی صبح، یہ یہاں سے شہر جانے کے خواہش مند افراد کو جن میں مرد، عورتیں سب شامل ہوتے تھے، جامع مسجد پر چھوڑ دیتی تھی اور شام کو مقررہ وقت پر ان حضرات کو ان کی خریدی ہوئی ہفتے بھر کی رسد کے ساتھ واپس لے آتی تھی، اس کی ضرورت شروع میں تو دھلی کے فرقہ وارانہ ماحول میں جامعہ کے لوگوں کو سفر کے دوران محفوظ رکھنے کی وجہ سے پیش آئی تھی لیکن بعد میں حالات بہتر ہونے کے بعد بھی یہ سہولت لوگوں کو سرکاری بسوں میں دھکے کھانے کے مقابلے میں غنیمت محسوس ہوتی تھی اس لیے بہت بعد تک جاری رہی۔اوپر جس فرقہ وارانہ تلخی کا ذکر کیا گیا یہ محض تصوراتی نہیں حقیقی تھی کیونکہ ہمارے سروے کے سب سے معمر جواب دہندہ **محمد طیب صاحب** نے بیان کیا:

...... یہاں شہر کا تو بہت برا حال تھا...... بسوں
میں لوگ دھکے دیتے تھے، میں ...... بس میں ، ایک
کوئی شرنارتھی ہی ہوں گے، انھوں نے کہا: میاں
جی! پاکستان کب جا رہے ہو؟ میں نے کہا جب
تم دھکے دو گے تبھی چلے جائیں گے۔ جب تک
نہیں دے رہے جب تک تو جا نہیں رہے۔

اس دور کے بعد جامعہ لاری مدرسوں کی پکنک کے لیے وقف ہوگئی اور کبھی کبھی شام کو مغرب کے وقت جامعہ کے دروازے پر جامعہ لاری - زندہ باد، **نورالدین یا زماں خان** (ڈرائیور) زندہ باد کے نعروں کی آواز کے ساتھ داخل ہوتی تھی۔ یعنی کوئی کلاس دن بھر کی پکنک کے بعد خوش خوش جامعہ واپس لوٹ رہی ہوتی تھی۔ اس لاری سے دھلی شہر کے گردونواح میں سوڈیڑھ سومیل متھرا، آگرہ، سوھنا وغیرہ کے دورے بھی ہوجاتے تھے۔ جامعہ کی آبادی بڑھنے، ذرائع آمد ورفت میں بہتری آجانے اور خود اس علاقے میں زندگی کی سہولتیں مہیا ہوجانے کی وجہ سے یہ متحرک ادارہ آخر تاریخ کا حصہ بن گیا۔

جامعہ لائبریری

جامعہ میں کتب خانے کی بنیاد جامعہ کے قیام سے اگلے سال ہی پڑ گئی تھی۔ جامعہ کے طالب علموں اور بہت سے لوگوں نے اپنی ذاتی کتابیں جامعہ کو دینی شروع کردی تھیں۔ **مولانا محمد علی** کی کتابوں کا بیش قیمت ذخیرہ جامعہ کو سب سے پہلے مل گیا تھا۔ ۱۹۲۲ء میں کتابوں کے لیے ایک اپیل شائع کی گئی جس سے بہت سے ذخیرے جامعہ کو حاصل ہوئے۔ ان میں قابلِ ذکر **عبدالمجید خواجہ** اور **ڈاکٹر انصاری** کے نام بھی شامل ہیں۔ یہ جان کر یقیناً حیرت ہوئی ہے کہ جامعہ نے اپنی بے حد عسرت اور بے سروسامانی کے باوجود ۱۹۲۳ء تک **آٹھ ہزار روپے** کی کتابیں خرید لی تھیں اور ہر سال اس مد پر خاصی رقم خرچ کی جاتی تھی۔ اس کے نتیجے میں جامعہ کے پاس اردو کی پرانی کتابوں اور مخطوطوں وغیرہ کا بہت اچھا ذخیرہ جمع ہوگیا تھا۔ ۱۹۴۶ء میں جو بلی کے وقت

جامعہ کے پاس ۲۵ ہزار کتابوں کا ذخیرہ تھا اور قرول باغ میں یہ ایک پبلک لائبریری تھی۔ بہرطور **جامعہ لائبریری** کو ایک غیر معمولی جھٹکا ۱۹۴۷ء میں لگا جب قرول باغ میں اسے آگ لگائی گئی۔ جب وہ کتابیں قرولباغ سے جامعہ آئی ہیں تو کچھ صحیح وسالم، کچھ ادھ جلی اور کچھ بالکل ضائع ہو چکی تھیں۔ اس کی تنظیمِ نو **حافظ نبی احمد صاحب** (جو **حافظ فیاض احمد صاحب** کے بیٹے تھے اور یہ دونوں حضرات جامعہ کے حیاتی رکن تھے) نے کی۔ **حافظ نبی احمد صاحب** کی لائبریری سے محبت اور لائبریری کی کتابوں پر عبور جامعہ میں مثالی مانا جاتا تھا۔

جب کتابیں قرولباغ سے جامعہ نگر آئیں تو جامعہ کے پاس جگہ کی بھی بہت قلت تھی چنانچہ جب تک لائبریری کی موجودہ بلڈنگ نہیں بنی **جامعہ لائبریری** متواتر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتی رہی۔ کچھ عرصے اس کے مختلف سیکشن مختلف جگہوں پر بھی منتقل کرنے پڑے، جس میں **اولڈ بوائز لاج**، **مدرسہ ثانوی** کے کچھ کمرے اور **استادوں کے مدرسے** کے تہہ خانے شامل تھے۔ پھر کچھ عرصے **لائبریری** اس بلڈنگ میں رہی جو **تعلیم و ترقی** کے لیے بنی تھی اور جہاں آج کل **شیخ الجامعہ** اور **رجسٹرار** وغیرہ کے دفتر ہیں۔ بہر نوع، **ذاکر حسین لائبریری** اپنی مستقل اور کافی کشادہ جگہ پر پہنچ گئی ہے اور پچھلے تین چار سال میں موجودہ **شیخ الجامعہ** کی خصوصی کوششوں سے کمپیوٹر کی مدد سے کتابوں کی تلاش اور کیٹلاگنگ کے طریقے میں بہت سہولت پیدا کر دی گئی ہے۔

جامعہ نرسری

جامعہ نرسری کی ابتدا تو ایک طرح سے ۱۹۳۳ء میں ہی اس وقت ہو گئی تھی جب جرمنی سے آئی ہوئی خاتون **مس گیرڈا فلپس بورن** نے **کنڈرگارٹن** کی کلاس شروع کی تھی جس میں انھوں نے خصوصی تربیت حاصل کی تھی اور بچوں سے ان کا پیار اور خلوص مثالی تھا، مگر دوسری جنگِ عظیم کی وجہ سے ان کی نظر بندی، پھر رہائی کے بعد ان کی بیماری اور انتقال سے یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔

جامعہ نرسری اسکول کا دوسرا دور ۱۹۵۶ء سے شروع ہوا۔ اس کی ضرورت کا احساس تو بہت پہلے سے موجود تھا اور **جشنِ سیمین** (۱۹۴۶ء) میں اس کے شروع کرنے کا اعلان بھی کیا گیا تھا

مگر ۱۹۴۷ء میں جامعہ کے ذرائع کے غیر یقینی ہوجانے کی وجہ سے اس کی ابتدا ملتوی ہوتی رہی **جمال فاطمہ صاحبہ** جنھوں نے اپنی پوری مدت خدمتِ نرسری میں ہی گزاری اور آج تک وہ بچے، جواب ادھیڑ ہو چکے ہیں انھیں محبت اور عقیدت سے **ممی، آپا جان یا ممی باجی** کے نام سے ہی یاد کرتے ہیں۔ انھوں نے تفصیل سے نرسری کے بارے میں بتایا:

> لیکن ایک وقت ایسا آیا کہ لوگوں کو یہ محسوس ہوا کہ بچہ جو گھر سے نکل کر ابتدائی میں داخل ہوتا ہے تو اس کا گیپ بھی کم ہونا چاہیے پھر مشیر فاطمہ صاحبہ، وہ اسکول میں پہلی کلاس کی ٹیچر تھیں اور وہ انگلینڈ سے بذات خود ان کو *Madam Montessori* نے *train* کیا تھا...... تو مجیب صاحب کو وہی زیادہ مناسب لگیں۔

بچوں کی تربیت کے انداز کے بارے میں انھوں نے بتایا:

> ...... اس وقت تو تین سال سے کم کے بچے نرسری میں داخل ہو جاتے تھے۔ ہم لوگ *Formal teaching* نہیں کراتے تھے۔ اور آج بھی میں تو یہی کہتی ہوں کہ ساڑھے پانچ سال سے کم عمر بچوں کو بالکل باقاعدہ ٹیچنگ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان کے *Overall Developmet* کے سلسلے میں جو بھی کیا جا سکتا ہے کہ ایسا Equipment مہیا کریں جو ان کے Physical Social Mental Develpment یہ ساری (باتیں) ذہن میں رکھ کر ہی ساری

چیزوں کا انتظام کیا جائے ...... صرف Self
Expressionکے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم
کیے گئے...... *Catalogue*وہ (مشیر فاطمہ) باھر
انگلینڈ سے لے کر آئی تھیں۔ انگلینڈ سے میٹریل
بھی لے کر آئی تھیں......ابھی بھی آپ نرسری
اسکول جائیں تو آپ کو بہت سا ایسا سامان ملے
گا جو ان کا بنوایا ہوا ھے۔

جگہ کی کمی کے باوجود **جامعہ نرسری** کا ماحول بچوں کے لیے اتنا موزوں اور خوبصورت بنایا گیا تھا کہ میں اپنے بچوں کے ذاتی تجربے سے کہہ سکتا ہوں کہ کسی دن بچے کو نرسری نہ بھیجنا بڑا مشکل کام ہوتا تھا۔ نرسری میں چھوٹے قد کے، احتیاط سے اگائے ہوئے پیڑ تھے کہ بچے اس پر چڑھ سکیں، بچوں کے نہانے کے لیے حوضیں اور نل تھے، گڑیا گھر تھے اور ہر وہ چیز تھی کہ جو چھوٹے بچوں میں دل چسپی اور تحریک پیدا کر سکے۔ یہی وجہ تھی کہ ایک بار یہاں دھلی کے مانے ہوئے **نرسری اسکولوں** کے ٹیچرس کا ایک وفد نرسری دیکھنے آیا تھا۔ مجھے ایک صاحب نے بتایا کہ اس وفد کی سربراہ (غالباً) **مسز سوامی ناتھن** کہا کرتی تھیں کہ بچوں کی نرسری کا صحیح تصور صرف **جامعہ نرسری اسکول** میں نظر آتا ہے۔

جامعہ نرسری اسکول کو اب ایک مستقل اور کشادہ جگہ مل گئی ہے اور وہ جگہ ایسی ہی ہے کہ اسے دیکھ کر اپنی عمر کے زیادہ ہو جانے کا اب بھی افسوس ہوتا ہے۔

جمعراتی کلب

یہ **جامعہ** کے اساتذہ کا ایک غیر روایتی سا کلب تھا، جس میں تفریحات، دعوتیں، گانے بجانے کی محفلیں وغیرہ اس کی خاص دلچسپیاں ہوتی تھیں۔ غالباً اس کا کوئی خاص دستورالعمل نہیں تھا اور شروع میں اس کی دعوتیں اس طرح ہوتی تھیں کہ ہر شخص پکا پکایا کھانا اپنے گھر سے لے آتا تھا اور اس طرح مختلف قسم کے کھانے سب مل کر کھاتے تھے۔ اس میں زیادہ تر نوجوان قسم کے اساتذہ شرکت کرتے

تھے اور اس کے جشن جمعرات کی شام کو ہوتے تھے کیونکہ جمعے کو چھٹی ہوتی تھی۔

چڑیا گھر

جامعہ میں مدرسہ ابتدائی میں بچوں کے شوق، دل چسپ اور ذہنی تربیت کے زیادہ سے زیادہ مواقع پیدا کرنے کے سلسلے میں یہاں ایک چھوٹا سا **چـڑیـا گھـر** (ZOO) بھی تھا۔ ۴۰-۱۹۳۹ء کے حالات میں **عبدالغفار مدھولی** نے اطلاع دی کہ اس سال سے یہاں **چڑیا گھر** قایم کیا گیا جس کے انچارج **عتیق احمد صاحب** مقرر کیے گئے۔

> چڑیا گھر کا کام ابھی ابتدائی حالت میں ھے۔ یوں
> سمجھو که ایك کٹیا کے تین حصے کر کے اس میں
> طوطے، مینا، فاخته ، لال خرگوش کے لیے جگه
> نکال لی گئی ھے۔ کبوتروں کی کابك علاحدہ
> ھیں۔ بطخوں کے تیرنے کے لیے چھوٹا سا حوض
> بنا دیا گیا ھے۔[۲۱]

بعد میں یہ حصہ اور زیادہ بہتر ہو گیا تھا۔ اس میں دو ہرن بھی تھے اور چڑیوں کو بہت بڑی جالی لگا کر ایسا قدرتی ماحول اور گرد و پیش دیا گیا تھا کہ وہ آزادی سے اڑ بھی سکیں اور اپنی فطرت کے مطابق اپنے گھونسلے بھی بنا سکیں۔ **خرگوش** بھی کچّی زمین میں آزادی سے اپنے بھٹ بنا سکتے تھے۔ بچوں کی دل چسپی اور جانوروں کے عادات واطوار کی معلومات حاصل کرنے کے لیے محدود ہونے کے باوجود یہ بہت دلچسپ جگہ تھی۔

دلّی میوزیم / ہسٹری کلب / لائن آف ٹائم (ٹائم چارٹ)

دلّی میوزیم جامعہ میں ایک انوکھا ادارہ تھا جسے ابتدا میں جو بلی کے زمانے میں **پروفیسر محمد مجیب** کی ترغیب اور رہنمائی میں قایم کیا گیا تھا۔ چونکہ اس کام میں **مجیب صاحب** کی رہنمائی اور سرپرستی کے علاوہ تمام کام **ڈاکٹر مجاہد حسین زیدی** (جامعہ کے طالبِ علم اور استاد، حال مقیم

جرمنی)اوران کے ساتھ مدرسہ ثانوی کے لڑکوں کا تھا اس لیے مناسب ہوگا کہ اس ادارے کا مختصر تعارف انہی کی زبان میں کر دیا جائے:

...... یعنی وقتی میوزیم مجیب صاحب
نے......جہاں تك دلی کے ادیبوں اور شاعروں کی
کتابیں تھیں ان سب کو جمع کیا تھا ، دلی کی
کچھ مصنوعات ...... جو مجیب صاحب نے جمع
کر لی تھیں اور اس کا نام دلّی میوزیم رکھ دیا
تھا، میں نے جب اپنا کام مدرسہ ثانوی میں
شروع کیا تو یہ دلّی میوزیم تِتّر بِتّر ہو چکا تھا
......میں یہ چاھتا تھا کہ دلّی میوزیم اس طرح سے
بنایا جائے کہ طالبِ علم خود اس میں کام کریں
...... اور تاریخ کا جو سبق ھے وہ اس سے برابر
حاصل کرتے رھیں، بجائے اس کے کہ ھم خشك
کتابوں کا حوالہ دیں ......اس مقصد کے لیے میں
نے ایك ٹائم چارٹ بنوایا جس میں دلّی کی تاریخ
کو مصور کیا گیا تھا اور اس کام کے کرنے میں
میرے تمام شاگردوں کا ھاتھ تھا۔ پھر میں نے دلی
کا ایك بھت بڑا نقشہ بنوایا...... یہ دکھایا کہ دلی
کی تاریخی عمارتیں کھاں کھاں موجود ھیں،
کس کس نے...... کب بنوائیں ......اور جو ضروری
تصاویر ھوسکتی تھیں......وہ سب وھاں نصب
کر دی گئیں۔ اس کے ساتھ ساتھ دلی کے جو
شاعر...... ادیب تھے ان سب کی تصویریں بڑے

سائز پر بنوائیں...... دلّی کی جو تاریخ تھی اس
کو...... طالبِ علموں کی مدد سے چارٹس کی
شکل میں پیش کیا۔

مجاہد صاحب نے ذکر کیا کہ ایک بار **ذاکر صاحب** نے اس کام کو دیکھ کر بے حد تعریف کرنے کے بعد کہا کہ اتنا بڑا کام صرف سیاہ روشنائی سے ہو رہا ہے۔ یہ تو چند دن میں خراب ہو جائے گا تو **مجاہد صاحب** نے کہا کہ اچھے رنگ لانے کے لیے پیسے نہیں ہیں، اس پر **ذاکر صاحب** نے اچھے رنگ دلوا دیے اور اس کام کی خوبصورتی کئی گنا بڑھ گئی۔

......اس کے بعد دلّی میوزیم نکھر نے لگا اور
آہستہ آہستہ وہ ایک ایسی شکل اختیار کرنے
لگا کہ نہ صرف ارباب جامعہ بلکہ جامعہ میں
جو باہر سے مہمان آیا کرتے تھے ان کو لے کر ذاکر
صاحب یا مجیب صاحب......دلّی میوزیم ضرور
دکھاتے تھے۔

ٹائم چارٹ کے بارے میں **مجاہد صاحب** نے بیان کیا:

...... میں نے ایک ٹائم چارٹ بنوایا تھا کوئی
سو فٹ لمبا تھا، Freeze کی شکل کا تھا اور اس
میں ہندوستان کی تاریخ......آریوں کے زمانے سے
لے کر اور موجودہ عہد تک مصور کی گئی تھی۔ ان
صفحوں کو جوڑ نا ھی بہت مشکل کام تھا۔

اس چارٹ کی پوری Length کو **مدرسہ ثانوی** کے تمام برامدوں میں فریم بنوا کر مسلسل لگوا دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ **ہسٹری کلب** تھا جس کے تحت نہ صرف مضمون نویسی اور تاریخ پر گفتگو اور تاریخی مقامات کی تعلیمی سیریں ہوتی تھیں بلکہ کچھ تحقیق و تلاش اور Archeology کا کام بھی ہوتا تھا جس میں طالبِ علموں کی دل چسپی غیر معمولی تھی۔ خود جامعہ سے کچھ دور ایک ٹیلے پر طالبِ علموں

سے کھدائی (*Excavation*) کروایا گیا تھا۔ انٹرویو میں جب میں نے **پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی** کو یاد دلایا تو انھوں نے بتایا:

> ھاں ، ھاں اس میں ایک آئے تھے Olive Prooffer،
> اصل میں یہ تھا کہ چُھٹّی کے دن ھم لوگ گھومنے
> پھرنے ، ٹھلنے نکل جاتے تھے۔ ادھر ادھر۔ تو یہی
> جو گا بائی کی ایک پہاڑی (ٹیلے) پر ... معلوم
> ھوا کہ ایک جرمن کچھ مٹی کرید رھا ھے، پوچھا
> بھئی کیا ھے...... مجاھد صاحب نے اسے پکڑا، اور
> پھر ھم لوگوں کے چُھٹّی کے دن...... ویرانوں میں
> نکل جاتے تھے اور وھاں ڈھونڈتے تھے کہ کوئی
> ایسی چیز مل جائے جو پرانی ھو......

اس سلسلے میں مجھے ذاتی طور پر یاد ہے کہ جو گا بائی کے پاس ٹیلے کی کھدائی (*Excavation*) میں ایک بہت خوبصورت منقش گھڑے کے ٹکڑے، ایک بہت بڑے پیالے کے ٹکڑے جنھیں سائنٹفک انداز سے جوڑ کر اس کے Shape کو لگ بھگ مکمل کرلیا گیا تھا، پتھر کی گیندیں وغیرہ ملی تھیں، جنھیں **دلّی میوزیم** میں ایک علاحدہ گوشے میں سجایا گیا تھا۔

ایسے قابلِ قدر اداروں کے خاتمے پر یقیناً جتنا افسوس کیا جائے کم ہے اور خاص طور پر اس شخص کے دل پر، جس نے دن رات کی جاں فشانی سے انھیں ابھارا ہو، جو بھی گزرے حق بجانب ہے۔ چند سال بعد جب **مجاہد صاحب** نے جرمنی سے واپس آکر کالج میں کام شروع کیا تو حالات بالکل بدل چکے تھے۔ **مجاہد صاحب** کچھ سال کام کرنے کے بعد خاصے دل برداشتہ ہوکر جرمنی واپس چلے گئے۔ کئی سال بعد جب ۱۹۶۹ء میں اپنی ایک ریسرچ کے سلسلے میں وہ جامعہ آئے تو اس وقت ان کا تاثر یہ تھا:

> ...... میں یہ دیکھنے کے لیے کہ دلّی میوزیم کی کیا
> حالت ھے، ایک شام کو ادھر نکل گیا تو پتہ چلا
> (وہ) تو پتہ نھیں کتنے عرصے پھلے ختم ھو چکا

ھے اور ٹائم چارٹ جو مجیب صاحب نے مدرسہ
ثانوی کے برامدوں میں نصب کروایا تھا، وہ اب
بالکل قریب قریب ختم ہو چکا ھے۔ اس کی نگرانی
یعنی نگھداشت کسی نے نہیں کی۔ تو اس کے ایک
طرح پر خچے اڑ گئے۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی تکلیف
ھوئی کہ وہ چیز جس کو میں نے سالوں کی محنت
کے بعد تیار کیا تھا ، یہاں اس کا کچھ خیال نہیں
کیا گیا۔ اس کو ایک طرح ردی کی ٹوکری میں ڈال
دیا گیا۔

فی الحقیقت جامعہ میں کچھ شعبے جو تبدیلیِ وقت وحالات کی نذر ہوئے ان میں دلّی میوزیم بھی ایک بڑا قیمتی ورثہ تھا۔

ڈرامہ۔ ڈرامیٹک سوسائٹی

جامعہ ڈرامے کے میدان میں شروع سے بہت آگے رہی ہے اوراس کے توسط سے کچھ ڈرامے دھلی کے اسٹیج کے لیے یادگار، اوردوایک تو پورے ھندوستان میں جدید اردو ڈرامہ کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ غالبًا اس کی وجوہات میں دو باتیں بہت اہم تھیں۔ پہلی یہ کہ یہاں کا ذوقِ سلیم دوسرے اداروں کے مقابلے میں غالبًا کچھ افراد کی یہاں مستقل موجودگی کی وجہ سے، بہت صاف ستھرا، اورلطیف تھا۔ اور دوسری وجہ شاید یہ تھی کہ یہاں آس پاس کوئی اورتفریحی ذرائع میسر نہیں تھے، اور دور جا کر پکچر دیکھنے یا دوسری تفریحات کے لیے لوگوں کی جیب اجازت نہیں دیتی تھی اور تیسری وجہ ایک یہ بھی تھی کہ ہم اسے کسی طرح بھی کم اہمیت نہیں دے سکتے۔ یہاں کے ایک کارکن، حیاتی رکن، **مدرسہ ابتدائی** کے معمارِاول، **استادوں کے مدرسے** کے ایک اہم رکن، زبانِ **اردو** کی تدریس کے ایک طریقے کے موجد، **عبدالغفار مدھولی** کو ڈرامے سے عشق تھا۔ وہ ایک معمولی معیار کی ناٹک منڈلی چھوڑ کر ھی بحیثیت طالبِ علم گھر سے بھاگ کر جامعہ

آئے تھے۔ گوکہ **غفار صاحب** نہ کوئی بہت بڑے ایکٹر تھے نہ ڈرامہ نویس مگر جامعہ کے بچوں میں ڈرامے کی روح کے بانی وہی تھے اور پھر اس شوق نے بڑھتے بڑھتے پوری جامعہ کو مسحور کرلیا۔ **غفار صاحب** جب ۱۹۲۶ء میں پہلی بار استاد ہوئے (اس سے پہلے وہ محنت مزدوری اور اسکول میں تعلیم حاصل کرنا دونوں کام ساتھ ساتھ کرتے رہے تھے) تو اس سے اگلے سال کے بارے میں لکھا ہے:

> ......مدرسے میں کرنے کے لیے بہت کام تھے۔ قدرتی طور پر سب سے پہلے میرا خیال اس چیز کی طرف گیا جس سے طبیعت کو لگاؤ تھا ......ڈرامہ ...... جامعہ میں اب تک اس کا رواج نہ تھا۔ اس کام کو اس بھونڈے پن سے کرنے کا موقع نہ تھا جیسا کہ مدھول میں ہوتا تھا اور بڑے پیمانے پر کرنا بھی نامناسب تھا کیونکہ اس میں خرابی کااندیشہ تھا۔ [۲۲]

چنانچہ سب سے پہلے **غفار صاحب** نے بارش اور بادل کا ایک مکالمہ لڑکوں سے تیار کروایا اور ساز وسامان کے ساتھ اس کا ایک باقاعدہ شو اسکول کے آخری گھنٹے میں سارے اسکول کے لڑکوں اور اساتذہ کے سامنے کیا۔ اس طرح جامعہ میں ڈرامے جیسی کسی چیز کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ **غفار صاحب** کو معلوم تھا کہ بقول ان کے:

> اس وقت تک ہمارے ملک میں تم لوگوں کے لیے ایک دو ھی ڈرامے لکھے گئے تھے ......سوچا کہ ایسی ایسی باتیں اقامت گاہ میں ہوتی رہتی ہیں، کیوں نہ ان ھی واقعات کا ڈرامہ تیار کریں چنانچہ پہلی دفعہ 'کاھل طالبِ علم' کے نام سے ایک ڈرامہ لکھا ('کایا پلٹ' کے نام سے مکتبہ

جامعه نے شائع کیا ھے)۔ [۲۳]

یہ **ڈراما** پہلی بار **جامعہ** میں ۱۹۲۷ء میں پیش کیا گیا تھا۔ اس کے بعد سے **ڈراما** اور **ڈراما** کاری کا شوق اور عمل اتنا بڑھا کہ ایک طرف **ڈاکٹر ذاکر حسین** اور **ڈاکٹر عابد حسین** تک نے **ڈرامے** لکھے اور **مجیب صاحب** نے تو اپنے وقت کے **معرکۃ الآراڈرامے** لکھے اور دوسری طرف ایسے ایسے لوگوں نے **ڈراموں** میں کام کیا جن کے نام سن کر اب یقین بھی نہیں آتا۔ **جامعہ** کے چھوٹے بڑے **ڈراموں** میں کام کرنے والوں میں **پروفیسر محمد مجیب**، **پروفیسر علیم**، **پروفیسر مسعود حسین خاں**، **اخلاق الرحمٰن قدوائی**، **شفیق الرحمٰن قدوائی**، جیسی پہلی نسل والی شخصیتوں تک کے نام آتے ہیں۔ دوسری نسل میں **حافظ نبی احمد صاحب** (حیاتی رکن) **عبداللطیف اعظمی**، **ڈاکٹر سید حسن**، **ڈاکٹر مجاہد حسین زیدی**، **عبیدالحق صاحب**، **مسعودالحق صاحب**، **نذیرالدین مینائی**، **ضیاءالحسن فاروقی**، **شکیل اختر فاروقی**، **صغرا مہدی**، **عذرا مجیب**، **سعیدہ سلامت** اور **ادیبہ خانم** وغیرہ کے نام نظر آتے ہیں۔

پروفیسر محمد مجیب نے نہ صرف انجام، خانہ جنگی، **حبّہ خاتون**، ہیروئن کی تلاش وغیرہ بڑوں کے لیے **ڈرامے** لکھے بچوں کے لیے بھی **ڈرامے** لکھے اور تیار کروائے، انھوں نے بچوں کے لیے **ڈراما** کرنے کا آسان طریقہ اور خصوصاً اسٹیج کی تکنیک پر ایک چھوٹی سی، بالکل سیدھی سادی زبان میں آؤ ڈراما کریں، کتاب بھی لکھی ہے، وہ خود بہت اچھا میک اپ بھی کرتے تھے، اسٹیج سیٹنگ بلکہ لکڑی کے سیٹ تیار کرنے کے شوقین تھے اور چونکہ لکڑی کے کام سے واقف تھے اس لیے اس کام میں دوسروں کے ساتھ برابر کے شریک رہتے تھے۔ **مسعودالحق صاحب** نے بچوں کے ایک ڈرامے کی تیاری کے بارے میں بتایا:

> پتہ چلا کہ ڈرامہ ہونے والا ھے، مجیب صاحب بھی اس میں...... سیٹ بنانا تھا...... مجیب صاحب آئے۔ تو ایک کیل لگی تھی دیوار پر، اس پر انھوں نے اپنی شیروانی ٹانگی...... ایک ڈبہ تھا جس میں کیلیں اور ھتھوڑی وغیرہ تھیں، وہ انھوں نے لے کر جہاں جہاں ٹھوکنی تھیں......

مسعود صاحب نے ہی ایک اور ڈرامے آگرہ بازار، جو دھلی ہی نہیں ہندوستانی اسٹیج کے بہترین ڈراموں میں مانا جاتا ہے، اس کے بارے میں بتایا:

> ہاں تو اطہر پرویز صاحب نے کہا کہ یار حبیب (تنویر) سے کہا جائے۔ وہ بمبئی میں تھے۔ ان کو بلاتے رہے، وہ آئے نہیں بہت دن تک۔ (یومِ نظیر کے) دس یا بارہ دن پہلے آئے لیکن خیر پھر وہ آدمی لگا......
>
> (آگرہ بازار' میرے خیال میں یہاں کا سب سے بڑا ڈرامہ تھا...... یا تو خانہ جنگی ......)

خانہ جنگی' ڈرامے کے بارے میں جشنِ سیمیں کے سلسلے میں **مجاہد حسین زیدی** کے تاثرات پہلے پیش کیے جا چکے ہیں جن سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ کس پائے کا ڈرامہ تھا۔ جامعہ کے ڈراموں کے سلسلے میں غیر جامعی دو تین حضرات کے بیانات اور قابلِ ذکر ہیں، جن سے جامعہ میں ڈرامے کی Activity سے پیدا ہونے والے اثرات اور ان کے مجموعی Contribution کا اندازہ ہوتا ہے۔

پروفیسر نذیر الدین مینائی نے بتایا:

> آپ یہ دیکھیے کہ اس تنگی ترشی کے زمانے میں۔ اس زمانے میں جامعہ کی ثقافتی زندگی...... اتنی Rich تھی...... ڈرامہ سوسائٹی ایک ہوا کرتی تھی۔ اساتذہ کے لیے ھی تھی وہ ......ہم جس ماحول سے آئے تھے وہ جامعہ ملیہ سے بالکل مختلف تھے وہ سرکاری ادارہ تھا۔ لیکن یہاں جو ہم نے آکے دیکھا تو جناب وائس چانسلر صاحب بھی موجود ہیں اور پرنسپل صاحب بھی

موجود ہیں۔ اور بہر حال اساتذہ تو ہیں ہی۔ Male Roles میں ہم، کارکن، اساتذہ، دفتر میں کام کرنے والے، مدرسہ ثانوی، مدرسہ ابتدائی، کالج ، رورل انسٹی ٹیوٹ سب سے آتے تھے......

پروفیسر رفاقت علی خاں نے جامعہ کے ڈراموں کے بارے میں اس وقت کے اپنے شوق کو بیان کیا ہے جب وہ علی گڑھ کے طالب علم تھے اور جامعہ کے میلوں میں صرف ڈرامے دیکھنے علی گڑھ سے آتے تھے۔

......مثال کے طور پر اس میلے میں ڈرامے ہوتے تھے جو شام سے شروع ہوتے تھے اور رات کو گیارہ ساڑھے گیارہ بجے ختم ہوتے تھے۔ ہمیں رہنے کے لیے لاجپت نگر میں جگہ ملتی تھی۔ تو ہم رات کو پیدل جاتے تھے لیکن یہ نہیں ہوسکتا تھا کہ یہاں ڈرامہ ہو رہا ہو اور ہم ڈرامہ چھوڑیں کہ ہمیں پیدل آنا پڑے گا......

پروفیسر مجیب رضوی نے جامعہ کے ڈرامے کو ایک دوسرے رخ سے بیان کیا:

اسی طرح سے آپ کے جو یہ میلے ہوتے تھے جس میں آپ تین دن میں پوری دلی کو سمیٹ لیتے تھے اور کوئی ایسا آدمی جس کی کوئی حیثیت ہو دلی میں وہ جامعہ نہ آئے ، یہ ممکن نہیں تھا۔ لیکن دھیرے دھیرے اب اس میں Interest کم ہوتا جارہا تھا...... تو آخری کیل (اس میں) جب گڑی جب ڈرامے، جو یہاں کی ایک مثال ہوا کرتے

تھے، جن کا بہت Contribution تھا...... جس کے
اوپر اگر آپ ہسٹری لکھ رہے ہیں تو *That*
Should be given enough space کہ کیا
Contribution رہا ہے جامعہ کا۔ مطلب صرف
جامعہ نے ڈرامہ نہیں کیا، جامعہ نے As a tool
of education **ڈراما** کو استعمال کیا......

ڈرامے یوں تو لگ بھگ سارے ادارے ہی کرتے تھے مگر یہاں ایک تو خاص **جامعہ ڈرامیٹک سوسائٹی** تھی جو بڑے Full Lenghth **ڈرامے** کرتی تھی جو ادبی اور ڈرامائی دونوں حیثیت سے اعلیٰ معیار کے ہوتے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی ایک **ڈراما** ہمیشہ دیہی مزاج کا بھی ہوتا تھا جس میں ہندوستان، خصوصاً دہلی کے دیہات کے کسی مسئلے پر **ڈراما** تیار کیا جاتا تھا۔ اس کا پورا ماحول، اسٹیج کی تیاری، لباس، ڈائیلاگ تمام دیہی پس منظر میں تیار ہوتے تھے۔ اس کے لکھنے اور تیار کروانے والے **جامعہ** کے قدیم طالبِ علم **عبدالستار صاحب** تھے (جو ابھی بقیدِ حیات ہیں مگر صحت کی وجہ سے ہماری کوشش کے باوجود اس سروے میں شرکت نہیں کر سکے) **ستار صاحب** نے اپنی پوری زندگی کو دیہی رنگ میں ڈھال لیا ہے اور اس کے مسائل سے عملی روپ میں بخوبی واقف ہیں۔ ان دیہی ماحول کے ڈراموں کا دلّی اور آس پاس کے گاؤں میں اتنا چرچا تھا کہ کبھی کبھی انھیں **جامعہ** سے باہر بھی پیش کرنے کا موقع مل جاتا تھا اور ان کی وجہ سے **جامعہ** کو آس پڑوس کے گاؤں کی بہت Good Will حاصل تھی۔ ذاتی طور پر خود میں نے **جامعہ ڈرامیٹک سوسائٹی** کے بڑے اور معیاری ڈراموں سے کہیں زیادہ دیہی ڈراموں میں حصہ لیا۔

افسوس ہے کہ آبادی کے بڑھنے اور **جامعہ** کی توسیع سے جو انتظامی قسم کے مسائل بڑھے اور ثقافتی زندگی میں جو عمومی انحطاط آیا، **جامعہ** کا یہ ایک قابلِ قدر ادارہ اس کی نذر ہو گیا۔

رورل انسٹی ٹیوٹ / رورل سروسز / رورل انجینئر نگ / جامعہ پالی ٹیکنک

۱۹۵۶ء میں **رورل انسٹی ٹیوٹ** یا شعبہ **رورل سروسز** کے نام سے ایک ادارہ

جامعہ میں کھلا۔ یہ پہلا ادارہ تھا جس کے مالی ذرائع پورے طور پر **حکومتِ ہند** **جامعہ** کو دیتی تھی، بلکہ فی الحقیقت حکومت کے قایم کردہ چودہ **رورل انسٹی ٹیوٹس** میں سے یہ ایک **انسٹی ٹیوٹ** تھا جسے **جامعہ** کو سونپا گیا تھا۔

کچھ عرصے پہلے **جامعہ** نے اپنے طور پر ۱۹۵۲ء میں ایک ادارہ **زرعی معاشیات اور دیہی سماجیات** ،قایم کیا تھا۔ یہ ادارہ اس تصور کے تحت قایم ہوا تھا کہ **جامعہ** کو ایک **رورل یونیورسٹی** میں تبدیل کر دیا جائے۔ **جامعہ** کو **رورل یونیورسٹی** بنانے کے تصور کو **جامعہ** کے عبوری دور کی سوچ کی ایک علامت کہا جا سکتا ہے، جب آزادی کے بعد اس کی سمت متعین کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ اس کی اسکیم **جامعہ** کے حیاتی رکن **پروفیسر محمد عاقل صاحب** نے تیار کی تھی جو اس سے پہلے ان معاملات کا جائزہ لینے **انگلستان** بھی بھیجے گئے تھے۔ بہرطور **دیہی یونیورسٹی** کی یہ تجویز مالی وسائل کی کمی کی وجہ سے کچھ تحقیقی پروجیکٹس سے آگے نہ بڑھ سکی اور **جامعہ** کو UGC کی گرانٹ ملنے کے بعد یہ پروجیکٹس بھی بند ہو گئے۔

رورل انسٹی ٹیوٹ کے دو حصے تھے **ڈپارٹمنٹ آف رورل سروسز** اور **ڈپارٹمنٹ آف رورل انجینئرنگ** ۔ **رورل انسٹی ٹیوٹ** کے گریڈس چونکہ سرکاری گریڈس تھے اس لیے اس کے اساتذہ کو **جامعہ کالج** اور دوسرے اداروں سے زیادہ تنخواہیں ملنی چاہیے تھیں۔ لیکن **جامعہ** کے دوسرے ہم رتبہ ملازمین کی تنخواہیں کم ہونے کی وجہ سے انھیں منظور شدہ اسکیل میں کچھ کٹوتی کر کے تنخواہ دی جاتی تھی۔ اس سے **جامعہ** کے اساتذہ اور **رورل انسٹی ٹیوٹ** کے اساتذہ کے درمیان ایک کشمکش اور بد دلی سی پیدا ہو گئی تھی اور **رورل سروسز** کے اساتذہ کسی حد تک احساسِ برتری محسوس کرنے لگے تھے۔ اس حقیقت کا اعتراف ہمارے سروے میں شریک حضرات نے بھی کیا ہے۔ بعد میں جب **جامعہ** کو UGC کی منظوری مل گئی اور **رورل انسٹی ٹیوٹ** کی اسکیم کمزور ہونے لگی تو اس **انسٹی ٹیوٹ** کے اساتذہ **جامعہ** کے مختلف شعبوں میں منتقل ہو گئے اور کچھ عرصے کے بعد **ڈپارٹمنٹ آف رورل سروسز** نے **ڈپارٹمنٹ آف سوشل ورک** کا روپ اختیار کر لیا اور **رورل انجینئرنگ** کا شعبہ **جامعہ پالی ٹیکنک** میں بدل گیا۔ اس دور کے مسائل پر ہمارے سروے میں **پروفیسر نذیرالدین مینائی**، **پروفیسر انور رضا رضوی** اور **پروفیسر مجیب رضوی** نے اپنے انٹرویو میں کچھ

تفصیل سے بیان کیا ہے۔

شفیق میموریل اسکول

۱۹۴۷ء میں سماج کے تلخ حالات نے شہر کی آبادی کے مختلف فرقوں میں ایک عجیب طرح کی دوری پیدا کر دی تھی جسے دور کرنے میں اس وقت کی کچھ سیاسی پارٹیاں کام کر رہی تھیں۔ بہر طور **جامعہ** نے بھی تعلیم و ترقی کے مراکز کے ذریعہ بہت اہم حصہ لیا۔ **تعلیم و ترقی** کے تحت شہر کے کچھ ملی جلی آبادی والے علاقوں میں اور کچھ ان علاقوں میں جہاں **پاکستان** سے آئے ہوئے لوگ بڑی تعداد میں آباد ہوئے تھے وہاں **مرکز تعلیم و ترقی** کھولے گئے تھے۔ اس تلخ ماحول میں اسکولوں میں بھی ایک خاص طرح کی تفریق پیدا ہوگئی تھی کہ اسکول یا تو ہندو بچوں کو پڑھاتے تھے یا مسلمان بچوں کو۔ سرکاری اسکولوں میں بھی مسلمان بچوں کو داخلہ مشکل سے ملتا تھا اور اگر مجبوراً داخلہ مل جائے تو وہاں کا ماحول انھیں اتنا تنگ و تلخ محسوس ہونے لگتا تھا کہ وہ خود چھوڑ دیتے تھے۔ ان حالات میں سماجی ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے **بچوں کی برادری** اور اس کے تحت **بچوں کے کلب** کھولے گئے جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔

دھلی شہر میں **باڑہ ہندو راؤ** کے اس کنارے پر جو **عیدگاہ** اور **شیدی پورے** کے علاقے سے مل جاتا ہے ایک مسلم دینی **مدرسہ رحمانیہ** نام سے تھا۔ فسادات میں جب اس مدرسے کے لوگ وہاں سے اسے چھوڑ کر چلے تو ان کے منتظم نے اس مدرسے کی ایک بہت بڑی بلڈنگ اور ایک خالی پلاٹ **شفیق الرحمٰن قدوائی صاحب** کو سونپ دیے۔ اس وقت **ذاکر صاحب شفیق صاحب** اور **جامعہ** کے کچھ کارکنوں نے جن میں **شمس الرحمٰن محسنی صاحب** اور **قیصر نقوی صاحب** وغیرہ (جو **ھمایوں کے مقبرے کیمپ** اور **پرانے قلعے کیمپ** کی مصروفیات سے نکل کر شہر میں سماجی کام میں مصروف ہوگئے تھے اور جن کا ذکر **بیگم انیس قدوائی** نے اپنی کتاب '**آزادی کی چھاؤں**' میں کیا ہے) شامل تھے، ان لوگوں نے یہ طے کیا کہ اس عمارت کو باہر سے آئے ہوئے لوگوں کے ذاتی قبضے سے بچا کر اس میں اسکول اور سماجی کام شروع کر دیا جائے۔ اس عمارت کو بچانے کے سلسلے میں **جامعہ** کے ان کارکنوں کو کئی بار جان کا خطرہ بھی ہوا۔ ایک بار عمارت میں بم بھی پھینکا گیا اور اس پر نا

جائز طور پر قبضہ کرنے کی کئی سازشی کوششیں بھی ہوئیں جن کو وہاں کے ہندو مسلم سماجی کارکنوں نے مل جل کر کامیاب نہیں ہونے دیا، بہرطور ان لوگوں نے ہمت نہیں ہاری اور چند مہینوں کی کوشش سے ایک ایسا اسکول قایم کر دیا جس میں علاقے کے مسلمان بچے اور آس پاس آباد ہوئے پنجابی **'شرنارتھی'** خاندانوں کے بچے آنے لگے۔ اس ماحول میں یہ کام بہت مشکل تھا چونکہ دونوں طرف کے فرقہ واری جذبات اس کے مخالف تھے۔ مگر **شفیق الرحمٰن قدوائی صاحب** اور جامعہ کے ان کارکنوں کی کوششوں اور اختراعی ترکیبوں سے رفتہ رفتہ ماحول سازگار ہوتا چلا گیا اور چند سال میں اس اسکول کا نام شفیق میموریل اسکول رکھ دیا گیا۔ اس اسکول کا خصوصی ذکر **جناب جتندر کمار آنند** کے بیانات میں دیکھا جا سکتا ہے۔

اس اسکول کی ابتدائی زندگی، بلکہ بہت بعد تک مالی بدحالی بھی ایسی ہی رہی جیسی جامعہ کے ابتدائی پچیس تیس برسوں میں رہی تھی، مگر یہاں کے اساتذہ اور کارکنوں کی لگن اور ہمت سے اس وقت یہ دھلی اسٹیٹ کے اردو میڈیم ہائر سیکنڈری اسکولوں میں خاصی ممتاز حیثیت کا حامل ہے اور اس کی اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ یہاں تمام فرقوں کے لڑکے بڑے اچھے ماحول میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ بہت عرصے تک یہ اسکول کسی نہ کسی طرح جامعہ سے بھی ملحق رہا اور اس کی نگرانی جامعہ کے شیخ الجامعہ کے ہی سپرد ہوتی تھی۔

شفیق کلب

جامعہ میں درجہ چہارم کے کارکنوں کی یہ تنظیم خود انہی کی تجویز و تحریک پر پانچویں دہے کے شروع میں قایم ہوئی تھی اور اس وقت یہ مزدور یونین بازی کے منفی قسم کے اثرات کو تحلیل کر دینے کا ایک اچھا ذریعہ تھی۔ اس کے قیام اور کاموں کے بارے میں ہمارے ایک جواب دہندہ **محمد اسحاق صاحب** نے...... جو پوری زندگی مختلف شعبوں میں درجہ چہارم کے ملازم رہے، مگر ذہنی طور پر جامعہ کی دین، روشن دماغی اور چلت پھرت ان کی زندگی کی خصوصیت رہی اور انھوں نے شفیق کلب میں بہت اہم کردار ادا کیا، انھوں نے اس کو خاصی تفصیل سے بتایا:

ایسا ہوا، جب ہمارے شفیق صاحب کا انتقال ہوا

تو اس میں ہم اور محمد علی صاحب ، ایک ڈرائیور تھے ان (شفیق صاحب) کے، وہ اور سلیم (ڈرائیور) اور مشتاق (باورچی) ہم لوگ آپس میں بیٹھے۔ ہم نے کہا بھئی کہ شفیق صاحب جامعہ کے مانے ہوئے چوٹی کے آدمی تھے...... لہٰذا وہ ایسا کیا جائے کہ ان کے نام سے ایک...... شفیق کلب کھولا جائے ......ہم نے کہا نہیں صاحب فوراً کرنا چاہیے۔ دوسرے دن ...... میٹنگ تھی۔ ذاکر صاحب بھی تھے، عابد صاحب بھی تھے، ارشاد الحق صاحب ......حافظ فیاض احمد صاحب...... میٹنگ تھی پوری...... تو ہم لوگ پہنچے...... تو حسین صاحب نکلے...... کہنے لگے میٹنگ تو ختم ہوگئی۔ تو میں نے کہا صاحب ذرا کہہ دیجیے ہم لوگ آئے ہیں......کہنے لگے بلاؤ بلاؤ...... پہلے یہ صوفے ووفے نہیں تھے۔ تخت پڑی تھی ، اس پر چادر بچھی رہتی تھی ، وہیں بیٹھ گئے ......سب سے پہلے عابد صاحب نے پوچھا: ارے بھئی بتائیے آپ لوگ کیسے آئے ہیں؟ ہم نے کہا: ایسے ایسے آئے ہیں۔ کہنے لگے: بہت اچھی بات ہے۔ مجیب صاحب نے بھی تائید کی ، اسی وقت لکھا اور کہا جائیے وہ دوکان (جامعہ اسٹور اور اسٹاف کلب کے پاس) شفیق کلب کو دی......آج سے اس دکان کا کرایہ کچھ نہیں ہوگا۔

شفیق کلب کے کاموں کے بارے میں **اسحاق صاحب** نے بتایا:

ایک تو پڑھائی کا کام حسینی صاحب جوتے کا کام سکھایا کرتے تھے۔ اس کے بعد قیصر زیدی صاحب آگئے، انھوں نے پڑھائی شروع کی...... اس کے بعد کتابیں بھی میں بہت سی لایا......ایک الماری بنائی، پھر حبیبہ قد وائی صاحبہ نے ایک ٹیلی ویژن، وہ ہم سب لوگ دیکھتے تھے۔ پھر جلسے شفیق کلب کے سال میں کیا کرتے تھے، شفیق ڈے مناتے تھے، کچھ کھیل ویل بھی ہوتے تھے۔ ٹورنامنٹ ہوتے تھے، میلاد النبی ہوتا تھا تین سال میں اس کا صدر رہا ...... ووٹنگ (الیکشن) بھی ہوتی تھی۔

یہ ادارہ جب تک رہا اس زمرے کے لوگوں میں ایک دماغی کھلا پن اور احساسِ ذمے داری پیدا کرتا رہا۔ **پروفیسر نذیر الدین مینائی** نے شفیق کلب کا ذکر کرتے ہوئے اس کے کچھ دلچسپ واقعات بھی اپنے انٹرویو میں بیان کیے ہیں۔ افسوس کہ یہ تعمیری قسم کا ادارہ بھی جامعہ کی تبدیلیوں کی نذر ہو گیا۔ اس کے ختم ہونے میں جامعہ میں کچھ نئے آئے ہوئے ان لوگوں کی ذہنی ساخت کو بھی دخل تھا جو جامعہ کے روادارانہ اور 'کلاس لیس، سوسائٹی کے تصور سے ناواقف تھے۔

مدرسہ ابتدائی اور مدرسہ ثانوی مقصدی اور تفویضی (پروجیکٹ، اسائنمنٹ) طریقہ تعلیم

جامعہ کے مدرسوں کا موضوع اتنا وسیع اور جامعہ کی تاریخ کا اتنا اہم حصہ ہے کہ چند صفحات میں اس کے صحیح نقوش ابھار لینا بھی لگ بھگ ناممکن ہے۔ اس میں پوری تاریخ یا کم سے کم ایک ڈاکٹریٹ کے مقالے کی گنجائش تو بہر حال موجود ہے۔ **عبدالغفار مدہولی صاحب** نے (دو جلدوں) میں

اپنی کتاب ایک معلم کی زندگی، کم وبیش اسی موضوع پر مرتب کی ہے (جس کے حوالے اس تحریر میں جگہ جگہ دیکھے جاسکتے ہیں اس کے علاوہ بھی اس سلسلے میں ان کی کچھ کتابیں اور ہیں)۔ نیچے بہت مختصر طور پر ان مدرسوں کی صرف کچھ بنیادی خصوصیات کی طرف نشان دہی کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

حالانکہ علی گڑھ کالج سے نکل کر جامعہ قایم کرنے والے زیادہ تر لوگ طالب علم اور کچھ اساتذہ تھے اور شروع میں اس وقت کی سیاست کے ساتھ جتنا بھی تعلیمی کام روایتی یا غیر روایتی انداز میں ہوا وہ کالج لیول پر ہی ہوا، جسے اس وقت کلیہ کہا جاتا تھا لیکن بہت جلد ہی جامعہ والوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کو سیاسی کام سے زیادہ تعلیمی تحریک میں تبدیل کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ شمس الرحمٰن محسنی کی اطلاع کے مطابق جولائی ۱۹۲۱ء سے جو تعلیمی سال شروع ہوا، اس میں:

> کالج کے ساتھ ثانوی منزل تک پڑھائی کا سلسلہ بھی شروع کر دیا گیا۔ ابتدائی جماعتوں کا انتظام نہ ہوسکا۔ وہ اگلے تعلیمی سال سے شروع ہوسکے۔[۲۴]

عبدالغفار مدہولی صاحب نے اطلاع دی:

> …… رؤف پاشا صاحب جو علی گڑھ کالج کے ان چار ممتاز نوجوان لڑکوں میں تھے جنھوں نے کالج چھوڑ کر جامعہ میں شرکت کی تھی سب سے پہلے نگراں مقرر ہوئے۔[۲۵]

۱۹۲۵ء میں جامعہ، علی گڑھ سے دہلی منتقل ہوئی اور کچھ دقتوں اور پریشانیوں کے ساتھ مدرسے کی کلاسیں اور اقامت گاہیں قایم ہوتی رہیں۔ ذاکر صاحب جب ۱۹۲۶ء میں دہلی آئے اور انھوں نے ایک نئے عزم سے جامعہ کا کام سنبھالا تو ان کے ذہن میں مدرسہ ابتدائی کو نئے ڈھنگ سے چلانے کا ایک نقشہ بہت واضح طور پر موجود تھا۔ اس سلسلے میں انھوں نے **عبدالغفار مدہولی صاحب** کو ایک سال کی ٹریننگ کے لیے پنجاب میں موگا میں ایک استادوں کے تربیتی اسکول میں ٹریننگ کے

لیے بھیجا جسے امریکہ کی ایک مشنری تنظیم چلاتی تھی۔ ۱۹۳۰ء تک قرول باغ میں جامعہ کی اپنی عمارت تعلیمی مرکز اتنی تیار ہوگئی تھی کہ اس میں ابتدائی کی چار جماعتوں کو منتقل کر دیا گیا۔ (چونکہ پہلے مدرسہ ابتدائی پہلی جماعت سے چوتھی جماعت تک ہی مانا جاتا تھا۔ بعد میں اس میں پانچویں اور چھٹی جماعت کا اضافہ کیا گیا۔ اب یہ آٹھویں جماعت تک کا مدرسہ ہے اور اسے جامعہ مڈل اسکول کہا جاتا ہے۔) **غفار صاحب** کو اس کا نگراں مقرر کر دیا گیا۔ ساتھ ہی ساتھ ہر سال جامعہ سے ایک شخص کو موگا ٹریننگ کے لیے بھیجا جاتا رہا، اس طرح پانچ سال میں تربیت یافتہ استادوں کی تعداد پانچ ہوگئی اور پھر استادوں کے مدرسے سے نکلے ہوئے استاد اس مدرسے میں کام کرنے لگے۔

عبدالغفار مدہولی اپنی طبیعت کے اعتبار سے شاید موزوں ترین شخص تھے جو اس نئے انداز سے چلائے جانے والے بچوں کے اسکول کی رہنمائی کر سکتے تھے۔ بہت زیادہ تعلیم یافتہ نہ تھے کہ ان سے شدید قسم کے اصولی یا نظریاتی اختلافات رونما ہوتے لیکن اپنے عزم و ارادے کی مضبوطی اور اختراعی اور جدت پسند طبیعت کے ساتھ بہت اچھے کارکن تھے۔ اس کام کے لیے ان کی زیادہ موزونیت اس وجہ سے تھی کہ انھیں بچوں سے بے حد محبت تھی اور جواب میں بچوں کو ان سے غیر معمولی انس و عقیدت پیدا ہو جاتی تھی۔ وہ طالبِ علموں کے استاد سے زیادہ دوست ہوتے تھے اور ان میں اتنی اخلاقی جرات اور سچائی بھی تھی کہ ایک بار لڑکوں کو کسی غصے میں اپنی عادت کے خلاف بید کی سزا دے دی تو رات بھر پریشان رہے اور اگلے دن صبح کو سب کے سامنے بچوں سے معافی بھی مانگ لی۔ بہر طور مدرسہ ابتدائی کی ذہنی اٹھان اور اعلیٰ معیار قایم کرنے میں **غفار صاحب** کا حصہ سب سے زیادہ ہے۔ جامعہ کے کارکنوں کی ایک خصوصیت یہ بھی رہی ہے کہ وہ اپنے کام کو ایک فرض یا عبادت کے طور پر انجام دیتے تھے اور ہر شخص کی اس کی صلاحیتوں اور کام کے معیار سے قدر کرتے تھے، چنانچہ **غفار صاحب**، جو زندگی بھر میٹرک پاس نہیں کر سکے تھے، ان کے ماتحت بشیر ترجامعہ کے (بی اے) اور کچھ باہر سے سند یافتہ لوگ بھی تھے جن میں **عتیق احمد صاحب** اور ان کی بیوی **مشیر فاطمہ** دونوں (ایم اے) تھے، اور **مشیر فاطمہ صاحبہ** لندن سے ہی نرسری کی ٹریننگ یافتہ تھیں۔

مدرسہ ابتدائی کے دوسرے نگرانوں میں **اکبر علی صاحب**، **سید احمد علی صاحب**، **سید حسن صاحب**، **عتیق احمد صاحب**، **آزاد رسول صاحب** اور **خالد سیف اللہ صاحب** کے نام خاص طور پر اس لیے

قابلِ ذکر ہیں کہ انھوں نے **مدرسہ ابتدائی** کو جامعہ کا تو ایک مایہ ناز اور سب سے درخشاں ادارہ بنائے ہی رکھا، یہ ملک میں اور بیرونِ ملک بھی ایک **ماڈل مدرسے** کی حیثیت کا حامل رہا۔

مدرسہ ابتدائی اور بہت حد تک **مدرسہ ثانوی** بھی نئے تعلیمی تجربوں کی ایک تجربہ گاہ تھی اور یہاں کے ماحول میں اتنی آزادی اور خود اعتمادی تھی کہ ہر تجربے کو پوری لگن سے اپنایا جاتا تھا۔ **مدرسہ ابتدائی** کے بہت سے شعبوں، **باغبانی، بینک، دکان، خوانچہ** وغیرہ کا ذکر تفصیل سے پہلے کیا جا چکا ہے۔ یہاں کی تعلیم کے اور دوسرے پہلوؤں کے علاوہ سب سے اہم طریقہ یا کامیاب ترین تجربہ **مقصدی تعلیم** اور **پروجیکٹ میتھڈ** تھا۔ ہمارے زیرِ نظر سروے میں بھی متعدد جواب دہندہ حضرات نے ان پروجیکٹس کا ذکر کیا ہے اور اس کی افادیت کو پوری زندگی پر محیط بتایا ہے۔

اصولی طور پر **مقصدی تعلیم** یا **پروجیکٹ میتھڈ** کو بہت مختصر طور پر نصابی کتابوں یا متعینہ سبقوں سے ہٹ کر کسی معینہ مقصد کے اردگرد پوری تعلیم کو ڈھالنا کہا جا سکتا ہے۔ کامیاب ترین پروجیکٹس وہ سمجھے جاتے ہیں جن میں نصاب کے تمام مضامین کا احاطہ کیا جا سکے۔ یعنی ایک ہی مقصد سے تعلق پیدا کر کے تاریخ، جغرافیہ، سائنس، حساب، ادب وغیرہ وغیرہ کی تعلیم کا کام مکمل کیا جا سکے۔ کسی پروجیکٹ کو اتنا جامع اور ہمہ جہت بنانے کے لیے استادوں کو انفرادی طور پر اور پورے اسکول کے استادوں کو مجموعی طور پر بہت محنت اور تیاری کرنا ضروری ہوتی ہے اور اس پورے کام کا مجموعی نقشہ اور اس کی فروعات پہلے سے بالکل واضح طور پر تیار کرنا پڑتی ہیں۔

یہاں دو قسم کے پروجیکٹ چلتے تھے، صرف کسی ایک جماعت کے لیے، یا پورے اسکول کے لیے۔ **جامعہ** کے کچھ پروجیکٹس کے بارے میں ہمارے جواب دہندہ حضرات میں سے صرف تین کے تاثرات نیچے درج کیے جا رہے ہیں تاکہ ان پروجیکٹوں کی کچھ تفصیلات اور ان کی افادیت کا اندازہ ہو سکے۔ **حسن ثانی نظامی صاحب** نے **موھن جو داڑو پروجیکٹ** کے بارے میں بتایا:

> ...... اب دوسری ھی جماعت میں جو ھم نے کیا وہ موھن جو داڑو پر تھا اور اس کے لیے اس درجہ اھتمام ھوا تھا کہ مثلاً ھم گئے اور بھٹے پر جا کر دیکھا کہ اینٹیں کیسے بنتی ھیں اور پھر بھت

چھوٹے چھوٹے سائز کے سانچے بنائے گئے ......وہ
اینٹیں پکائی گئیں اور پھر اس سے ماڈل تیار
کیا ہم نے موہن جو داڑو کا...... کس طرح کی
نالیاں تھیں۔ اس کا پورا ماڈل ، پھر پوری تاریخ۔
ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آج ہم کالج میں بھی بیٹھ
کر وہ کام نہیں کر سکتے جو غفار مدھولی
صاحب نے دوسری جماعت میں کرا دیا۔

پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے بیان کیا:

بھئی ابتدائی کے دو تین پروجیکٹ تو بڑے
شاندار تھے۔ انھوں نے بہت طاقت میرے اندر عطا
کی......مثلاً ایک ہمارا ہندوستان پروجیکٹ......
آج تک نقش ہو گئی ہیں وہ چیزیں۔ وہ یہ تھا کہ
ہندوستان کے بارے میں انسائیکلو پیڈک معلومات
. اور پھر لکچرس جو ہوتے تھے...... یعنی
یہاںResources، یہاں کی تاریخ، جغرافیہ Birth
Rateاور Death Rate، پاپولیشن کے متعلق
ساری چیزیں، موسموں سے متعلق، یاں کا
Flora & Fauna،مطلب دنیا کی کوئی چیز ایسی
نہ تھی جس کا تعلق ہندوستان سے ہو اور ہم نے
نہ پڑھی ہو، نہ صرف پڑھی ہو، بلکہ اس پر ہم
سے لکھوایا نہ گیا ہو، ہم نے چھوٹے چھوٹے
کتابچے لکھے تھے۔ کاش کہ وہ ہوتے۔ میں نے اتنا
سب کچھ لکھا اور تعریفیں ہوئیں...... لیکن

مجھے لگتا ھے اگر ان میں سے ایک بھی کتا بچہ
مجھے مل جاتا تو وہ شاید میری زندگی کی سب
سے قیمتی تحریر ہوتی ...... اچھا اور دوسرے یہ
کہ سب سے بڑی بات اس سے یہ ہوئی کہ شوق
پیدا ہو گیا ، اور اس کے بارے میں جاننے کا......
اور اس کے ساتھ ایک Empathy کہنا چاہیے
......Attachment

پروفیسر رضا حسین زیدی کا بیان ہے:

......کہ جب ہم پانچویں میں تھے تو سید حسن
صاحب نے اسپورٹس کا ایک شروع کیا،
پروجیکٹ، جس کا وقفہ کوئی ایک ڈیڑھ مہینے
ہوتا تھا۔ اس میں آپ یہ سمجھیے کہ ایک چھوٹی
طرح کی ریسرچ تھی...... مثال کے طور پر فٹبال
ھے یا کرکٹ ...... اس کے لیے کرکٹ میں کون کون
سی لکڑی استعمال ہوتی ھے، کون کون سی بال
استعمال ہوتی ھے......میں سمجھتا ہوں کہ اس
زمانے میں جب بڑے لوگ نہیں جانتے تھے ہمیں
بچپن میں ان چیزوں کی واقفیت ہو جاتی تھی
اور سید صاحب نے نواب پٹودی (سینیر کو)
بلایا، تو انھوں۔ نے نمایش کا افتتاح کیا......جو
کچھ بھی ان لوگوں نے جمع کیا تھا وہ سب کچھ
انھوں نے ایک ھال میں لگا دیا تھا۔ اس پر لکڑی کے
بیٹ بھی بنے ہوئے تھے......ہر سائز کے، چھوٹے

بڑے، چپٹے ...... اور گیندیں بھی اسی ٹائپ کی......(نواب پٹودی) بہت خوش ہوئے اور آخر میں......کہا کہ میرے اوپر بہت اثر ہوا، مجھے بہت اچھا لگا ، اور اپنی مثال دی کہ میں بہت چھوٹا سا تھا تو ......پنگ پانگ کی جو ایک بال ہوتی ہے...... وہ میں کہتا تھا نوکر سے کہ پھینکو تو میں بھی لکڑی کا ڈنڈا لے کے گھنٹوں کھیلا کرتا تھا۔

پروجیکٹس عام طور پر ابتدائی کی تعلیم کا ایک اہم ترین حصہ ہوتے تھے۔ متذکرہ بالا تین کے علاوہ جتنے پروجیکٹس کے نام میرے علم میں آئے ،ان میں **میلا د النبی پروجیکٹ ،یوم تاسیس پروجیکٹ ،جلیان والا باغ پروجیکٹ ،میونسپلٹی پڑوجیکٹ ، صحت و صفائی پروجیکٹ ، ہمارا ماحول پروجیکٹ،دہلی پرو جیکٹ،حالی پروجیکٹ تعلیمی تاش پروجیکٹ ، گاندھی پروجیکٹ ،باغبانی پروجیکٹ ،کپڑا پروجیکٹ ، آدمی پروجیکٹ ، تہوار پروجیکٹ ،ہمالیہ کی مہمیں پروجیکٹ،قرآن پروجیکٹ ،بھول پروجیکٹ** وغیرہ شامل تھے۔ **پروفیسر شکیل اختر فاروقی** کی اطلاع کے مطابق بہت سے پروجیکٹس کو ہالینڈ ، اٹلی اور جاپان میں نمائش کے لیے بھیجا گیا تھا۔اس میں شک نہیں ہے کہ ہر پروجیکٹ ذہن پر اتنے گہرے نقوش چھوڑ جاتا تھا کہ وہ زندگی بھر محو نہیں ہوتے تھے اس کی سیدھی سادی وجہ یہ تھی کہ ہر شخص ان کے کاموں میں Involve ہوتا تھا،سوچتا تھا،مشورے کرتا تھا، تلاش و تحقیق کرتا تھا اور اس کے ایک ایک کام کو خود عملی طور پر انجام دیتا تھا۔

مدرسہ ابتدائی کے کاموں کو بہتر سے بہتر بنانے اور ان میں اختراعات کے سلسلے میں نئے نئے اقدامات کیے جاتے تھے۔ **شمس الرحمٰن محسنی صاحب** نے بتایا:

...... شیخ الجامعہ کی صدارت اور نگرانِ مدرسہ کے انتظام میں ان (استادوں) کا ایک جلسہ ہفتہ میں ایک دن ضرور ہوتا......یہ مجلس ہفتے بھر

کے کام کا جائزہ لیتی اور کام کو بھتر بنانے کے
لیے جماعتی طور پر نئے راستے تلاش کرتی۔
طریقہ تعلیم کو بھتر بنانے کے لیے نمونے۔ کے
عملی اسباق دینے کی ابتدا کی گئی۔ مدرسے کے
استاد باری باری ایك نمونے کا سبق تیار کرتے
اور دوسرے استادوں کے سامنے پڑھا کر دکھاتے۔
جس وقت یہ نمونے کا سبق ھوتا، دوسری
کلاسوں کے طالب علم اپنے یھاں نظم و نسق قایم
کرنے کے خود ذمے دار ھوتے اور کام کرتے رھتے
...... یہ عملی اسباق مجلس کے ھر ممبر کو دینے
ھوتے۔ نگراں مدرسہ اور صدر مجلس (شیخ
الجامعہ) بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھے۔ مجلس
اساتذہ نے یہ دیکھ کر کہ بچے اپنے استادوں کی
بڑی اچھی نقل کر لیتے ھیں اور اس کے ذریعے
استاد کو اپنی اچھائیوں اور خامیوں کا بڑی
اچھی طرح اندازہ ھو سکتا ھے، یہ طے کیا کہ
کبھی کبھی بچوں سے استادوں کی نقل بھی
کرائی جائے۔ اس سے ھوسٹل میں مقیم طلبا کے
لیے ایك دل چسپ سرگرمی کا اضافہ ھو گیا اور
دوسری طرف جب ان نقلوں پر ھفتہ واری
جلسوں میں بات چیت ھوتی تو طریقہ تعلیم کی
بھت سی گتھیاں سلجھ جاتیں۔ [۲۶]

میرا خیال ہے استادوں کو Feedback کے لیے یہ فی الحقیقت ایک مفید اختراع تھی جس کی

مثال کسی دوسری جگہ ملنی مشکل ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ کسی استاد کا بچوں سے اپنی تنقید سننا، اس سے بدمزگی کے احساس کی بجائے تعمیری طور پر کچھ حاصل کرنا، بذات خود استادوں کی وسعتِ قلب اور روشن دماغی کا ایک غیر معمولی مظہر تھا جس کا تصور بھی آج کے تعلیمی ماحول میں محال ہے۔ **شمس الرحمٰن محسنی صاحب** نے آگے ذکر کیا ہے:

> اپنے کام کو بهتر سے بهتر بنانے کی ان گوناگوں کوششوں کی وجه سے مدرسه ابتدائی برابر ترقی کرتا رها۔ اس کا قیام ۱۹۳۰ء میں عمل میں آیا تھا۔ ۱۹۳۳ء تك اس میں سات جماعتیں هوئیں۔ ان میں سے ایك کلاس کنڈرگارٹن کی تھی جس کی انچارج مس فلپس بورن ایك جرمن لیڈی تھیں اور وه چھوٹے بچوں کی تعلیم و تربیت کی ماهر تھیں۔[۲۷]

ثانوی میں عام طور پر **تفویضی طریقے** (*Assignment Method*) سے کام ہوتا تھا۔ پورے سال یا چند مہینوں کے لیے ہر طالب علم کو کوئی موضوع، شاعر، ادیب اور قومی رہنما، وغیرہ سونپ دیا جاتا تھا، کچھ معمولی ہدایات اور کچھ مآخذوں یا ذرائع کی نشان دہی کر دی جاتی تھی اور ہر شخص مکمل آزادی سے کام کرتا تھا، ضرورت پڑتی تھی تو کسی استاد سے مشورہ یا ہدایت حاصل کر لیتا تھا مگر کام ہر فرد کو خود کرنا پڑتا تھا اور متعینہ مدت کے آخر میں ایک طویل مضمون یا کتابچے کی شکل میں اسے پیش کیا جاتا تھا۔ اچھے کتابچوں کو نمایش میں رکھا جاتا تھا اور سالانہ نمبروں میں اس **تفویضی کام** کے نمبر بھی شامل کیے جاتے تھے۔ اس طرح **مدرسہ ثانوی** کا طالب علم اسی درجے سے تحقیق و تلاش کے طریقے، ذرائع کی تلاش، ان سے ضروری مواد اخذ کرنے کا طریقہ اور آزادی سے خود ایک طویل مقالہ لکھنے کی تربیت حاصل کر لیتا تھا۔

مدرسہ ابتدائی کے کام کا انداز کچھ ایسا تھا کہ اس کی شہرت اور قدر ملک اور بعض صورتوں میں بیرونِ ملک بھی تعلیمی حلقوں میں کی جانے لگی تھی۔ لوگ اسے دیکھنے آتے تھے اور کبھی کبھی اپنی رائے کا

بھی اظہار کرتے تھے۔ جامعہ کے ریکارڈ میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں جن کی نشان دہی **غفار صاحب** نے بھی جگہ جگہ کی ہے مگر اس جگہ **شمس الرحمٰن محسنی صاحب** کے ہی اظہار پر اکتفا کیا جا رہا ہے:

پروفیسر محمد مجیب اپنے ایک مضمون ' ذاکر صاحب' میں لکھتے ہیں کہ مجھے جامعہ کے تعلیمی کام کی نو عیت اور معیار کا اندازہ اس وقت ہوا جب نیوایجوکیشن فیلوشپ کے چند ماہروں نے جو دنیا کا دورہ کر رہے تھے مجھ سے کہا کہ ہم نے اس سے بہتر کوئی اور مدرسہ نہیں دیکھا ہے۔ یہ لوگ انگلستان سے مختلف ملکوں کا دورہ کرتے ہوئے ۱۹۲۷ء میں ہندوستان پہنچے تھے۔ ان میں سے ایک **سالٹر ڈیویز** تھے، انھوں نے اپنی تحریر میں بتایا:

مجھے جامعہ ملیہ کے اسکولوں کو دیکھنے کا بہت اشتیاق تھا......میں نے اس سفر میں بہت سے اسکول دیکھے ہیں اور میں بلا جھجھک کہتا ہوں کہ کئی لحاظ سے میں نے آپ کے اسکول کو دلچسپ پایا، مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہت سی مشکلات کے باوجود آپ لوگ تعلیم کے ان اصولوں پر عمل پیرا ہیں جنھیں عام طور پر تسلیم تو کیا جاتا ہے لیکن ہمارے اسکولوں میں انھیں برتنے میں بہت سست روی سے کام لیا جاتا ہے۔ آپ دراصل انھیں اصولوں پر کام کر رہے ہیں جنھیں میں اپنے وطن کینٹ

(انگلستان) میں عمل میں لانے کی کوشش کر
رہا ھوں۔ خدا اس عظیم الشان کام میں آپ کو
اور آپ کے ساتھیوں کو کامیاب کرے۔

دوسرے ماہرِتعلیم **لارن دلیاکس** تھے۔انھوں نے اعتراف کیا:

جامعه میں آکر اور ڈاکٹر ذاکر حسین اور ان کے
مخلص ساتھیوں سے گفتگو کر کے میں نے
محسوس کیا کہ میری زندگی کا یہ بہت ھی
فیض بخش اور حوصلہ افزا تجربہ ھے۔ اس
ادارے کے پیچھے جو تصور کار فرما ھے اور وہ
جذبہ اور عمل جس میں یہ تصور ڈھل گیا ھے،
اس نے اس ادارے کے کام کو دنیا کی بہترین
تعلیمی کوششوں کی صف میں جگہ دی ھے۔[۲۸]

مندرجہ بالا تاثرات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مجموعی طور پر جامعہ اور خصوصی طور پر جامعہ کے مدرسے کس قدر قابلِ قدر انداز میں کام کررہے تھے شاید اسی لیے **گاندھی جی** جامعہ آکر کہا کرتے تھے کہ میں جب جامعہ آتا ہوں تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں اپنے گھر آ گیا ہوں۔ان کے بیٹے **دیوداس** یہاں بحیثیت استاد کام کررہے تھے اور ان کے پوتے **رسک لال** کا جامعہ کے طالبِ علم کی حیثیت سے انتقال ہوا تھا اور جب مدرسے کے بچوں نے **گاندھی جی** کو ان کے پوتے کے ملحق پُرسے کے لیے قرولباغ میں بلایا تو **گاندھی جی** نے یہی کہا تھا کہ تم سب بھی تو میرے ہی بچے ہو۔یہی حال **جواہر لال** کا تھا کہ وہ وزیرِ اعظم ہونے کے بعد کئی بار جامعہ آئے اور ہمیشہ اپنے حفاظتی عملے کو ہدایت دے دیتے تھے کہ یہ میرا گھر ہے یہاں میرے پیچھے لگنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اس اندازِ تعلیم اور ذہنی تربیت سے بچوں کی عام نشو ونما اور ان کے مجموعی کردار پر جو اثرات مرتب ہوتے تھے اس کا اعتراف بہت مثبت انداز میں **پروفیسر انور رضا رضوی** نے کیا ہے جسے کچھ صفحات پہلے باغبانی اور اس سے ملحق شعبوں کے بیان میں دوہرایا جاچکا ہے۔

محمد علی ٹرافی / تعلیمی میلہ

مولانا محمد علی جامعہ کے قایم کرنے والے ہی نہیں تھے، آخر وقت تک انھیں جامعہ اور اس کے طالبِ علموں سے بے حد محبت تھی۔ گو کہ بعد میں سیاسی کاموں میں زیادہ مصروف ہو گئے تھے لیکن جب بھی دھلی میں ہوتے جامعہ ضرور آتے۔ ان کے انتقال کا جامعہ والوں پر بہت اثر تھا۔ سب سے پہلے مدرسہ ابتدائی نے ان کی یاد میں **محمد علی ٹرافی** کی ابتدا ۱۹۳۱ء میں کی۔ اس میں شروع میں تحریری اور تقریری مقابلے اور بچوں کے کلچرل پروگرام ہوتے تھے۔ بعد میں ان میں کھیل کود کے مقابلے بھی شامل کر دیے گئے۔ اس میں جامعہ کے بچوں کے اداروں کے علاوہ شہر کے اسکولوں کے بچے بھی شامل ہوتے تھے اور یہ بچوں کی زندگی کا بہت اہم جشن ہو گیا تھا اس کی تیاری بہت پہلے سے شروع ہو جاتی تھی۔

جو ٹرافی دی جاتی تھی وہ شیشے کے ایک بکس میں چاندی کی بنی ہوئی دھلی کی جامع مسجد تھی، جس کے گنبدوں پر سونے کا پانی تھا۔ یہ بے حد خوبصورت چیز تھی۔ اسے جامعہ کے حیاتی رکن، **ماسٹر عبدالحئی صاحب** نے اپنی نگرانی میں بنوایا تھا، جو خود لکڑی کے بہت اچھے کاری گر تھے۔ اس ٹرافی کی لاگت میں آدھا پیسہ جامعہ نے اور آدھا طالب علموں اور جامعہ کے اساتذہ نے دیا تھا۔

پھر کچھ عرصے بعد اس میں یومِ تاسیس کے ساتھ تین دن کا تعلیمی میلہ بھی شامل کر دیا گیا تو بچوں کی دکانیں کھیل کود، طرح طرح کے تماشے تعلیمی نمایشیں، کھانے پینے کے لیے ہوٹل اور شام کو ڈرامے بھی ہونے لگے۔ غرض یہ اتنا بڑا جشن ہوتا تھا کہ اس میں جامعہ کا ہر چھوٹا بڑا پورے انہماک سے شریک رہتا تھا اور جامعہ کے کھلتے ہی اس کا انتظار اور اس کی تیاریاں شروع ہو جاتی تھیں۔

اس کا ایک اور اہم پہلو یہ تھا کہ یہ شہر والوں اور جامعہ کے درمیان ایک بہت مضبوط رابطے کا ذریعہ تھا۔ شہر سے سیکڑوں کی تعداد میں پورے پورے خاندان، جامعہ میں پڑھنے والے اور مقابلوں میں شریک ہونے والے بچوں کے گھر والے شریک ہوتے تھے۔ اور یہ جامعہ اور شہر یا آس پاس کی دیہاتی بستیوں کے درمیان ایک ثقافتی پل تھا جس کی تعلیمی اور ثقافتی دونوں طرح زبردست اہمیت تھی۔ اس سلسلے میں **پروفیسر مجیب رضوی** کا خیال تھا:

......جو آپ کا بہت بڑا ہتھیار تھا، تعلیم و ترقی
وہ تہس نہس ہورہا تھا۔ وہ بالکل خاتمے کے
اوپر تھا...... لیکن بعد میں مجھے محسوس ہوا کہ
اس کی وجہ سے آس پاس کے اس میں، اپنی
جڑوہ کٹ گئی......اسی طرح سے آپ کے جو یہ
میلے ہوتے تھے جس میں آپ تین دن میں پوری
دلّی کو سمیٹ لیتے تھے اور کوئی ایسا آدمی جس
کی کوئی حیثیت ہودلّی میں ، وہ جامعہ نہ آئے
یہ ممکن نہیں تھا۔.....

محمد علی ہال

جامعہ جب **علی گڑھ** میں ہی تھی، **مولانا حیات** تھے اور **جامعہ** کے کاموں میں مصروف تھے، اسی زمانے میں ایک پھونس کی چھت والے کمرے کو **محمد علی ہال** نام دے دیا گیا تھا اور **انجمن اتحاد، انجمن کمال** وغیرہ کے سارے جلسے اور بحث مباحثے وہیں ہوتے تھے۔ اس کے بعد جب **جامعہ دہلی** منتقل ہوئی تب بھی اس نام کو کسی نہ کسی طرح باقی رکھا گیا، پھر جب **جامعہ نگر** میں آباد ہونی شروع ہوئی تو **مدرسہ ابتدائی** کے ایک طرف ٹین کی چھت اور اینٹ کے فرش کے ساتھ ایک لمبا چوڑا سا شیڈ ڈال لیا گیا۔ یہ جگہ کثیر المقاصد تھی۔ اسی میں پنج وقتہ، جمعہ اور عید بقرعید کی نمازیں ہوتی تھیں، تمام جلسے تمام تقریبات بھی یہیں ہوتی تھیں اور میٹری کولیشن اور **کالج** کے سارے امتحانات بھی یہیں ہوتے تھے۔ چونکہ فرشی نشست پر سارے کام ہوتے تھے اس لیے ہر موقعے پر جوتے اتار کر اندر جاتے تھے تو اس کا بحیثیت مسجد بھی احترام باقی رہتا تھا۔

محمد علی ہال کی اس روایت میں ایک بار مجبوراً تبدیلی بھی لانی پڑی۔ ہوا یہ کہ شاید ۴۹-۱۹۴۸ء میں کسی دوسرے ملک سے کوئی بہت بڑے مہمان آئے اور ان کے استقبال کا ایک بڑا اہم پروگرام منعقد کیا گیا۔ حسبِ دستور پوری تیاریاں ہوئیں، ایک بہت بڑا پنڈال بنا اور اگلے دن کے

پروگرام کی ساری تیاری ایک دن پہلے مکمل کر لی گئی۔ رات میں اتنی تیز بارش ہوئی کہ پنڈال کے نیچے زمین میں کئی کئی انچ پانی کھڑا ہو گیا۔ جامعہ کے پاس **محمد علی ہال** کے شیڈ کے علاوہ کوئی ایسی چھت والی جگہ نہیں تھی کہ جہاں اتنے لوگوں کو کرسیوں پر بٹھایا جا سکے۔ اس وقت طے کیا گیا کہ یہ فنکشن **محمد علی ہال** میں ہی منعقد کیا جائے۔ اس وقت کچھ حضرات نے مسجد کی حرمت برقرار رکھنے کے سلسلے میں اس پر اعتراض بھی کیا، مگر جامعہ کے کچھ بزرگوں نے یہی جواز پیش کیا کہ بنیادی طور پر **محمد علی ہال** مسجد تھا ہی نہیں، بلکہ جلسوں اور دوسرے پروگراموں کے لیے عارضی طور پر ایک شیڈ ڈال لیا گیا تھا جس میں کوئی اور مناسب جگہ نہ ہونے کی وجہ سے نماز بھی ہو جاتی تھی۔ غالباً چھٹے یا ساتویں دہے میں دوسری ضرورتوں کے پیشِ نظر اس شیڈ کو بھی ختم کر دیا گیا اور خصوصاً جب سے **ڈاکٹر مختار احمد انصاری آڈیٹوریم** اور ایک بہت بڑی مسجد الگ بن گئی تو یہ دونوں مسئلے حل ہو گئے۔

مطبخ

مطبخ کے شعبے کو جامعہ کی زندگی کا اہم ترین شعبہ کہنا صرف اس لیے مناسب نہیں ہوگا کہ یہ جامعہ کی آبادی کو تین وقت کا کھانا فراہم کرتا تھا، بلکہ فی الحقیقت یہ جامعہ والوں کی بقا کا ہر اس دور میں بھی کفیل رہا جب اس پر کوئی بحرانی یا پریشان کن وقت پڑا۔ کسی جگہ زیرِ نظر تحریر میں ہی اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ حکومت کی گرانٹ ملنے سے پہلے جامعہ اپنے ہر کارکن کو بروقت تنخواہ دے سکنے کا وعدہ تو نہیں کر سکتی تھی لیکن دو چیزیں یا سہولتیں دینے کا ضرور وعدہ کرتی تھی۔ دو وقت کھانا اور ایک وقت ناشتہ فراہم کرنا، اور کسی نہ کسی قسم کی، اچھی بری، رہایش کا انتظام کرنا۔

جب تک جامعہ دہلی شہر میں قرول باغ میں تھی وہاں تو قیام وطعام کا جامعہ سے باہر کوئی امکان سوچا بھی جا سکتا تھا لیکن جامعہ نگر آنے کے بعد اس کی کوئی صورت نہیں تھی، لہٰذا جامعہ ان دونوں ذمہ داریوں کو برابر پوری کرتی رہی۔

مطبخ کے سلسلے میں **عبدالغفار مدہولی صاحب** نے یہ اطلاع بھی دی ہے کہ جب تک جامعہ علی گڑھ میں تھی مطبخ کا ناظم کالج کا ایک لڑکا ہی ہوتا تھا جو چنا جاتا تھا۔ لیکن اس کے بعد پھر استاد ہی اس کے ناظم ہونے لگے۔ اس میں سب سے طویل عرصے اور مشہور شخصیت **ماسٹر عبدالحیٔ**

صاحب کی تھی جنھوں نے اچھے سے اچھے اور برے سے برے وقت میں اس ذمے داری کو بڑی مستعدی اور خیر وخوبی سے نبھایا۔ ماسٹر عبدالحئی صاحب کے ساتھ ان کے ایک معاون منشی مطبخ، بھی ہوتے تھے۔ ہمارے زمانے میں منشی بختیار محمد خاں صاحب اپنی غیر معمولی جسامت کے ساتھ اپنی کارکردگی اور خوش مزاجی کے لیے مشہور تھے۔ کافی طویل عرصے تک شبیر ندوی صاحب بھی اس کے ناظم رہے۔ بہت شروع میں عبدالغفار صاحب اور اکبر علی صاحب کے نام بھی مطبخ کی نظامت میں آتے ہیں، پرانی جامعہ سے متعلق شاید ہی کوئی فرد یا خاندان ایسا ہو جس نے مطبخ سے فیض نہ اٹھایا ہو۔ کئی کئی مہینے تنخواہ نہ ملنے کی صورت میں قوتِ لایموت کا یہی ایک سہارا تھا۔ یہی یہاں کی تمام دعوتوں، ضیافتوں، پکنکوں اور جشنوں میں حتیٰ کہ جامعہ کے افراد کے خاندانوں کی ذاتی تقریبات میں بھی خدمات انجام دیتا تھا۔ اس وجہ سے ہمارے جواب دہندہ حضرات میں مشکل سے ہی کوئی ایسا فرد ہوگا جس نے مطبخ کا کسی نہ کسی بہانے ذکر نہ کیا ہو۔ ان تذکروں میں جامعہ کے جشنِ سیمیں کے عیش کے دنوں کی بات بھی ہے اور ۴۷ء میں ایک وقت میں ایک 'ڈھلپ' (تنوری روٹی) اور دال کا ذکر بھی موجود ہے۔ نمک نہ ہونے کی داستان بھی موجود ہے اور بنیادی چیز غلے کے ختم ہونے کا بھی تذکرہ ہے۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ایک زمانے میں جامعہ کو غلہ بھاول پور موجودہ (پاکستان) سے بھی آتا تھا اور آس پڑوس کے گاؤں سے بھی غلے کی فراہمی کی داستانیں ہیں۔ لیکن ایک بات بہرحال قابلِ تعریف ہے کہ جامعہ کے مطبخ کے کھانے کا معیار غذائی اعتبار سے بھی اور لذت کے اعتبار سے بھی بہت سے ایسے دوسرے اداروں سے ہمیشہ بہتر رہا ہے۔

مکتبہ جامعہ / پیام تعلیم / پیامی برادری

جامعہ کے کچھ سب سے زیادہ فعال اداروں میں مکتبہ جامعہ کا نام بھی ہے۔ بیسویں صدی میں باوقار اور معیاری اردو ادب کی اشاعت اور پھیلاؤ میں اس کا اتنا بڑا یوگ دان ہے کہ فی الحقیقت اس کی تاریخ ایک مکمل تحقیق کی متقاضی ہے۔ جامعہ کی خوش نصیبی سے چونکہ اسے شروع سے ہی ملک کے بے حد کشادہ ذہن اور ترقی پسند افراد کا تعاون، تحریک اور شمولیت حاصل تھی اس لیے مکتبے یا تصنیف و تالیف اور اس کی اشاعت کا کام جامعہ کے ابتدائی دنوں سے شروع ہو گیا

تھا۔ جہاں **مولانا محمد علی جوہر** جیسا علم کا شائق **مولانا اسلم جیراجپوری** اور کچھ بعد میں **ڈاکٹر ذاکر حسین**، **ڈاکٹر عابد حسین** اور **پروفیسر محمد مجیب** جیسے صاحبانِ قلم موجود ہوں ایسے ادارے سے کتابوں کی تصنیف و تالیف، طباعت واشاعت میں یوں بھی زیادہ دیر نہیں لگنی چاہیے تھی۔ چنانچہ پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے کہ ۱۹۲۲ء میں ہی **شعبہ تصنیف و تالیف** کا قیام عمل میں آ گیا تھا اور اسی سال جامعہ کے پریس نے کام شروع کر دیا تھا یعنی اس طرح مکتبہ جامعہ کی ابتدا ہو گئی تھی لیکن غالباً اسے بیوپاری روپ نہیں دیا گیا تھا۔

شروع میں مکتبہ جامعہ صرف بچوں کی کتابیں اور کچھ نصابی کتابیں ہی چھاپتا تھا۔ پیام تعلیم اور جامعہ رسالے کی اشاعت بھی اسی کے سپرد تھی۔ مکتبہ جامعہ کو سب سے فعال اور جوشیلے کارکن **حامد علی خاں** ([بی اے] جامعہ اور حیاتی رکن) مل گئے جن میں ایک بیوپاری ادارہ چلانے کی زبردست صلاحیت تھی۔ لکھنے میں تو کوئی بہت زیادہ دخل نہیں تھا مگر کاروباری تنظیم میں بہت مضبوط اور فعال انداز تھا۔ فی الحقیقت مکتبہ کی ترقی میں جہاں اور بہت سے عوامل شامل ہیں ان میں ایک اہم کردار **حامد علی خاں صاحب** کا بھی ہے۔

عبدالغفار مدہولی صاحب نے اپنی کتاب 'ایک معلم کی زندگی' میں ۳۴-۱۹۳۳ء کا ذکر کرتے ہوئے **حامد علی خان** اور مکتبہ جامعہ کے بارے میں لکھا ہے:

> ......ان سے کبھی نچلا نہیں بیٹھا جاتا ہے۔......
> خود تو کبھی کوئی کتاب نہیں لکھی مگر دنیا بھر
> کے لوگوں سے سیکڑوں کتابیں لکھوا ڈالیں،
> ابتدا کی لڑکوں کی کتابوں سے اس لیے برکت
> بھی ہوئی۔ شروع ہی میں افلاطون کی کتاب
> چھپوا دیتے تو دیوالہ نکل جاتا۔......[۲۹]

ایک اور بات بھی جامعہ کے دوسرے شعبوں کے مقابلے میں مکتبہ کے سلسلے میں مختلف تھی۔ جب سے یہ کاروباری ادارہ ہوا تھا یہاں کی تنخواہوں کا معیار بھی نسبتاً بہتر تھا اور تنخواہ کے مقررہ وقت پر ملنے کا بھی لگ بھگ اعتبار رہتا تھا۔ گو کہ جب جب مکتبے پر برے وقت آئے تو اس کے

کارکنوں نے بھی جامعہ کی روح اور طرزِ عمل میں اس طرح ساتھ دیا کہ اپنی تنخواہوں میں رضا کارانہ طور پر کٹوتی کر لی۔

جیسا پہلے بھی اظہار کیا جا چکا ہے **مکتبے** نے **ہندوستان** کو ہر طرح کا معیاری ادب دینے اور اس کے معیار کو بہتر سے بہتر بنانے کی برابر کوشش کی اور اس میں بے حد کامیاب بھی رہا۔ یہاں سے چھپنے والی سیکڑوں کتابیں دوسرے کاروباری اداروں سے زیادہ معتبر، زیادہ معیاری اور صحت طباعت کے اعتبار سے بہت آگے ہوتی تھیں۔ اس ادارے کی کتابوں کی اگر مکمل فہرست دیکھی جائے، جو موجودہ مینیجنگ ڈائرکٹر **شاہد علی خاں صاحب** کے مطابق گیارہ بارہ سو کے قریب ہے تو بعض کتابیں ایسی بھی نظر آئیں گی، خصوصاً ترجمہ شدہ کتابیں؛ اگر **مکتبہ جامعہ** انھیں شائع نہ کرتا تو شاید وہ اردو کے روپ میں نظر ہی نہ آتیں۔

جہاں تک بچوں کے ادب کا سوال ہے **اردو میں بچوں کا ادب مکتبہ جامعہ** کا ہمیشہ مرہونِ احسان رہے گا کیونکہ اگر پوری تحقیق کی جائے تو **مکتبے** کے شائع کردہ **بچوں کے ادب** کا رول یہ ظاہر ہوگا کہ اس نے پرانے انداز یا پرانے ادب کو بچوں کے جدید ادب میں بدل دیا۔ یہ بہت منصوبہ بند کام تھا اور اس کام میں جامعہ کا لگ بھگ ہر وہ شخص شریک تھا جس میں ذرا بھی لکھنے کی صلاحیت تھی، **ذاکر صاحب، عابد صاحب، مجیب صاحب** اور **مکتبہ** کے قابلِ قدر رکن **حامد علی خان صاحب، حسین حسان صاحب، محمد ولی صاحب** وغیرہ وغیرہ، لکھنے کی ترغیب فراہم کرتے تھے۔ ہر چھوٹے بڑے سے تقاضے کر کر کے لکھواتے تھے۔ ان کی اصلاح کرتے تھے اور پھر بچوں کی عمر اور علمی استعداد کے مطابق اپنے مالی ذرائع سے آگے بڑھ کر انھیں چھپواتے تھے۔ **شاہد علی خاں صاحب** نے اپنے انٹرویو میں بتایا:

> ……خاص طور پر بچوں کی کتابوں پر اور
> بچوں کی زبان پر بہت محنت ہوئی اس زمانے
> میں۔ اسی کی روٹیاں ہم اب تک کھا رہے
> ہیں۔……ہماری سات سو ساڑھے سات سو کے
> قریب کتابیں ہیں بچوں کی…… مگر ہم کو وہ

زبان اور وہ چیز نہیں مل پا رہی ......(اب)......
...... بہر حال بہت کام (بچوں کے ادب میں
۱۹۴۷ء سے پہلے) اس زمانے میں ہوا، اس میں
کوئی شک نہیں ہے۔ ۴۷ء میں سب کا سب تباہ ہو
گیا، ریکارڈ بھی کچھ ملا، کچھ نہیں ملا ......

بہرطور ۵۰-۱۹۴۹ء سے مکتبے کو ایک لمیٹیڈ کمپنی میں تبدیل کردیا گیا جس میں بہت سارے حصص (*Shares*) جامعہ کے بھی ہیں لیکن لمیٹیڈ کمپنی ہونے کے بعد اس کے مسائل کاروباری اعتبار سے بھی مختلف ہو گئے۔ اگر ابتدائی دور میں **ڈاکٹر ذاکر حسین**، **ڈاکٹر عابد حسین** وغیرہ نے مکتبے کو زندہ رکھنے میں مدد کی تو لمیٹیڈ کمپنی بننے کے بعد اس سلسلے میں **کرنل بشیر حسین زیدی**، جو ملک کی کاروباری دنیا میں بھی کافی دخیل تھے، ان کا تعاون اور عملی طور پر بھاگ دوڑ مثالی تھی۔ ایک طرف **ڈاکٹر عابد حسین صاحب**، **مالک رام صاحب**، **پروفیسر محمد مجیب صاحب** جیسے لوگ اگر اس کے معیاری ادب کی تخلیق اور تیاری کے کام کی دیکھ بھال کر رہے تھے تو دوسری طرف **کرنل زیدی**، **شاہد علی خاں** اور **مجتبیٰ حسین زیدی** اس کی کاروباری اور مالی مشکلات کو دیکھ رہے تھے جو ۴۷ء کے بعد اردو کی طباعت واشاعت میں بحران پیدا ہونے کی وجہ سے بے حد نازک حد پر پہنچ گئی تھیں۔ مکتبہ جامعہ کے معماروں میں **ڈاکٹر ذاکر حسین**، **عابد حسین**، **مجیب صاحب** اور جنرل منیجروں میں **حامد علی خاں**، **غلام ربانی تاباں** اور **شاہد علی خاں** کے نام ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔ مکتبہ جامعہ کی تفصیلات پر **شاہد علی خاں صاحب** کا انٹرویو بہت اچھی روشنی ڈالتا ہے۔

ہمدردانِ جامعہ

شفیق الرحمٰن قدوائی نے زندگی بھر میں جامعہ کو اور بہت سے کاموں اور یوگ دانوں کے علاوہ تین بہت بڑے ادارے دیے تعلیم بالغان، تعلیم و ترقی اور شعبہ ہمدردانِ جامعہ۔ اس میں ہمدردانِ جامعہ کی حیثیت جامعہ کے وجود اور بقا میں شہ رگ کی سی رہی ہے۔ **عبدالغفار مدہولی صاحب** نے ۳۳-۱۹۳۲ء کا حال لکھتے ہوئے بیان کیا ہے:

اسی تاریخ (۲۹/ اکتوبر ۱۹۳۲ء) کو ایک اور شعبے کی ابتدا ہوئی۔ یہ ہمدردانِ جامعہ ہے۔ اس بات کو سامنے رکھ کر یہ شعبہ قایم کیا گیا ہے کہ :- جامعہ کے کارکن جامعہ کی آمدنی کا پائیدار اور قابلِ اعتماد مستقل اسے نہیں سمجھتے ہیں کہ بینک میں سرکاری سرمایہ جمع ہو یا حکومت کی طرف سے امداد ملے بلکہ تمام مسلمانوں کے دل میں قومی تعلیم گاہ کی جگہ ہو جائے اور وہ قطرہ قطرہ کر کے فیض و کرم کا دریا بہا دیں جو بینکوں اور حکومتوں کے زوال کے بعد بھی جاری رہے۔

چنانچہ طے کیا گیا کہ جو لوگ بھی چار آنے، آٹھ آنے، روپے، دور و پے یا اس سے زائد ماہوار دیں گے، انہیں حلقہ ہمدردان جامعہ کا کارکن بنالیا جائے گا۔

پہلے دن یہ شعبہ شفیق صاحب کی چلتی پھرتی جیب میں تھا۔ کئی سال کی انتھک کوششوں کے بعد آپ نے اسے ہر طرح سے مفید اور ٹھیک ٹھاک کر کے خواجہ عبد الحئی صاحب کے سپرد کر دیا ، اور جائزے میں ایک مہتمم دفتر ، ایک محاسب، دو منشی اور سب خرچ نکال کر ایک ہزار روپے کی مستقل آمدنی چھوڑی اور خود اپنا پرانا جھولا لے کر ایک اور مفید کام کے لیے نکل گئے۔[۳۰]

قابلِ غور بات یہ ہے کہ اس وقت تک یہ اتنا بڑا، ادارہ بن چکا تھا کہ اس میں ایک مہتمم دفتر، ایک اکاؤنٹنٹ اور دو کلرک کام کرتے تھے۔ اس کے انچارج، جیسے **شفیق صاحب**، **خواجہ عبدالحیٔ صاحب** اور بعد میں **حافظ فیاض صاحب** وغیرہ ہمیشہ رضا کارانہ طور پر اس کی خدمت کرتے تھے اور ان کے پاس جامعہ کا کوئی دوسرا بہت اہم فرض ضرور ہوتا تھا۔ اس کا ایک پندرہ روزہ اخبار: ہمدرد جامعہ ' بھی جاری ہوا، اور کچھ اور لٹریچر بھی چھپوایا گیا۔

ہمدردانِ جامعہ کی ابتدا کی وجہ کے بارے میں **پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی** کا بیان بہت اہمیت کا حامل ہے جس کی تصدیق **شمس الرحمٰن محسنی** کے بیانات سے بھی ہوتی ہے۔ **صدیق صاحب** نے بتایا:

> ......اب یہ ہوا کہ یہ جو گرفتار ہوئے (۱۹۳۰ء سول نافرمانی تحریک میں) تو نظام حیدر آباد کی گرانٹ جامعہ میں آتی تھی ، وہ گرانٹ بند ہو گئی اور نظام حیدر آباد نے یہاں (دھلی) کے کمشنر کو لکھا کہ جامعہ سے کھو کہ اس طرح کے لوگوں کو نکالیں۔ تو انھوں نے کہا ہم استعفیٰ دیے دیتے ھیں۔ لیکن پھر یہ ہوا کہ گرانٹ بند ھوئی یا نہیں...... لیکن جب ہمارے والد جیل سے آئے تو ان کے Conscience پر اس کا بوجھ تھا۔ تو انھوں نے کھا کہ اس کا ھمیں علاج کرنا ھے......کسی بڑے آدمی سے کوئی گرانٹ لینا گویا کہ اس کے ھاتھ میں خود کو بیچ دینا ھے......چار چار آنے کا ممبر بنائیے اور اس کے ذریعے سے آپ زیادہ بڑے گروپ میں لوگوں تک اپنا پیغام پھونچائیے...... اور یہ اسکیم اتنی کامیاب ہوئی

> کہ چھٹیوں میں جامعہ کے ٹیچرس (اور طالبِ علم بھی) جاتے تھے......کوئی (بہت) زیادہ دے تو کہتے تھے۔ اتنے بہت ہیں کم دیجئے......

حیدر آباد سے ملنے والی یہ گرانٹ ضرور بند ہوئی تھی۔ **شمس الرحمٰن محسنی** نے بھی اس کی تصدیق کی ہے۔ایک کتاب بہ عنوان:ہندوستان میں ہندوستانی مسلمانوں کا جنگِ آزادی میں حصہ' میں بیان کیا گیا ہے:

> جامعہ ملیہ اسلامیہ کو نظام حیدر آباد سے مالی امداد ملتی تھی، سرکار برطانیہ سے اپنے ریزیڈنٹ کے ذریعے اس کی مالی امداد بند کرادی۔ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کو اپنی گرانٹ جاری کرانے کے سلسلے میں حیدر آباد کا سفر کرنا پڑا۔ ذاکر صاحب کا مراسلہ اور بحالی امداد کے سلسلے میں محکمہ آثار قدیمہ کا ریکارڈ دیکھا جا سکتا ھے۔[۳۱]

اسی کتاب کے ص:۲۱۷ سے ۲۱۹ پر **ذاکر صاحب** کے ہاتھ کے لکھے ایک خط اور چیف کمشنر دھلی کے ٹائپ شدہ خط کی نقل موجود ہے جس میں بالترتیب گرانٹ کی بحالی کی درخواست اور پھر بحالی کا ذکر موجود ہے۔ بہرحال بعد میں یہ گرانٹ بحال ہوگئی تھی اور پچھلا بقایا بھی دے دیا گیا تھا۔

فی الحقیقت کسی قومی یا تعلیمی ادارے کے لحاظ سے مالیات فراہم کرنے کا یہ طریقہ انوکھا بھی تھا اور بے حد مفید بھی، گو کہ اس میں بے حد صدقِ دلی سے محنت کرنی ضروری تھی، چنانچہ یہاں کے استادوں کی چھٹیاں زیادہ تر اسی کی نذر ہوتی تھیں کہ ہر سال وہ مختلف شہروں میں جا کر پرانے ممبروں سے ان کا مقرر کردہ چندہ وصول کرتے تھے اور ان کے توسط سے نئے ہمدردوں کی تلاش کرتے تھے۔ عام طور پر ان استادوں کا قیام اپنے عزیز شاگردوں، پرانے **جامعی حضرات** یا اپنے دوستوں کے یہاں ہی ہوتا تھا۔ کچھ سفیر جو تنخواہ دار کارکن ہوتے تھے، انھوں نے کبھی ہوٹل وغیرہ میں ٹھہرنے میں کچھ خرچ

کیا ہوتو کیا ہو، جامعہ کے اساتذہ کے لیے تھرڈ کلاس کا ریل کا کرایہ ہی کافی ہوتا تھا۔ اس سلسلے میں جامعہ کے پرانے طالبِ علم پہلے سے لوگوں سے مل کر میدان تیار کر لیتے تھے۔ اس لیے جامعہ کے دو یا تین استادوں کی ٹولی جب پہنچتی تو انھیں در بدر بھٹکنا نہیں ہوتا تھا۔ دو چار جگہوں پر لوگوں کو جمع کر لیا جاتا اور چندہ وصولی اور نئی ممبر سازی کا کام پورا ہو جاتا۔ اس سے چندہ حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ پورے ہندوستان میں جامعہ سے اتنی بڑی تعداد میں واقف ہونے والوں اور ہمدردوں کا حلقہ پیدا ہو گیا تھا کہ ملک کے ہر کونے سے لڑکے پڑھنے بھی آتے تھے۔ **عبید الحق صاحب** نے بتایا:

> ...... یہ بہت بڑی چیز ہے کہ جامعہ سے واقف ہو گئے لوگ ، جامعہ سے محبت کرنے لگے ، ہماری ایک بوا تھیں ردولی میں ، ہمارے وطن میں ، ان کو دو رو پے تنخواہ ملتی تھی گھر میں۔ جب ہمدردانِ جامعہ کے لوگ چندہ لینے گئے تو ہمارے گھر میں ٹھہرے...... تو بوا نے انھیں آٹھ آنے چندہ دیا اور کہا: "**اس لیے دیت ہیں کہ همرا عیدوا هواں جامعہ میں پڑھت ہے**" تو دیکھیے ایسی ہمدردی تھی لوگوں کو جامعہ سے۔

اور اس ادارے نے جامعہ کی زندگی میں کتنی مدد کی اس کا اندازہ **عبدالغفار مدھولی** صاحب کی '**جامعہ کی کہانی**' سے ہو سکتا ہے۔ انھوں نے اگست ۱۹۴۳ تا ۱۹۴۴ء کے بارے میں ایک پورا تفصیلی گوشوارہ دیا ہے اور لکھا ہے:

> اس سال کے خاص عطیوں سے اتنا نوازا کہ گزشتہ سال کے ریکارڈ پیچھے رہ گئے۔ (صوبے وار تفصیل دے کر اس کی کل میزان دی ہے۔)
> ۶۷،۰۲۸ روپے ۱۰ آنے ۳ پائی ۔[۳۲]

پھر لکھا ہے:

اب جب کہ جو بلی کا سال شروع ہونے والا ھے
ھم یھاں گزشتہ سالوں کی مجموعی رقم درج
کرتے ھیں کہ جامعہ کے ھمدردوں نے ھمیں سال
بہ سال کس طرح نوازا۔

سال	پائی	آنہ	روپے
۳۸-۱۹۳۷ء	۱۰	۵	۲۳,۰۳۲
۳۹-۱۹۳۸ء اگست تا جولائی	۶	۱	۲۱,۶۴۹
۴۰-۱۹۳۹ء	۴	۱۴	۳۶,۹۴۱
۴۱-۱۹۴۰ء دوسری جنگ کا آغاز	۵	۱۰	۱۸,۹۷۶
۴۲-۱۹۴۱ء اگست تا جولائی	۶	۱۲	۳۲,۶۰۸
۴۳-۱۹۴۲ء اگست تا جولائی	۰	۴	۳۷,۰۰۸
۴۴-۱۹۴۳ء اگست تا جولائی	۳	۱	۶۷,۰۲۸
۴۵-۱۹۴۴ء اگست تا مارچ			
صرف ۸ ماہ کی آمدنی	۹	۱۰	۴۱,۰۲۲

نوٹ: جو بلی کے سلسلے میں جو رقمیں آنے لگی
تھیں وہ الگ ھیں جس کا ذکر جو بلی کے سلسلے
میں آئے گا۔[۳۳]

اوپر چند صفحات میں پرانی جامعہ کے بہت خاص خاص شعبوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ یقیناً ان کے علاوہ بھی کچھ عام نوعیت کے شعبے تھے جو اہم تو ضرور تھے۔ مثلاً **جامعہ کا شفا خانہ**، **کھیل کود کا انتظام** وغیرہ مگر چونکہ ان کی تفصیلات کسی موجودہ حوالے میں نہیں ہے اس لیے انھیں اس باب میں شامل نہیں کیا جا سکا۔ جب جامعہ میں موجودہ تمام ریکارڈس اور حوالوں کی تفصیلی تحقیق اور تلاش کی جائے گی تو یقیناً اس فہرست میں اور بھی اضافہ ہو سکتا ہے۔

حواشی

۱۔ ہندستانی مسلمانوں کی قومی تعلیمی تحریک – جامعہ ملیہ اسلامیہ ——شمس الرحمٰن محسنی،ص:۴۷
۲۔ جامعہ کی کہانی ——عبدالغفار مدہولی،ص:۴۸۲
۳۔ ایک معلم کی زندگی [جلد:۱]——عبدالغفار مدہوئی۔ص:۱۷-۱۱۶
۴۔ ایضاً [جلد:۱]ص:۱۳-۳۱۲
۵۔ ایضاً [جلد:۱]ص:۴۶۳
۶۔ ایضاً [جلد:۲]ص:۷۹-۳۷۸
۷۔ ایضاً [جلد:۱] ص:۱۸۶
۸۔ ایضاً [جلد:۱]ص:۷۰-۲۶۹
۹۔ ایضاً [جلد:۱]ص:۲۷۳
۱۰۔ ایضاً [جلد:۱]ص:۲۷۳
۱۱۔ ایضاً [جلد:۱]ص:۷۵-۲۷۴
۱۲۔ ایضاً [جلد:۱]ص:۷۷-۲۷۶
۱۳۔ ایضاً [جلد:۱]ص:۷۵۴
۱۴۔ ایضاً [جلد:۱]ص:۷-۸۰۱
۱۵۔ ایضاً [جلد:۲]ص:۷۵-۳۷۴
۱۶۔ ہندستانی مسلمانوں کی قومی تعلیمی تحریک – جامعہ ملیہ اسلامیہ ——شمس الرحمٰن محسنی،ص:۸۵
۱۷۔ ایک معلم کی زندگی ——عبدالغفار مدہولی [جلد:۱]ص:۲۷۱
۱۸۔ ہندستانی مسلمانوں کی قومی تعلیمی تحریک – جامعہ ملیہ اسلامیہ ——شمس الرحمٰن محسنی،ص:۱۰۷
۱۹۔ ایضاً،ص:۱۰۷
۲۰۔ ایک معلم کی زندگی ——عبدالغفار مدہولی [جلد:۲] ص:۳۱۱
۲۱۔ ایضاً [جلد:۲]ص:۴۰۲
۲۲۔ ایضاً [جلد:۱]ص:۱۳۲

۲۳۔ ایضاً[جلد:۱]ص:۱۳۴

۲۴۔ ہندستانی مسلمانوں کی قومی تعلیمی تحریک – جامعہ ملیہ اسلامیہ —— **شمس الرحمٰن محسنی**،ص:۴۳

۲۵۔ ایک معلم کی زندگی —— **عبدالغفار مدہولی**[جلد:۱] ص:۶۹

۲۶۔ **شمس الرحمٰن محسنی**،ایضاً،ص:۷۷-۷۶

۲۷۔ ایضاً،ص:۷۸

۲۸۔ ایضاً،ص:۸۲

۲۹۔ **عبدالغفار مدہولی**[جلد:۱]ص:۲-۱۷۱

۳۰۔ **عبدالغفار مدہولی**[جلد:۱]ص:۸۴-۳۸۳

۳۱۔ ہندستانی مسلمانوں کا جنگِ آزادی میں حصہ —— **سید ابراہیم فکری**،۱۹۹۷ء ص:۲۲۱

۳۲۔ جامعہ کی کہانی —— **عبدالغفار مدہولی**،ص:۷۴-۳۷۳

۳۳۔ ایضاً،ص:۷۵-۳۷۴

جامعہ ملیہ اسلامیہ

افراد و نظریات

خالدہ ادیب خانم* / ترجمہ: مسعود الحق

اگر آپ ملک (ہندوستان) میں سرگرمِ عمل قوتوں کو سمجھنا چاہتے ہیں تو آپ کو جامعہ کا مطالعہ کرنا اور اسے سمجھنا ہوگا۔ اس ادارے کے سامنے دو مقاصد ہیں۔ پہلا مقصد ہے مسلمان نوجوانوں کو ایک ہندوستانی شہری کی حیثیت سے اپنے حقوق و فرائض کے مکمل احساس کے ساتھ تربیت دینا اور دوسرا مقصد اسلامی فکر و عمل کو ہندو فکر و عمل سے مربوط و ہم آہنگ کرنا۔ عام مطمحِ نظر اپنے اسلامی تشخص سے محروم ہوئے بغیر ایک خوش گوار اور ہم آہنگ **ہندوستانی نیشن ہڈ** (Nationhood) کی تشکیل ہے۔ اس مطمحِ نظر کی اپنے لائحہ عمل کے اعتبار سے ہمیشہ تو نہیں مگر عموماً **گاندھی جی** کی تحریک سے حقیقی قربت ہے ایک ایسی قربت جو کم از کم میں نے تو کسی دوسرے ادارے میں نہیں دیکھی۔

جامعہ کے بارے میں بات کی ابتداء اگر پہلے علی گڑھ کالج کا نام لیے بغیر

---

* معروف ادیب، مصنفہ و سابق وزیر تعلیم حکومت انگورہ

کی جائے تو یہ ایسا ہی ہوگا جیسے آپ گاڑی کو گھوڑے سے آگے لگا دیں۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پرنسپل (شیخ الجامعہ) **ڈاکٹر ذاکر حسین** ہیں جتنے ہندوستانی دانشوروں سے میری ملاقات ہوئی ان میں سے ایک بھی مجھے ایسا نہیں ملا جس نے مجھ سے یہ سوال نہ کیا ہو: "ذاکر حسین کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟" اس استفسار کا مطلب یہ ہے کہ **ذاکر حسین** اپنے ہم وطنوں کے لیے ایک معمہ ہیں۔ ویسے ان جیسا سیدھا سادا، اور بے لاگ آدمی ملنا مشکل ہے۔ ان کے بارے میں اس عام تذبذب کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان پر کوئی سیاسی ٹھپہ نہیں لگا ہے اور ان کے کاموں اور ان کی سرگرمیوں میں پارٹیوں کے تعصّبات کا کوئی رنگ نہیں جھلکتا۔ وہ اپنا سارا وقت تعلیم سے متعلق مسائل کو دیتے ہیں۔ تعمیری بلکہ بڑی حد تک تجرباتی طور پر۔

وہ ایک **پٹھان** ہیں۔ ایک سرحدی فرد۔ لحیم شحیم، تنومند، جیوٹ اور مستقل مزاج۔ ان کے والد صاحب جو ایک وکیل تھے حیدر آباد میں بَس گئے تھے اور وہاں انھوں نے وکالت کی بڑی معتبر اور کامیاب پریکٹس کی۔ اپنے انتقال کے وقت جو بڑی کم عمری میں ہوا تھا، انھوں نے اپنے سات لڑکوں کی معقول تعلیم کے لیے کافی ترکہ چھوڑا۔ اپنے بھائیوں میں **ڈاکٹر ذاکر حسین** سب سے بڑے تھے اور تیس سال قبل ایک مشرقی خاندان میں اس بات کی یعنی بڑا ہونے کی بڑی اہمیت تھی۔ اس صورتِ حال نے ان میں ذمہ داریوں کا کچھ اتنا شدید احساس پیدا کر دیا کہ جب خاندان کے چھوٹے اراکین کی نگہ داشت ان کے بس میں نہ رہی تو انھیں گھر سے باہر دنیا میں قدم رکھنا اور کسی مقصد کے حصول میں لگنا پڑا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کی ابتدائی تعلیم انتہائی قدامت پرستانہ اور راسخ تھی۔ ان کا اسکول ایک قدیم طرز کا اسکول تھا۔ گھر پر جب وہ بچے ہی تھے انھیں ہر طرح کے لوگوں سے ملنے کا موقع ملا۔ یہاں تک کہ دیوانوں اور خبطیوں تک سے۔ یہیں اسی زمانے میں ان کی ملاقات ایک **عارف** سے ہوئی۔ ان بزرگ نے **ذاکر صاحب** سے بڑے ضخیم مسودے نقل کرائے۔ **ذاکر صاحب** کی خوبصورت تحریر اور صوفیوں کے لیے دل میں بردباری کا جذبہ شاید ان بزرگ کا ہی فیض تھا کیوں کہ وہ خود تصوف کی طرف کوئی خصوصی رجحان نہیں رکھتے تھے۔

ان کی یونیورسٹی علی گڑھ تھی جہاں وہ گریجویشن کرنے کے بعد **معاشیات** کے لکچرر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ علی گڑھ کسی انگریزی

یونیورسٹی جیسی سماجی اور تعلیمی (زیادہ تر کلاسکس) کامرانیوں کی نمائندگی کرتا تھا۔ان کے ظاہری حسن، وجاہت، گفتگو کے سلیقے تقریر اور قیادت کی صلاحیت نے انھیں کامیاب وکامران بھی بنایا اور مقبول بھی وہ ہمہ گیر اور باصلاحیت ہونے کا تاثر دیتے تھے۔مگر ساتھ ہی ایک طرح کی غیر ذمہ داری کا پرتو بھی ان میں نظر آتا تھا۔ یہ سب خصوصیات وہ تھیں ہندوستانی ذہن میں جن کی توقع علی گڑھ کے طبقۂ اعلیٰ کے آج کے طالب علم سے رکھتا ہے۔مگر جب ۱۹۱۹ء میں ایک نئی تحریک نے علی گڑھ کی روایات پر حملہ کیا تو **ذاکر صاحب** اس نئی تحریک کے ہم نوا بن گئے۔اس تحریک کی نمائندگی **ڈاکٹر انصاری** اور مرحوم **مولانا محمد علی** کرتے تھے۔ان کا خیال تھا کہ اب علی گڑھ مسلمانوں کی آرزوؤں اور تمناؤں کی آبیاری نہیں کر رہا ہے۔ جب یہ لوگ نہ تو اسے مسمار کر سکے اور نہ ہی بدل سکے تو ان لوگوں نے ایک نئے مرکز کی بنیاد ڈالی اور اسے جامعہ ملیہ اسلامیہ کا نام دیا جس کا مطلب ہوتا ہے مسلم نیشنل یونیورسٹی مگر یونیورسٹی کے اس تصور میں چھوٹے چھوٹے بچوں کی تعلیم وتربیت بھی شامل ہے بلکہ اس سطح کی تعلیم کا بھی اہتمام ہے جسے آپ فرابیل اور مانٹیسوری کی ملی جلی تعلیم کہہ سکتے ہیں۔

۱۹۲۲ء میں **ذاکر حسین** نے یونیورسٹی سے رخصتِ تعلیمی لی اور اپنی تعلیم کی تکمیل کے لیے جرمنی گئے۔انھوں نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔۱۹۲۳ء میں جب وہ ایک ہندوستانی طالب علم کے ساتھ میونخ میں چھٹیاں گزار رہے تھے تب میری ان سے ملاقات ہوئی۔بیس پچیس برس کی عمر ہی میں انھوں نے ڈاڑھی رکھ لی تھی اور انھیں دیکھ کر کوئی انھیں نوجوان نہیں کہہ سکتا تھا۔اس سنجیدہ اور بظاہر بالغ وپختہ نوجوان کے ساتھ **مجیب** نام کا ایک دوسرا نوجوان تھا۔ یہ نوجوان **ڈاکٹر صاحب** سے بالکل مختلف تھا۔ دھان پان، نازک خدوخال، سوچ میں ڈوبی ہوئی افسردہ افسردہ آنکھیں، حسن وفن کی دلدادہ شخصیت گویا زفرق تا بقدم تحریر تھی۔مگر باہر سے اس نوجوان کا انداز خاموش تھا اور نگاہیں اپنے ساتھی ہی کی طرح پُرعزم تھیں۔ یہ پہلے ہندوستانی نوجوان تھے جنھوں نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ آیا میں اب تک جن ہر فن مولا اور باتونی ہندوستانی نوجوانوں سے ملی ہوں وہ اپنے شدید اور جذباتی ردِعمل کے ساتھ کیا واقعی صحیح ہندوستانی نمونے تھے؟ وہ لوگ یقیناً کم سخن نوجوانوں سے اتنے ہی مختلف تھے جتنے **نارڈکس** (Nordics) اور **لاطینی** ایک دوسرے سے ہوتے ہیں۔

۱۹۲۶ء میں **ذاکر حسین**، ہندوستان واپس آئے۔ جرمنی میں انھوں نے برلن یونیورسٹی سے **معاشیات** میں **ڈاکٹریٹ** کی ڈگری لی۔ یہاں ہندوستان آکروہ جامعہ کے پرنسپل (سربراہ) بنے۔ آدمی کو پرکھنے کا ملکہ اوراپنی ترغیبی صلاحیت کی مدد سے انھوں نے اس نئے ادارے کے لیے بڑے لائق ساتھی چنے۔ ان ہی ساتھیوں میں **مجیب** بھی تھے۔ میں جب دہلی گئی تھی اس وقت **ذاکر حسین** نوبرس سے جامعہ کی سربراہی کر رہے تھے۔

ڈاڑھی ان کے اب بھی تھی اور وہی گول چہرہ، جس پر وقت کی دست برد نے کوئی کھرونچا نہیں لگایا تھا مگر اس وقت مجھے ایسا ضرور لگا تھا کہ ان کے خدوخال پر کسی مسلسل تھکن کی پرچھائیاں یقیناً ہیں۔ ان کے اس حال میں اپنے عہدے کی ہزار رنگ دشواریوں اور نامساعد اور تلخ ماحول میں پریشان سراسیمہ اور بدّدل نہ ہونے کی مسلسل سعی کا بھی کچھ نہ کچھ حصہ تھا۔ ان پر ایک محو فی الذات رہنے کی سی کیفیت طاری تھی۔ وہ محویت، وہ کھویا کھویا پن جوان لوگوں میں ہوتا ہے جو کسی ایک مقصد کی دھن میں ڈوبے رہتے ہیں۔ میں نے ان کے جذبات سے عاری اس مکھوٹے پر تبدیلیاں بھی اکثر دیکھیں۔ میں نے انھیں انتہائی غصے میں بھی دیکھا اور بے بسی کی آنسوؤں سے لبریز ان کی آنکھیں بھی دیکھیں۔ مگر انھوں نے اپنے آپ پر قابو ہمیشہ رکھا۔ یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوتی تھی کہ مغرب سے ان کی اتنی واقفیت نے ان میں وہ احساسِ کمتری نہیں پیدا کیا جس کا اظہار سرپرستانہ انداز اور لوگوں کی پیٹھ ٹھونکنے اور دوسروں کے سروں پر دستِ شفقت رکھنے میں ہوتا ہے اور جس نے ہندستان کے دورے میں **آلڈس ہکسلے** کو بہت برافروختہ کیا تھا۔

اس حلیم اور بردبار شخص کو جو چیز سب سے زیادہ تکلیف دیتی ہے وہ ہے تنگ نظری، جھوٹ اور خودغرضی۔ یہاں کچھ لوگ ہیں جو نہ صرف جھوٹ بولتے ہیں بلکہ اپنی ان اختراعات پر انھیں یقین بھی ہوتا ہے۔ یہ بات انھوں نے متعدد بار کہی۔ بہرحال یہ بات کوئی ہندستانی خصوصیت نہیں ہے۔ جھوٹ کو موثر بنانے کے لیے اس کے ساتھ یقین ضروری ہے۔

سچائی سے اس بے لوچ لگاؤ نے **ڈاکٹر ذاکر حسین** کو **ڈاکٹر انصاری** کا تقریباً مثنیٰ بنادیا تھا۔ **ڈاکٹر انصاری** کے ساتھ اپنے دوماہ کے قیام میں ہم نے ہندستان کی سیاست اور یہاں کے سیاست دانوں سے متعلق تقریباً ہر پہلو پر تبادلہ خیال کیا مگر اس ساری بات چیت میں سچائی اور اس کے معیاروں سے

برائے نام گریز کو بھی انھوں نے کبھی معاف نہیں کیا۔ وہ ہر اس شخص کے ساتھ تو ہو سکتے تھے جو ایسی کامیابیوں پر ناکامیوں کو ترجیح دیتا ہو کہ جن کے حصول میں اصولوں کو قربان کرنا پڑتا ہو مگر کسی ایسے شخص کا ساتھ دینا ان کے لیے ناممکن تھا جس نے وفاداری کا دامن چھوڑا ہو یا اچھے مقاصد کے لیے برے طریقے اپنائے ہوں۔

اس لحاظ سے **ڈاکٹر ذاکر حسین** کچھ تھوڑے مختلف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ صلاحیت اور کردار والا شخص بالآخر کامیاب ہی ہوتا ہے۔ ان کے اس عقیدے ہی نے ان کو ایک کامیاب **معلم** اور ساتھیوں کی ہمت بڑھانے والا قائد بنا دیا۔ انھوں نے ہمیشہ کچھ یہ تاثر ڈالا کہ کسی اچھے مقصد میں جس کے حصول کے لیے کوشش بھی اچھی کی گئی ہو کامیابی لازمی ہے۔ اسی وجہ سے ان کے زیرِ ترتیب رہنے والے افراد مایوسی و ناامیدی کا شکار شاید ہی کبھی ہوئے ہوں۔ وہ بار بار یہ کہتے تھے کہ سیاست میں ناکامیاں ان لوگوں کی وجہ سے ہوتی ہیں جو کارفرما سماج اور اقتصادی عوامل سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ سیاست کے میدان میں قدم رکھنے سے پہلے لوگوں کو سماج سے متعلق بنیادی سوالوں سے واقف کرایا جانا چاہیے۔ ایک **معلم** کے لیے یہ ایک مناسب اور صحت مند مفروضہ ہے۔

عورتوں کی آزادی پر بات کرتے ہوئے انھوں نے ہمیشہ کہا کہ تعلیم اولین ترجیح ہے۔ عورتوں کو اجازت دی جانی چاہیے کہ وہ جو کرنا چاہتی ہیں وہ کریں۔ ان کا خیال تھا کہ عورتوں کو انتہائی جدید طرزِ زندگی اختیار کرنے پر مجبور کرنا ان پر اتنا ہی ظلم کرنا ہے جتنا کہ انھیں پردے اور چہار دیواری میں محبوس رکھنا۔ مقصد کچھ ہو ظلم بہر حال ظلم ہے اور یہ ظلم ہی ہے جو بالآخر مشرق کے مجہول اور مغرب کے مشین زدہ اور مشین نما افراد پیدا کرتے ہیں۔ جامعہ کے تمام اساتذہ کا رویہ اپنی بیویوں کی طرف یہی تھا۔ بیویاں جو ایک عبوری دور سے گزر رہی تھیں ان میں سے کچھ پردے میں تھیں تو کچھ جزوی طور پر آزادی کی زندگی گزارتی تھیں اور بعض نے اسے ترک ہی کر دیا تھا۔ یہ ساری خواتین اپنی اپنی مخصوص اور مضبوط شخصیتیں رکھتی تھیں مگر بچیوں کو تن دہی اور احتیاط کے ساتھ تعلیم دی گئی تھی۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ، مدرسہ ابتدائی کے لیے اساتذہ تیار کرتی ہے۔ کیونکہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے بتایا:

یہی لوگ ہیں جن کی ہمارے یہاں سب سے زیادہ

قلت ہے۔ سرکاری یونیورسٹی (اسٹیٹ
یونیورسٹی) کے گریجویٹس اس کام کو اپنی
حیثیت اور اپنے وقار سے کمتر سمجھ کر شاذ ہی
پرائمری اسکولوں میں استاد بنتے ہیں۔ اپنے ان
لوگوں کو کام دلانے میں کچھ دشواری ضرور
ہوتی ہے مگر چونکہ جامعہ میں تربیت
حاصل کیے ہوئے استاد لائق اور کارگزار ہوتے
ہیں اس لیے انہیں بہر حال ملازمت مل جاتی ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کے تعلق سے میں محسوس کرتی ہوں کہ اس حقیقت سے وہ اچھی طرح واقف تھے کہ ہندستان میں تعلیم Top Heavy (اوپر وزنی اور نیچے ہلکی) تھی اور یہ کہ اب وقت آ گیا ہے کہ توجہ کو پرائمری ایجوکیشن کی طرف مبذول کیا جائے:

آپ کے گریجویٹس کو نوکری ملنے میں دشواری
کیوں ہوتی ہے؟

ہماری تعلیم **اردو** میں ہوتی ہے۔ ہم **انگریزی** محض ایک زبان کی حیثیت سے پڑھاتے ہیں۔ یہ ایک نئی بات ہے۔ بہت کم ادارے ایسے ہیں جو ملکی اور علاقائی زبانوں کو ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے استعمال کرتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ ایسا کیا جانا چاہیے۔ اگر **اردو** کو ایک جاندار اور جدید زبان بنانا ہے تو ہمیں اس لائق بننا ہوگا کہ ہم سائنسی افکار کے اظہار کے لیے اسے استعمال کر سکیں۔ لیکن **اردو** میں پڑھانا ہمیں حکومت کی امداد سے محروم کر دیتا ہے اور سرکاری سرپرستی سے محروم ایسے اسکولوں سے نکلنے والے طالبِ علموں کو روزگار ملنے میں کچھ دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بہر حال ہم ریاستی امداد کو یا کسی بھی معاونت کو خوش آمدید کہیں گے۔ شرط صرف یہی ہے کہ اعانت کرنے والے ادارے یا افراد ہمارے تدریسی پروگراموں میں مداخلت نہ کریں۔

تحقیقی کام کرنے والوں کی تربیت کے لیے پوسٹ گریجویٹ کلاسز ہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت اطمینان ہوا کہ تاریخ کے میدان میں ان لوگوں کی تحقیقات اور ان کے مطالعات سیاسی رنگ آمیزیوں

سے پاک تھے۔ مزید یہ کہ عالمی مسائل میں طالبِ علموں کی دلچسپی بڑی حقیقی تھی اور یہ لوگ ان مسائل کا مطالعہ امکانی حدوں تک کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ مشرق میں عموماً اور ہندستان میں خصوصاً یہ دونوں نکات بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ہندو ذہنیت کا تحدیدی کردار، ہندستانیوں کو ہندستان سے باہر ہونے والے واقعات کی طرف سے کم وبیش بے پرواہ اور بین بین بنا دیتا ہے اور نئے نئے جذبہ قوم پرستی سے پیدا ہونے والا جوش وخروش معروضیت کے لیے کم ہی امکانات چھوڑتا ہے۔ دوسری طرف مسلمان ہیں جو ذہنی طور پر زیادہ بین الاقوامی ہوتے ہیں۔ باہر کی دنیا سے ان کی دلچسپی اور اگر اسلامی ملکوں کے تعلق سے ہو تو انھیں ہندوؤں کے ذہن میں پان اسلامسٹ قرار دے دیتی ہے اگر ان کی دلچسپی کا رُخ اسلامی ملکوں کے بجائے مغرب کی طرف ہو تو یہ مغربی استعماریت کے ہم درد اور ہم نوا گردانے جاتے ہیں۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ بعض افراد ایسے ہوں جن پر یہ الزام شاید حق بہ جانب بھی ہو مگر بحیثیت مجموعی یہ صورتِ حال اس لیے ہے کہ مسلم ذہن جغرافیائی حدوں کی پابندیوں سے انکار کرتا ہے۔ بیرونِ ہند سے یہ دلچسپی جو جامعہ میں پائی جاتی ہے ایک ضروری اور صحت مند عنصر ہے۔ صحت منداور ضروری اس لیے کہ جامعہ پر ہندوستانی مفاد سے عدم وفاداری کا شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ جامعہ اپنے استادوں اور طالب علموں کو وسیع النظری عطا کرتی ہے اور ان کے اندر تقابلی مطالعے کا شوق بھی پیدا کرتی ہے اور صلاحیت بھی۔

جامعہ کے سامنے ایک اور مقصد ہے جو ابھی تک حاصل نہیں ہوا ہے۔ وہ مقصد ہے پیشہ ورانہ تربیت کے لیے توسیعی نصاب کا اہتمام کرنا۔ متمول مسلمانوں کے لیے یہ نیک نامی اور اعزاز کی بات ہوگی اگر وہ اس مقصد کے حصول میں اعانت کے لیے آگے آئیں۔ ہندستان میں دست کاروں پل سازوں اور میکانکی کام کرنے والے ماہر کام گاروں وغیرہ کی بڑی کمی ہے اور نچلے متوسط طبقے کے پست معیارِ زندگی کو بلند کرنا ان لوگوں کی زندگیوں کو بہتر کیے بغیر ممکن نہیں ہے۔ ہندو اداروں اور تنظیموں کی ایک معتد بہ تعداد ہے جو کسی قدر ایسے کام گار فراہم کرتی ہے۔ دیہی علاقوں میں گاندھی جی کی تنظیمیں اس سمت میں اچھی خاصی مستعدی سے کام کرتی ہیں۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ شہروں اور قصبوں میں ان طبقات کے لوگوں کی تربیت کا اہتمام کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں میں ایسے لوگ بہت کم ہوں گے جنھیں متوسط طبقے کا کہا جا سکے۔ اس بات کو جتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس طبقے کے بغیر کوئی سماجی

توازن قایم نہیں کیا جاسکتا۔ مجھے بتایا گیا کہ یونیورسٹی کے تربیت یافتہ مسلمان جو کوئی کام نہیں حاصل کر پاتے ہیں وہ ایک غیر مطمئن سیاست داں بن جاتے ہیں اور کوئی تعمیری سماجی کام نہیں کرتے۔ دوسری طرف غریب آدمی کے لیے روزگار کا کوئی امکان کہیں نہیں ہوتا سوائے نئی نئی قایم ہونے والی فیکٹریوں میں۔ میرے ایک ہندو دوست نے مسلمان کام گار پر ہندستان کو صنعتی ملک بنانے کے امکانات بڑھانے کا الزام لگایا۔ بعض لوگوں نے تو اسے بدیسی سرمایہ دار کا آلہ کار تک قرار دیا۔ اس صورتِ حال کو تبدیل کرنا اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک مسلمان کو، ہندوؤں ہی کی طرح اس معیار کی تربیت نہ دی جائے کہ وہ بھی دیہی صنعتوں اور قصباتی حرفوں میں مفید طور پر شریک ہونے کے لائق ہو جائیں۔

جامعہ اپنی تعلیم کی اساس مذہب پر رکھتی ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خود ایک مذہبی آدمی ہیں۔ اگرچہ وہ اس کے بارے میں گفتگو زیادہ نہیں کرتے ہیں۔ وہ ایک عملی (*Practicing*) مسلمان ہیں۔ وہ سور کا گوشت بھی نہیں کھاتے اور شراب بھی نہیں پیتے۔ میرا خیال ہے کہ نماز پابندی سے پڑھتے ہیں۔ انھوں نے کہا تمام عمل اور عقیدے ایمان سے جنم لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک داخلی نظم وضبط جسے بہرحال ہر آزاد فرد کو اپنانا چاہیے، عقیدے کے بغیر ممکن نہیں۔ اگر آپ کمیونسٹوں کو چھوڑ دیں تو اس اندازِ فکر کے معاملے میں ہندوستانی مصلحین میں مثنیات نہیں ہیں۔ مگر کمیونزم تو خود ایک سماجی عقیدہ ہے۔

مذہب کی طرف یہ غیر متبدل رویہ صرف ہندو ازم اور اسلامی فطرت کی بنا پر نہیں ہے۔ ایسا میرا خیال ہے، جزوی طور پر کچھ تو اس لیے کہ ہندوستان میں مغربی طرزِ فکر اور مغربی تہذیب، فرانسیسی راہبوں کے بجائے اینگلوسیکسن رابطوں سے آئی اور اینگلوسیکسن میں مذہب اور سماجی ڈھانچے کی انقلابی شکست وریخت نہیں رہی ہے۔

اپنے مذہب اور اپنے مذہبی رجحانات کے باوجود ڈاکٹر انصاری کی طرح ڈاکٹر ذاکر حسین علم و دانش کی طرف سائنسی رویہ رکھتے ہیں۔ یہ دونوں پچھلی صدی کی سائنٹفک ایجادوں کی تصدیق وتائید کے لیے قرآن کی طرف رجوع نہیں کرتے ہیں۔ اسلامی دنیا کو اگر اپنی اخلاقیات کی اساس یعنی اپنے عقیدے اور ایمان کو ترک کیے بغیر جدید ہونا ہے تو اسے ان کی مثال اپنے سامنے رکھنا ہوگی۔ تجربے اور

مسلم دنیا کے مطالعات نے مجھے ان نتائج پر پہنچایا تھا۔ آج مسلمانوں کی فکر نشاۃِ ثانیہ کے آغاز والی عیسائی فکر سے بہت مختلف نہیں ہے۔ اس کے دو پہلو ہیں۔

۱۔ یہ طبعی اور مادی علوم کی تشریح صحیفوں سے کرنا چاہتی ہے۔ یہ بات عیسائیوں کے مقابلے میں مسلمانوں کے لیے نسبتاً آسان ہے کیونکہ قرآن تخلیق (*Creation*) کی وضاحت اولڈ ٹسٹامنٹ کی جیسی قطعیت کے ساتھ نہیں کرتا۔ مزید یہ کہ قرآن میں متعدد آیتیں ہیں جو سائنس کی بعض دریافتوں کی تصدیق کرتی ہیں اور یہی بات نشاۃِ ثانیہ کے عیسائی کے مقابلے میں مسلمان مفکر کے لیے اپنے عقیدے پر قایم رہنے کو مقابلتاً آسان بنا دیتی ہے۔

۲۔ مگر اس کے اپنے خطرات ہیں۔ ہر طبیعی مظہر کی وضاحت ایک ایسی کتاب میں تلاش کرنے کی ذہنی عادت جو بہرحال اخلاقیات کے معاملے میں رہنمائی کی کتاب ہے نہ کہ کوئی سائنسی دستاویز، بہت سے نوجوانوں کو مایوس کرتی ہے اور نتیجتاً عقیدے سے بھی محروم کر دیتی ہے اور اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے اخلاقی رہنما سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ اس دوسرے پہلو کی مثال کے طور پر ایک ترکی طالبِ علم کا حوالہ دوں گی اس نے کہا:

> میں اپنے آپ کو مسلمان نہیں کهه سکتا کیوں که میں اس بات کی وضاحت نہیں کر سکتا که Jonah مچھلی کے پیٹ میں کیسے رہے۔
>
> پھر تم اپنے کو مسلمان نه کهو۔
>
> نہیں میں یه بھی نہیں کهه سکتا که میں مسلمان نہیں ہوں۔ کیوں که انسانی تعلقات سے متعلق اسلام کے ضوابط اور انفرادی اخلاقی معیار ان تمام معیاروں کے مقابلے میں زیادہ قابلِ عمل اور زیادہ انسانی ہیں که جن سے میں واقف ہوں۔
>
> تو پھر تم اخلاقی اور سماجی تعلیمات کو لے لو اور جونا اور مچھلی کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔

میں یہ بھی نہیں کر سکتا۔ مذھب کو کلی طور پر
اپنا نا چاھیے یا پھر اس سے بالکل قطع تعلق کر
لینا چاھیے۔ میں ان لوگوں کو برداشت نہیں کر
سکتا جو اجزاء کی وضاحت مغلق اور مبھم
علامتیت یا اشاریت کے وسیلے سے کرنے کی
کوشش کرتے ھیں۔ یہ تو ذھن کو سلانے کے
مترادف ھے۔

عیسائی دنیا کا ہر موجودہ رجحان طبعی اور اخلاقی سچائیوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنے کا ہے اور **جامعہ** اس سمت میں صحیح راہوں پر کام کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

جامعہ میں مجھے آزادی اور نظم وضبط کا جو امتزاج نظر آیا وہ مجھے مستحکم اور خوش گوار ترین تعلیمی کامرانی لگی۔

چھوٹی جماعتوں میں آزادی بھی تھی اور نظم وضبط بھی اور دونوں کا باہمی تناسب وتوازن نہایت مناسب تھا۔ پوسٹ گریجویٹ کلاسز میں آزادی شعوری طور پر دی گئی تھی مگر طالبِ علم کا رضا کارانہ داخلی نظم وضبط ضروری تھا۔ مثال کے طور پر میں دو اونچی جماعتوں کا ذکر کروں گی۔

سب سے پہلے ایک پروفیسر، **پروفیسر مجیب** کا ذکر کروں گی جن کے بارے میں، میں **ڈاکٹر ذاکر حسین** کے ایک ساتھی کی حیثیت سے بات کر چکی ہوں۔ **مجیب لکھنؤ** کے ایک ممتاز اور متمول خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ خاندان کے اراکین میں دو آرٹسٹ، ایک معروف سیاست داں اور ایک اول درجے کے وکیل اور بزنس مین تھے۔ **مجیب** نے ایک ہندوستانی اسکول میں بھی پڑھا تھا۔ اس کے بعد آکسفرڈ اور برلن یونیورسٹی میں بھی تعلیم حاصل کی۔ وہ ایک لائق ادیب اور ناقد ہیں۔ ان کی مغربی تعلیم نے انھیں اپنے مضمون پر کام کرنے میں مکتبی اور فرسودہ طریقوں سے احتراز کرنا سکھایا۔ اگر چہ ان کے مضمون کے مواد کی بنیاد ان کے کلچر کے ماخذ ہیں مگر پھر بھی وہ اس کو آسان اور واضح بنانے میں کامیاب رہے ہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ **اردو** میں ان کے اسٹائل اور ساتھ ہی اپنے موضوعات کی ان کی پیش کش نے بڑی تعداد میں نوجوانوں کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ اپنی ان صلاحیتوں

اور اپنی خاندانی حیثیت و مرتبے کی وجہ سے اگر وہ چاہتے تو عمدہ عمدہ اور منفعت بخش عہدے حاصل کر سکتے تھے مگر انھوں نے **ڈاکٹر ذاکر حسین** کے ساتھ کام کرنے کو ترجیح دی جن کے مقاصد اور ان مقاصد کو حاصل کرنے کے ان کے طریقوں نے **مجیب** کو متاثر کیا اور وہ انھیں اچھے لگے۔ اس لیے انھوں نے جامعہ میں ایک مفلس **پروفیسر** کی حیثیت کو قبول کیا۔ جو لوگ جامعہ میں کام کرتے تھے ان کے لیے ضروری تھا کہ وہ آرام و آسایش کی زندگی کا خواب نہیں دیکھیں گے اور سرو سامان پر بے سروسامان کو ترجیح دیں گے۔ جامعہ میں کام کرنے والے تمام لوگ، بشمول پرنسپل سب **پچھتر روپے** ماہانہ تن خواہ پاتے ہیں جو ان کے سروں پر ایک چھت اور سادہ ترین زندگی گزارنے کے لیے بہ مشکل ہی کافی ہوگی۔ جامعہ میں یہ ایک اصول کا معاملہ ہے۔ عسرت و تنگ دستی کی یہ رضا کارانہ ترجیح اگرچہ بے شمار ہندو اداروں میں روایت رہی ہے مگر مسلمانوں میں یہ ایک انوکھی بات ہے۔ یہ لوگ اس کی وضاحت یوں کرتے ہیں۔ اول تو یہ کہ اس کا مطلب کسی مقصد کے لیے داخلی نظم وضبط اور ایثار و قربانی ہے اور آدمی کو مادّی محرومیوں اور تنگ دستیوں کی آزمایش میں پورا اترنا چاہیے۔ دوسرے چونکہ اکثریت کے افسوس ناک حد تک پست معیارِ زندگی کو بہتر نہیں کیا جا سکتا اس لیے ان لوگوں کو جو تعلیم دینے کا دعویٰ کرتے ہیں اکثریت کی تکلیفوں میں حصہ بٹانا چاہیے اور ظاہری فرق کو کم سے کم کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ یہ درست اور معتبر نفسیات ہے اور غریبوں میں جامعہ کی مقبولیت کا سبب۔ یہ ان لوگوں کے لیے صحیح تعلیمی اصول بھی ہے جو تعلیم میں دوسری تمام چیزوں کے مقابلے میں اخلاقی اقدار اور داخلی نظم وضبط پر زور دینا چاہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ فرد اور جماعت دونوں کی آزادی کے حصول کا یہی واحد ذریعہ ہے۔

میں تاریخ کی ایک جماعت (کلاس) میں گئی جس میں صرف لڑکے پڑھتے تھے۔ ان طالبِ علموں میں بہت سے ایسے تھے جن کی عمریں استاد سے زیادہ تھیں۔ مگر اس کم عمر آدمی کے رعب اور دبدبے سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ تمام طالبِ علم اور ان کے ساتھ استاد سب کے سب فرش پر بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے سامنے نیچے نیچے ڈسک رکھے ہوئے تھے۔ اردو میں دیا جانے والا لکچر تو میں سمجھ نہ سکی مگر تختہ سیاہ پر بنے ہوئے ڈائی گرام اور دوسری شکلوں سے یہ بات واضح طور پر سمجھ میں آرہی تھی کہ گفتگو ھندوستان کی تاریخ کے ایک مخصوص عہد سے متعلق ہے۔ استاد نے اپنے موضوع پر بات کی۔

اسے آگے بڑھایا اور گفتگو میں تقابلی زمانے کے اہم رجحانات پر سے اپنی توجہ نہیں ہٹائی۔ استاد اور طالبِ علموں نے حالات وواقعات اور اعداد وشمار پر بڑی ذہانت، معروضیت اور انتہائی آزادی کے ساتھ تبادلہ خیال کیا۔

اسی طرح اخلاقیات کے موضوع پر پوسٹ گریجویٹ کلاس کا ایک لکچر ہے۔ پروفیسر ایک ہندوستانی عیسائی ہیں۔ ان کے انتہائی سلیقے سے تیار کیے ہوئے سبق میں، جب بھی انسانی مساوات اور آزادی کا ذکر آتا تو ان کا جذباتی لہجہ اور انداز قابلِ دید ہوتا تھا۔ ان کے جذبات کی شدت کو دیکھ کر ایسا گمان گزرتا تھا کہ موصوف یا تو خود اچھوتوں سے تعلق رکھتے ہیں یا پھر انھوں نے اس طبقے کی زندگی کا انتہائی گہرا مطالعہ کیا ہے۔ وہ انگریزی میں بات کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ آدمی کے ذاتی فیصلوں اور اس کی شخصی خواہشات کے آزادانہ اظہار کے بغیر اخلاقیات کا کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے لب و لہجے میں یہ بات، ذات پات کی تفریق کے خلاف اعلانِ جنگ لگتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ظاہری علامتیں جو لوگ اپناتے ہیں خارجی اثرات کا نتیجہ ہو سکتی ہیں۔ کچھ عرصے بعد آدمی کا فیصلہ اور اس کی رائے ان علامتوں کے ماننے والوں اور ان پر ایمان رکھنے والوں کی پاسداری کے رنگ ہی میں رنگ جاتی ہیں اور یہ آدمی کو اس ذات (Caste) کی طرف لے جا سکتی ہے جس میں فرد کے انفرادی ذہن کی آزادی بالکل نہ ہو۔ پروفیسر موصوف ایک پڑھے لکھے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی تعلیم کسی جرمن یونیورسٹی میں ہوئی ہے۔ مگر ذات پات کے معاملے میں مجہول ذہنی رویے کے خلاف ان کی بغاوت نے ان کے اندر Castophobia پیدا کر دیا ہے۔ یہاں تک کہ وہ گاندھی کیپ کی بھی برائی کرتے ہیں جو یہاں طالب علم پہنتے ہیں۔ ان کے خیال میں یہ ٹوپیاں ایک نئی کاسٹ 'گاندھی کاسٹ' کی نشاندہی کرتی ہیں۔ طالبِ علم جنھوں نے یہ ٹوپیاں خود اپنی مرضی اور اپنی خواہش کے مطابق پہنی ہیں۔ پروفیسر کی باتوں کو بہر حال پوری توجہ اور احترام سے سنتے ہیں مگر پہنتے گاندھی کیپ ہی ہیں۔ بلوغت وپختگی برداشت اور آزادیِ رائے کا ایک امتزاج ہے جو نوجوان کو صرف اسی قسم کی تعلیم و تربیت فراہم کر سکتی ہے۔

جامعہ میں ابتدائی جماعتوں کی تدریس کے بارے میں کہنے کے لیے کچھ بہت نہیں ہے۔ آپ کو اس جیسی تعلیم مغرب کے تمام اچھے اور جدید مدرسوں میں مل جائے گی۔ طریقہ ہائے

تدریس اورموادِ تعلیم یکساں ہے،نمایاں رجحان **اسلامی تاریخ اور ادب** پرتوجہ مرکوز رکھنے کا ہے۔ تدریس کا سارا کام **اردو** میں ہوتا ہے۔میں نے یہ ضرور محسوس کیا کہ اسکرپٹ (**عربی**) میں الفاظ کے تلفظ کو مناسب صوتی اشکال دینے کی کوشش پر خصوصی زور دیا جارہا تھا۔ہم ترکوں نے بھی، اپنے اسکرپٹ کو **عربی** سے بدلنے سے پہلے کچھ ایسی ہی کوششیں کی تھیں۔**جامعہ** کی یہ کوشش آیا **ہندوستان** میں **اردو اسکرپیٹ** کی مکمل تبدیلی کی علامت ہے۔اس پر ہم بعد میں بات کریں گے۔

نصاب کے اُس حصے میں جو بچے کی تخلیقی صلاحیتوں سے متعلق تھا مجھے دلچسپی زیادہ ہوئی۔اسی لیے میں نے ڈرائنگ اور حرفے کی کلاسوں میں خاصا وقت گزارا۔مشرقی تعلیم میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔قدیم مشرق نے تخلیق کی اس حیثیت کو پرت در پرت کچھ اتنے زبردست طریقے سے لپیٹ رکھا ہے اور روایتی مضامین کے عائد کردہ قوانین وضوابط میں یہ کچھ اس طرح مقید ہے کہ تخیل کو اپنے ہاتھ پاؤں پھیلانے کے لیے جگہ ہی نہیں ملتی۔ بچے میں اس جبلت کا یا تو دم گھٹ جاتا ہے یا اگر فرد کی غیر معمولی صلاحیت کی وجہ سے یہ بچ بھی جاتی ہے تو اس کا اظہار پامال راہوں میں ہی ہوتا ہے اور زندگی اور ساری ذہانت وطباعی، خطوط اور اشکال میں محبوس ہوکر رہ جاتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ **ہندوستان** نے ایسے فن کار پیدا کیے جو چاول کے دانے پر پورا قرآن لکھ سکتے ہیں۔

اس کے برعکس مغرب میں رجحان، زیادہ سے زیادہ آزادی کا رہا۔بعض بعض معاملات میں تو خارجی رہنمائی سرے سے ہی ختم کردی گئی ہے۔مغرب میں اس تدریس کا نتیجہ **الٹرا ماڈرن آرٹ**، **بے لگام تاثریت** (*Impressionism*) اور ایک مسخ حقیقت پسندی کی صورت میں نکلا کہ آپ یہ بھی نہیں بتا سکتے کہ آرٹسٹ نے عورت بنائی ہے یا کوئی گھڑا بنایا ہے یا چاندنی میں نہایا ہوا کوئی **گیاھستان**۔نظم وضبط کی اس مکمل معدومیت نے میں سمجھتی ہوں کہ مغربی ذہنیت پر ویسے ہی تباہ کن اثرات مرتب کیے ہیں جیسے مشرق میں ماہرینِ جمالیات نے بچے کی پہل اور اس کی تخلیقی صلاحیتوں کو پرتوں میں لپیٹ کر کیے ہیں۔طوائف الملوکی یا مجہولیت۔ان دونوں کے درمیان انتخاب کے لیے کچھ زیادہ نہیں ہے۔معلم کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ رہنمائی اور آزادی کو کس طرح ہم آہنگ کرے۔ میں نے دیکھا کہ **جامعہ** نے یہ کام خاصی خوش اسلوبی سے کیا ہے۔ بظاہر بے کار اور معمولی معمولی اشیا کو استعمال کر کے ننھے بچوں کا سیدھے سادے کھلونے اور عام استعمال کی چیزیں بنانا دیکھ کر حیرت عام ہوتی ہے۔

ڈرائنگس تو اور بھی زیادہ قابلِ توجہ تھیں۔ ان تصویروں میں فطرت کے مناظر تھے، لوگ تھے اور قدیم کہانیاں تھیں۔ کہانیاں جو ہم اہلِ مشرق ہمیشہ سے سنتے آئے تھے اور جانتے تھے مگر بچوں نے انھیں مختلف زاویوں سے دیکھا تھا اور اپنی نظر سے دیکھا تھا۔

جو بات مجھے سب سے زیادہ حیرت انگیز لگی وہ یہ تھی کہ ان کہانیوں میں جنھیں ان بچوں نے تصویروں میں پیش کرنے کی کوشش کی تھی خوف و ہراس کا کوئی عنصر کوئی شائبہ نہیں تھا۔ ایک آدم خور (دجّال) کی تصویر تھی ہم لوگوں کے لیے یہ ایک خوف و دہشت کی چیز تھی۔ جامعہ کے اس چھوٹے بچے نے اسے ایک مضحک اور دل چسپ روپ دے دیا تھا۔ بچوں کے ذہنوں کو خوف و ہراس سے پاک کرنا مشرق میں بڑی بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ گھر کی زندگی اسکول کی زندگی اور عام شہری زندگی۔ یہ سب کے سب بچے کی تربیت خوف سے کرتی ہیں۔ ڈنڈا، اور بدروحیں، پالنے سے قبر تک بچوں کا پیچھا کرتی ہیں۔ جامعہ نے اس صورتِ حال پر قابو پالیا ہے۔ اس کا اظہار اسکول کے ہیڈ ماسٹر کولمبیا یونیورسٹی کے پڑھے ہوئے **ڈاکٹر اکبر علی** کے لفظوں میں یوں ہوتا ہے:

> بچے جب پہلی بار آئے تو سیدھے سادے الفاظ بھی ان کے سامنے بولنا مشکل تھا کہ وہ بات سننے سے پہلے بالکل اسی طرح اپنا ہاتھ اپنے سر کی طرف اٹھا لیتے ہیں جیسے کسی ضرب سے بچنے یا کسی وار کو روکنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ مگر چھے مہینے کے بعد یہ لوگ ڈانٹ ڈپٹ اور جھڑکی کو بھی جھیل لیتے ہیں اور آپ کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات بھی کر سکتے ہیں۔

یہ ردِ عمل اس برائی کی علامت ہے جس برائی سے مشرق نے بڑے نقصان اٹھائے ہیں۔ توقع صرف چوٹوں کی، اذیتوں کی۔ والدین، اساتذہ اور حکمران وہ چاہے دیسی ہوں یا بدیسی، سب ہی نے اکثر خوف و ہراس ہی کو ایک ہتھیار کی طرح استعمال کیا۔ ضرب، ضرب اور ضرب... نتیجہ ڈرا اور سہما ہوا فرد۔ ہزار طرح کے غیر صحت مند وسوسوں کا شکار یا موقع ملنے پر خود جارح اور زور زبردستی کرنے والا۔

مارو یا مار کھاؤ، مشرق کے بچے کی عملی فلاسفی معلوم ہوتی ہے۔ مشرق جب تک نظم وضبط اور آزادی کو اپنی تعلیم میں مناسب جگہ نہیں دیتا ہے اس وقت تک موقع آنے پر مشرقی ردعمل اپنے سارے ماضی پر اپنے حکمرانوں، دیسی اور بدیسی دونوں کے لیے کسی دھکے کی شکل میں ظاہر ہوگا۔

میں نے ایک ساری سہ پہر ان ننھے منوں کے ساتھ گزاری۔ پہلے ان کی نشست گاہوں میں۔ جو ہر قسم کے فرنیچر سے محروم تھیں بیٹھنے کے لیے صرف دریاں بچھی ہوئی تھیں۔ سب ان ہی دریوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ طالبِ علم بھی اور استاد بھی۔ زیادہ تعداد لڑکوں کی تھی۔ خال خال چھوٹی بچیاں بھی تھیں۔ عمر سب کی چھے سے نو برس کے درمیان ہوگی۔ یہ بات ظاہر تھی کہ **ڈاکٹر ذاکر حسین** سب ہی کے پسندیدہ تھے۔ چھوٹے بچے بھی اپنی قطاروں سے نکل نکل کر ان تک پہنچ جاتے تھے۔ وہ ایک ایسے درخت کی مانند لگتے تھے جس پر سرسبز وشاداب بیلیں چڑھ رہی ہوں۔ ننھے ننھے چہرے ان کے کندھوں پر سے جھانکتے تھے۔ بازو ان کی گود میں ہوتے تھے۔ وہ نہ تو ان بچوں کو تھپتھپاتے تھے نہ ہی انھیں اپنے سے دور کرتے تھے۔ اس کے برعکس ان کا جسم ان بچوں کی دل چسپی، ان کے آرام اور ان کے مزے کے مطابق، انداز اختیار کر لیتا تھا۔ اس منظر نے مجھے *Hampstead* کے ایک ٹیکسی ڈرائیور کی یاد دلا دی۔ گلہریاں، زندہ مخلوق ہیں غالباً سب سے زیادہ شرمیلی مخلوق، اس کا سارا بدن ان کے کھیل کا میدان تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے یہ خیال ہوتا تھا کہ دنیا ایک اچھے استاد ایک اچھے معلم سے محروم ہوگئی ہے۔

یہ بچے چوں کہ **انگریزی** نہیں جانتے تھے اس لیے **ڈاکٹر ذاکر حسین** نے ان کے سوالوں کا ترجمہ کیا۔ یہ بچے دوسرے مشرقی بچوں کے مقابلے میں زیادہ ذہین تھے۔

"تم کیا بننا چاہتے ہو"؟ میں نے ان سے پوچھا۔

زیادہ تر جواب تھے تاجر۔ اس کے بعد **ڈاکٹر**، ایک تھا جو **جہاز راں** (*Sailor*) بننا چاہتا تھا۔ ایسا کوئی نہیں تھا جو بڑا، افسر یا فوجی بننا چاہتا ہو۔ میں نے اسے ایک اچھی علامت سمجھا۔ جہاں تک ان کے پسندیدہ ہیروز کا تعلق ہے میں یہ دیکھ کر بہت متاثر ہوئی کہ ان میں سے کسی نے بھی کسی بادشاہ کا یا کسی کمانڈر کا نام نہیں لیا۔ اگر چہ ہندوستان کی تاریخ ایسے طمطراق والے ناموں سے بھری پڑی ہے۔ بس ایک استثنیٰ تھا خلیفہ **حضرت عمر** کا۔ بچوں نے مجھے بتایا کہ حضرت عمرؓ کا انتخاب انھوں نے اس لیے کیا ہے کہ ان کے علم میں حضرت عمرؓ سب سے زیادہ سچے اور انصاف پسند آدمی تھے۔ مگر سب سے زیادہ

پسندیدہ ہیرو ایک ہندوستانی تھا جس نے اپنے دوست کے لیے اپنی جان دے دی تھی۔ جان کے نذرانے کی حد تک دوست کا ساتھ دینا قابلِ پیروی بات ہے۔

"کیا یہ بچے نظمیں پڑھتے ہیں؟"

"کچھ بہت نہیں۔" **ڈاکٹر ذاکر حسین** نے بتایا *Public recitation* کے معاملے میں ان کی ہمت افزائی نہیں کی جاتی ہے۔ کیا ہندوستان میں اسکولوں نے بے شمار نوجوان مقرر نہیں پیدا کیے؟ ان بچوں کو اداکاری بہت پسند ہے اور اس میدان میں ان کی ہمت افزائی بھی کی جاتی ہے۔ یہ بچے مجھے ایک باغیچے میں لے گئے اور وہاں کی کھلی فضا میں مجھے ایک ڈراما دکھایا۔

خوبصورت باغ، آدھا گھاس کا لان اور آدھا سیمنٹ کا فرش۔ اس کے اوپر ایک سائبان۔ ایک چھوٹی سی جھیل، جس کے چاروں طرف چند درخت تھے۔ بچوں نے اپنے پسندیدہ جانور مجھے دکھائے اور یہ بھی بتایا کہ یہ جانور کیا کھانا پسند کرتے ہیں اور وہ کون سی چیزیں ہیں جو انھیں بالکل اچھی نہیں لگتیں۔ تمام جانور عام پالتو جانور تھے۔ ایک نٹ کھٹ بھورا بندر بھی تھا۔

ڈراما جھیل کے کنارے پیش کیا گیا۔ ڈرامہ اردو میں تھا۔ ایک ایسی زبان جو میں نہیں جانتی تھی۔ مگر نقلیں صحیح تھیں۔ بالکل اصل کے مطابق، ڈرامے میں ہر بچہ کوئی جانور بنا تھا۔ میں نے بندر کو فوراً پہچان لیا۔ اس کا درخت پر چڑھنا اور دوسرے جانوروں کا اس کا پیچھا کرنا۔ اس کا درخت کی شاخوں میں چھپ کر بیٹھنا بہت دلچسپ اور بڑا حقیقی تھا۔ ساتھ ہی دو ننھی (انسانی) چڑیاں بالکل جھیل کے کنارے چہچہا رہی تھیں۔ ان کا چہچہانا بڑا دل چسپ تھا۔ یہی ایک ڈرامہ نہیں تھا جو بچوں نے مجھے دکھایا۔ مزے کی بات یہ تھی کہ وہ جب بھی اداکاری شروع کرتے تھے تو دیکھنے والوں کو تقریباً بالکل بھول ہی جاتے تھے۔ اداکاری کرتے وقت خود آگاہی کی یہ معدومیت ان کا کمال تھا اور قابلِ تعریف تھا۔

بعد کو یہ لوگ مجھ سے ملنے سلام ھاؤس آئے۔ تین تین چار چار کی ٹولیوں میں۔ ان کے ساتھ ایک خوبصورت سی **جرمن خاتون (گریڈا فلپس بورن**۔ تمام بچے اور بہت سے بڑے بھی انھیں **آپا جان** کہتے تھے) تھیں۔ بچوں کی تربیت میں ان کا بڑا ہاتھ تھا۔ بچے کمرے میں بڑی اپنائیت اور بے تکلفی کے ساتھ رہے۔ ٹوٹے پھوٹے جملوں اور اشاروں میں ہونے والی دوستانہ گفتگو کے بعد ان لوگوں نے آپس میں کھیلنا کودنا شروع کر دیا۔ اچانک بچوں کی اس چھوٹی سی جماعت نے اذان کی آواز سنی۔ کھیل

کی دلچسپیوں کو چھوڑ کر سب کے سب سنجیدہ ہو گئے اور ایک **پٹھان** بچے کی قیادت میں باہر چلے گئے۔ یہ لوگ اب جا کر **بیگم انصاری** کے ساتھ مغرب کی نماز ادا کریں گے۔ **پٹھان** بچہ امامت کرے گا کہ اسلام میں یہ کام مرد ہی کا ہے۔ ان بچوں کی مذہبی تعلیم میں پنج وقتہ نماز اور با جماعت نماز خصوصیت کے ساتھ شامل تھی۔ نماز میں پڑھی جانے والی قرآن کی آیتوں کا یاد کرنا اور سیدھی سادی اخلاقی باتیں جاننا ہی ان کی تعلیم کا اہم حصہ تھا۔

مذہبی پہلو پر زور دینے والے معلم کا کہنا ہے:

> اسلامی نماز میں ادا کیے جانے والے تمام حرکات و سکنات، قیام، رکوع، سجود مکمل صفائی اور طہارت کے لیے نماز سے قبل وضو صحت وصفائی کے اصولوں کے عین مطابق ہے۔ یہ چیزیں بچوں میں صحت مند عادتیں پیدا کرتی ہیں۔ یہ اچھا نظم وضبط ہے۔

سیکولر معلم کا جواب ہوگا۔

> مگر کیا روزانہ کا غسل، کھیل اور ورزش یہی کام نہیں کرتے ؟
>
> بالکل کرتے ہیں۔ بلا شبہ کرتے ہیں۔ مگر عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ آدمی کھیل اور ورزش چھوڑ دیتا ہے۔ نماز کی عادت باقی رہتی ہے۔ ایک *Practicing* مسلمان کی اچھی صحت ، اچھے اخلاق اور طویل العمری سے کیا آپ انکار کریں گے؟
>
> میں بالکل انکار نہیں کرتا ہوں۔ مگر جسمانی حرکات و سکنات اور آیتوں کو (جن کے معنی

ان میں سے بعض لوگ نہیں جانتے ہیں) کے
دُھرانے کو مذہب سے آپ کیوں جوڑیں؟ اس کا
اخلاقی اثر کہاں ہوتا ہے؟

نماز پڑھتے وقت بچے کو ہمہ وقت یہ خیال
رہتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے رابطہ قایم کر رہا
ہے۔ اس تعلیم کو کہ ایک مذہبی آدمی کو شریف
النفس اور مہذب ہونا چاہیے بچہ اپنی عبادت
سے جوڑتا ہے۔ بچوں کو دی جانے والی مذہبی
روابط سے مبرا سیکولر اخلاقی تعلیم شاذ ہی ان
کے چال چلن اور اخلاق پر اثر ڈالتی ہے۔ بڑی
عمر کے لوگوں پر شاید کبھی کبھی اس کا اثر ہو
جاتا ہو مگر صرف غیر معمولی حالات میں۔
آدمی کو عام طور پر اچھائی کو خود اپنی
خواہشات اور اپنے ارادوں سے برتر سمجھنا
چاہیے۔ اس کا ایمان ہونا چاہیے کہ یہ ایک غیر
متغیر قانون ہے اور اس سب کو بچے کی تربیت
کے ابتدائی زمانے سے اپنایا جانا چاہیے۔

یہی باتیں ہیں جو جامعہ کے اساتذہ ہمیشہ کہیں گے۔ **مہاتما گاندھی** سے یعنی ہندو تصورات سے ان کی قربت کی وضاحت مندرجہ ذیل گفتگو سے ہوتی ہے۔ یہ بات چیت **مہاتما گاندھی** اور انٹر نیشنل و الینٹری سروس کے صدر Pierre Ceresole کے درمیان ہوتی ہے۔ Ceresole سوئٹزر لینڈ کے باشندے ہیں اور ایک **امن پسند** (*Pacifist*) ہیں۔ واردھا میں **گاندھی** سے ملاقات کے زمانے میں انھوں نے **مہاتما گاندھی** کی پرارتھنا سبھاؤں میں بڑی باقاعدگی سے شرکت کی۔ انھوں نے کہا:

"کسی ایك بات کی تکرار مجھے ناگوار لگتی ہے۔
یہ شاید میری ریاضیاتی افتادِ طبع کے باعث
ہو۔"
"مگر خود ریاضی میں اعشاریوں کی تکرار
ہوتی ہے۔"

مہاتما نے کہا:

"ہر اعشاریہ، ہر بار کسی نئی اور قطعی حیثیت
کے ساتھ آتا ہے۔"
"پھر بھی ، ہر تکرار ایك نیا مطلب رکھتی ہے۔ ہر
تکرار آپ کو اللہ سے قریب تر کرتی ہے ... میں
آپ کو بتاؤں کہ آپ یہاں کسی نظریہ ساز سے
بات نہیں کر رہے ہیں۔ اس کے برعکس ایك ایسے
فرد سے محوِ گفتگو ہیں جس نے اپنی ساری
زندگی میں کھی جانے والی ہر بات کا تجربہ کیا
ہے۔ یہاں تك کہ خود زندگی کے لیے ٹھہر نا اس
مسلسل عمل کے ٹھہرنے کے مقابلے میں زیادہ
آسان ہے۔ یہ روح کی ایك حقیقی احتیاج ہے۔"
"میں اس سے اتفاق کرتا ہوں۔ مگر ایك عام آدمی
کے لیے یہ محض ایك فارمولہ ہے۔"
"اچھی چیز تہمت کا ہدف ہوتی ہے۔ ریا کاری کی
کوئی گنجایش نہیں ہے۔ مگر ریا کاری کا شمار
اچھائی میں (*Ode to Virture*) ہوتا ہے اور میں
جانتا ہوں کہ دس ہزار ریا کاروں کے مقابلے

میں آپ کو لاکھوں ایسے سیدھے سادے لوگ مل
سکتے ہیں جنھیں اس میں تسکین ملتی ہے۔ اس
کی حیثیت اس مچان کی سی ہے جو عمارت کے
لیے ضروری ہوتا ہے۔"
"آپ یہ مانتے ہیں کہ عمارت کی تکمیل کے بعد
مچان کو ہٹادینا ہوتا ہے۔"
"جی ہاں۔ یہ ہٹا دیا جاتا ہے۔ جب یہ جسم باقی
نہیں ہوتا۔"

(ہریجن' شمارہ:۲۵ رمئی ۱۹۳۶ء ص:۲۵)

اس گفتگو میں دو نکتے ہیں جس پر معلم کو وہ چاہے مذہبی ہو یا مذہبی نہ ہو ضرور غور کرنا چاہیے۔

۱۔ کیا مذہب روح کی واقعی ضرورت ہے ؟

تاریخ کے انتہائی معروضی طالب علم کو یہ تو ماننا ہی چاہیے کہ ہاں ایسا ہے۔ سویت یونین جس نے بڑے منظّم طریقے پر اور بڑی ایمان داری کے ساتھ مذہب کو ہٹا کر عقلی اور مدنی اخلاقیات کا تجربہ کیا مگر کامیاب نہیں ہوا۔ کمیونسٹوں میں جو لوگ مذہب مخالف ہیں وہ اس حلقے سے تعلق رکھتے ہیں جس نے کمیونزم کو ایک نئے عقیدے کی طرح اپنایا عوام خصوصاً کسان نہیں بدلے۔ Fiilop Moller کی کتاب: *The Mind and Face of Bolshevism* میں ہم پڑھتے ہیں کہ کسان جو شبیہ یا تصویر گلے میں لٹکائے ہوئے پہلے پھرتا تھا، اب چھوڑ چکا ہے۔ تصویر اس کے گلے میں اب بھی ہے مگر اس پر شبیہ مشین کی ہے۔ امریکہ اور انگلستان جہاں قدیم چرچ اب تسکین نہیں پہنچاتے، مذہب کے نئے نئے روپ سامنے آئے ہیں۔ بسا اوقات انتہائی پاگل پن کے روپ۔

عقلیت پسندی کی سرزمین فرانس میں لوگ عجیب عجیب رواجوں کا ذکر کرتے ہیں۔ بھوت پریت کی پرستش اور کالے جادو کے چلن کا ذکر۔ دانش ور اور سائنس داں بھی اس سے محفوظ نہیں ہیں۔ اسی لیے اچھا خاصا مواد اور وافر اعداد وشمار ہیں جو آدمی کو یہ ماننے پر مجبور کرتے ہیں کہ مذہب یقیناً روح

کی ایک حتمی احتیاج ہے۔

۲۔ معلم انسانی فطرت کی اس حقیقت سے صرفِ نظر نہیں کر سکتا۔

معلمین کے ایک گروہ کا کہنا ہے کہ اسے (مذہب کو) بچوں کے چال چلن اور ان کی اخلاقی تربیت کی اساس کے طور پر استعمال کیا جانا چاہیے۔ ایک دوسرا گروپ ہے عقلیت پسندوں کا۔ ان کا اعلان ہے کہ مذہب کو مدنی اخلاقیات کی بھرپور تربیت سے بدلا جا سکتا تھا۔ بڑا منفعت بخش ہوگا اگر تمام مذاہب کے معلمین کی ایک عالمی کانفرنس ہو جو اس سوال پر اپنے تجربات کی روشنی میں تبادلۂ خیال کرے اور پھر فیصلہ سنائے۔ وہ زمانہ گیا جب لوگ بحث کرتے تھے کہ یہ مذہب سچا ہے یا وہ مذہب سچا ہے۔ ہم آج اس منزل پر ہیں جہاں ہمیں مذاہب کی طرف نہیں مذہب کی طرف ایک قطعی اور مشترکہ رویے کی ضرورت ہے۔ کیا ہم عقیدے کو وہ واحد وسیلہ سمجھتے ہیں جس سے تمام اعمال کا آغاز اور تعین ہوتا ہے؟ اصل سوال یہ ہے۔

اس سوال کے بارے میں جامعہ کے رویے کا خلاصہ مندرجہ ذیل جملوں سے کیا جا سکتا ہے:

کوئی مسئلہ وہ چاہے اخلاقی ہو چاہے مادی، ایسا نہیں ہے جس کا جائزہ ہمارے احکامات کی روشنی میں نہ لیا جاسکے۔ طہارت، ضبط و صبر، چال چلن اور صحت و تندرستی کے اصول، انسان اور انسان کے درمیان دائمی مساوات کے واضح اصول ہیں۔ اقتصادی تربیت و ہم آہنگی کے قاعدے ہیں جو قابلِ عمل ہیں اور ہمیشہ قابلِ عمل رہیں گے۔ ہم جب بچوں کو بتاتے ہیں کہ یہ چیزیں زندگی کے ضروری اصول ہیں تو ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ایک بہتر اور زیادہ قابلِ عمل دنیا کی بنیاد رکھ رہے ہیں۔

آخری بار جامعہ کو میں نے اس وقت دیکھا تھا جب دھلی سے باہر اراکینِ جامعہ اپنی نئی عمارتوں کی بنیاد رکھنے کے لیے جمع ہوئے تھے۔ جامعہ کے پاس اچھی خاصی زمین ہے جہاں وہ ایک جدید اور بڑا ادارہ قایم کرنے کی آرزو رکھتی ہے۔تقریب ایک بڑے شامیانے کے نیچے ہوئی تھی۔**ڈاکٹر انصاری** نے صدارت کی۔معزز ہندو اور ممتاز مسلمان لیڈر موجود تھے۔ بڑی رقمیں ہندوؤں سے ملی تھیں جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ جامعہ کی تعلیمی اہمیت اور اس کی قدر و قیمت ممتاز مسلمانوں سے زیادہ ہندو سمجھتے تھے۔مسلم عوام نے بھی اپنی محدود آمدنیوں میں سے چھوٹی چھوٹی رقمیں نکال کر چندہ دیا تھا۔مسلم عوام کا رویہ بڑا خوش آیند تھا۔

سب سے چھوٹے بچے کو سنگِ بنیاد رکھنا تھا۔ وہ چبوترے پر کھڑا تھا اور بڑوں کے بیچ کچھ سراسیمہ سا لگتا تھا۔چبوترے کے سامنے میرے تمام نوجوان دوست تھے۔ان کے انداز انتہائی مہذب تھے۔چبوترے پر ہونے والی تقریروں کو انھوں نے بڑی سنجیدگی اور بڑے غور سے سنا مگر تھوڑی دیر بعد ان میں تھوڑی اضطرابی کیفیت پیدا ہوئی اور انھوں نے آپس میں باتیں کرنا شروع کر دیں۔ان کے استادوں نے جو ان کے درمیان بیٹھے ہوئے تھے اس سلسلے میں کچھ نہیں کہا۔غالباً یہ جانتے تھے کہ ایسی صورت میں کیا ہوگا۔ایک سات آٹھ سال کی بچی اٹھی اور اس نے صورتِ حال کو ٹھیک کیا۔ یہ ایک دبلی پتلی دھان پان سی بچی تھی۔ سیاہ چمکتی ہوئی آنکھوں والی۔اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ کچھ پسلیوں نے اس کی کہنی کی ضربیں محسوس کیں اور اضطرار اور بے چینی کا خاتمہ ہو گیا۔ یہ بچی مجھے جدید ہندوستانی عورت کی علامت معلوم ہوئی۔مردوں کو سلیقہ سکھانے کی اپنی صلاحیت کے ثبوت کے ساتھ اور اپنے حقوق پر اصرار کرتے ہوئے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ
اہلِ شوق کی بستی

پروفیسر سید اطہر رضا بلگرامی*

۱۹۶۵-۱۹۷۱ء کے ماحول سے نکل کر ۱۹۷۱ء میں جب میرا جامعہ ملیہ اسلامیہ میں بہ حیثیت لکچرر (شعبہ معاشیات) تقرر ہوا تو جہاں ذہن نے ایک طرف زندگی کی راہ ہموار ہونے کی طمانیت کا احساس کیا تو دوسری طرف جامعہ ملیہ اسلامیہ کے مکتب نما ماحول نے اُسی قدر مایوس وافسردہ بھی کیا۔ یہ کیسی یونی ورسٹی ہے جو چاروں طرف پھیلے ہوئے سنّاٹوں کے درمیان چند پستہ قد بکھری بکھری عمارتیں جن کے درمیان سے گزرتی ایک عوامی شاہ راہ جو عوام کی مختلف النوع سرگرمیوں میں مصروف، اور انہی کے درمیان شاہ راہ کو اِدھر سے اُدھر پار کرتے طلبا وطالبات۔ ابتدا میں تو اِس ماحول سے بڑی مایوسی ہوئی لیکن جب رچ بس گیا تو اپنی ذہنی نہ پختگی کا شدید احساس ہوا۔

جیسے جیسے جامعہ سے مانوس ہوتا گیا، اُس کے تہذیبی ومعاشرتی ماحول میں رچا بسا،

* سابق پروفیسر، شعبہ معاشیات، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

لکھنؤ یونی ورسٹی بہت چھوٹی اور علی گڑھ اُسی قدر وسیع لگنے لگی۔ یہ محدودیت اور وسعت محض رقبہ وعمارتوں کے اعتبار سے نہیں بلکہ تہذیبی شناختوں کے اعتبار سے تھی۔ تہذیبی اعتبار سے لکھنؤ یونی ورسٹی نے اپنی کوئی منفرد شناخت قایم نہیں کی جب کہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی نے ضرور قایم کی، لیکن وہ بھی اپنے دائرے میں محدود رہی۔ یونی ورسٹی کی یہ تہذیبی شناخت علی گڑھ شہر واطراف کو متاثر نہ کرسکی۔ اِس اعتبار سے جامعہ ملیہ اسلامیہ بہت وسیع معلوم ہوئی۔ علی گڑھ کی طرح ایک منفرد شناخت قایم کرنے میں شاید ناکامیاب رہی ہو، لیکن معاشرتی وتہذیبی شناختوں کے وسیلے سے اپنے گرد وپیش کی اکھڑ مزاج آبادیوں کو جس طرح مہذب بنایا ہے اس کی مثال کوئی دوسری یونی ورسٹی پیش نہیں کرسکی۔ بہ ظاہر یونی ورسٹی کا نہ کوئی منظّم اور وسیع کیمپس ہے اور نہ پُرکشش عمارتیں۔ لیکن تہذیبی اثر انگیزی کا یہ عالم کہ اطراف میں چاروں طرف پھیلی ہوئی ناخواندہ اکھڑ گوجر مردوزن کی آبادیوں کو 'جامعہ کے ماٹر' کا احترام عبادت کی طرح سکھا دیا۔ جولینا سے لے کر اوکھلا گاؤں اور اطراف کی تمام بستیوں میں آباد گوجر، اُن کی خواتین و بچے 'جامعہ کے ماٹروں' کی خدمت کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کی گہرائی وگیرائی کا اندازہ اُس وقت ہوا جب ایک خاکروب ۱۵؍ اگست کو **فیکلٹی آف سوشل سائنس** پر **ترنگا جھنڈا** لہراتے تمام اساتذہ کے ہمراہ کھڑے پایا گیا۔ اُس نے سب کے ساتھ کھڑے ہوکر، بغل میں جھاڑو داب کر '**جھنڈے**' کو سیلوٹ کیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ تو اُس وقت سمجھ میں آئی جب اوکھلا، **نرائن سنگھ کواٹرس** میں میرا قیام تھا، میری بچی کی پیدائش پر تھوڑی دور پر رہنے والی ایک **گوجر خاتون** میری اہلیہ کو مبارک باد دینے گھر پہنچی، وہ اپنے پیلے دوپٹے سے گائے کے دودھ کا لوٹا ڈھکے اہلیہ سے اپنے مخصوص لہجے میں کہنے لگی: ''ہم روز دودھ پلاویں ہیں، ماٹر کی بٹیا بڑی بھاگوان ہووے۔'' روز دودھ آتا رہا اور جب میں نے ایک دن اُس کے پیسے پوچھے تو شدید صدمے کی ملی جُلی کیفیت کے ساتھ سر جھکائے کھڑی رہی۔ گویا میں نے پیسے پوچھ کر اُس کی بڑی بے عزتی کردی۔ خالی لُٹیا پکڑے انتہائی شکست خوردہ قدموں کے ساتھ پلٹ کر جانے لگی۔ اور جاتے جاتے شکستہ آواز میں

یہ کہتی جارہی تھی: "کا ماٹّر صاحب ہم بٹیا کے دودھ کے پیسے لیے ہو۔" دودھ مہینوں آتا رہا اور میری کبھی ہمت نہ پڑی کہ اُس کے پیسے پوچھتا۔ اُس خاتون کا یہ عمل یقیناً اُس کی تہذیب و معاشرت کا حصہ ہے لیکن جامعہ کے 'ماٹروں' کے احترام سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

جامعہ کے بزرگ اساتذہ اپنے طرزِ عمل، رکھ رکھاؤ، بات چیت و برتاؤ سے ذہنوں کی تربیت کرتے رہے اور اُن کی معاشرت کے درمیان رہ کر اُن کو نکھارتے رہے۔ اِس کی جھلکیاں وقتاً فوقتاً نظر آتی رہیں اور آج بھی خاصی ترقی کے باوجود یہ رواداریاں قایم ہیں۔ یہ ایک دستور تھا کہ شام کو بزرگ اساتذہ سڑک کے کنارے ٹہلنے نکلتے تھے۔ شیروانیاں زیبِ تن کیے ہوئے، ہاتھوں میں چھڑیاں، خراماں خراماں مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے اوکھلا ہیڈ کی طرف یا ہائر سیکنڈری کی طرف جاتی ہوئی سڑک پر چلتے نظر آتے تھے۔ اُن کے پیچھے اُن کی بیگمات غراروں میں ملبوس ٹہلتی نظر آتیں۔ وہیں ہائر سیکنڈری کی جانب سڑک کے ایک طرف خالی میدان تھا جو جھاڑ جھنکار سے پُر تھا۔ وہاں اوکھلا گاؤں کی عورتیں گروہ در گروہ شام کو حوائجِ ضروری کے لیے آتی تھیں۔ طریقہ کار یہ تھا کہ گروہ کی بزرگ عورت سامنے ہوتی اور اُس کے پیچھے دیگر بہو بیٹیاں ہوتیں جو قطار کی صورت اپنے اپنے لہنگے کے گھیرے کو پھیلا کر بیٹھتیں اور دنیا بھر کی باتوں میں مصروف ہو جاتیں۔ یہ شام کا وہ وقت ہوتا جب جامعہ کے بزرگ اساتذہ ٹہلنے کے لیے نکلتے۔

کسی مرد کو قریب سے گزرتے دیکھ کر آگے بیٹھی بزرگ عورت سب سے پہلے کھڑی ہو جاتی اور اُس کی دیکھا دیکھی دیگر عورتیں بھی کھڑی ہو جاتیں۔ مرد افراد کے گزر جانے کے بعد پھر بیٹھ جاتیں۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ جامعہ کے چند اساتذہ مع خواتین کے گزر رہے تھے کہ حسبِ دستور بزرگ عورت کھڑی ہو گئی لیکن یہ کہتی ہوئی فوراً بیٹھ گئی: "بیٹھ جا، بیٹھ جا جامعہ کے ماٹر ہیں ماٹر۔" جامعہ کتنی خاموشی سے ذہنوں کی تربیت کر رہی تھی، کتنا اعتماد و یقین دیگر افراد میں قایم کر رہی تھی، اِس کا اندازہ مذکورہ واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔

ایک واقعہ تو دل و دماغ پر نقش ہو کر رہ گیا۔ یہ ۱۹۸۴ء کا واقعہ ہے جب **اندرا گاندھی** کے قتل کے بعد پوری دہلی فساد کی زد میں آ گئی تھی۔ لوٹ مار، آگ زنی، قتل و غارت گری کا بازار گرم تھا۔ جامعہ سے متصل کالونیز، فرینڈس کالونی اور نیو فرینڈس کالونی اس فساد کی زد میں

آ گئیں۔پوری جامعہ میں عجیب دہشت کا ماحول تھا۔جامعہ مقفل اور ہر طرف سناٹا۔ یونی ورسٹی کے درمیان کی مصروف شاہ راہ بھی خاموش۔ہولی فیملی سے ملحق جولینا چوراہا انتہائی حساس بن گیا۔یہی وہ چوراہا ہے جہاں سے جامعہ میں داخل ہوتے ہیں۔ہر وقت یہ دھڑ کا لگا رہتا تھا کہ جامعہ پر اب حملہ ہوا۔ایک دوپہر بڑا شور بلند ہوا جس کی آوازیں جامعہ تک پہنچیں۔پھر تھوڑی دیر بد سناٹا چھا گیا۔بعد میں خبر آئی کہ جولینا چوراہے پر **جولینا بستی** والے شرپسندوں کے سامنے آہنی دیوار بن کر کھڑے ہو گئے ہیں اور کسی شرپسند کو جامعہ کی طرف جانے کی اجازت نہیں دے رہے۔**بستی جُلینا** میں رہنے والوں کی جامعہ سے یہ عقیدت آج بھی قایم ودایم ہے۔

۷۱-۱۹۷۰ء کی جامعہ کا نقشہ اگر پیش کیا جائے تو آپ کو تعجب ہوگا اور ہنسی بھی آئے گی۔آج کی گہما گہمی،سڑکوں پر پبلک اور ٹریفک کا اِزدِحام، جُلینا کے پُر رونق بازار،جامعہ سے ملحق بھری پُری کالونیاں یہ سب کچھ نہ تھا۔ اوکھلا موڑ سے **ہولی فیملی** کے درمیان ایک چھوٹی سی اُجڑی اُجڑی سی بستی تھی جس کو جولینا کہا جاتا تھا۔یہ سرائے جُلینا کے نام سے مشہور ہے۔ میرے سامنے یہ سرائے موجود تھی۔اب عمارتوں کے درمیان کہیں گم ہو چکی ہے۔اس سرائے میں رہنے والی بزرگ خاتون جامعہ کے '**ماٹروں**' کی بڑی عزت وقدر کرتی تھی۔اس کے بعد سب ہو حق تھا۔ متھرا روڈ پر فرینڈس کالونی کے بنگلے اور کوٹھیاں اور نیو فرینڈس کالونی میں متفرق چند کوٹھیاں شہری زندگی کا ثبوت تھیں۔آج جولینا میں جہاں ہوٹل **کراؤن پلازہ** (سوریہ) اور کمیونٹی سینٹر ہے وہاں گڈھوں بھرے تالاب ہوا کرتے تھے جس میں برسات کے پانی میں مینڈھک ٹرّاتے رہتے تھے۔جولینا سے **ہولی فیملی ہسپتال** ہوتے ہوئے جامعہ کو آنے والی ایک پتلی سی سڑک پتھر کی روڑیوں سے بنی ہوئی تھی جس پر گھوڑا گاڑی، ریڑھی اور پیدل چلنے والے تھے۔دو بسیں جن کے نمبر ۱۱۸ اور ۲۴ (اے) تھے چلا کرتی تھیں۔۱۸ انمبر کی بس پرانی دھلی ،دریاگنج، لال قلعہ ،چاندنی چوک اور پرانی دھلی ریلوے اسٹیشن جاتی اور ۲۴ (اے) کناٹ پلیس ہوتی ہوئی قرول باغ جاتی۔کاریں شاذ ونادر ہی نظر آتی تھیں۔

جامعہ نے شہر سے دور اُجاڑ،سنسان اور بے رونق مقام پر بستی بسائی تھی۔جامعہ

نے یہاں آباد ہو کر اپنے آپ کو محض درس و تدریس تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ گردو پیش میں رہنے بسنے والوں کو اپنے اخلاق اور طرزِ زندگی سے متاثر کیا اور اُن کی خاموش تربیت کی۔ یہ اسی تربیت کا نتیجہ ہے کہ جامعہ باوجود جدید تغیرات کے آج بھی اپنے گردو نواح کے دلوں میں بسی ہوئی ہے۔ جامعہ ایک ایسی درس گاہِ ملی ہے جہاں چپراسی سے لے کر پروفیسر کے اعلیٰ عہدے تک سبھی کو ایک مشترک قدروں میں بندھا ہوا پایا۔ ان سب نے ایک بڑی فیملی کی طرح زندگی گزارنے کا عہد کیا جہاں چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی خوشی و غم ایک دوسرے کی اساس بنی۔ میں نے **پروفیسر محمد مجیب صاحب (وائس چانسلر)** کے سامنے نرسری کے بچوں کا احتجاج بھی دیکھا جس کی رہنمائی وہاں کی ٹیچرس کر رہی تھیں اور **پروفیسر مجیب** صاحب کو آفس سے مسکراتے ہوئے نکل کر بچوں کو گود میں لیتے، پیار کرتے اور اُن کی مانگوں کو تسلیم کرتے ہوئے بھی دیکھا۔

جامعہ میں **آغا صاحب** کا کردار دل و دماغ پر ایسا نقش ہوا کہ آج تک دھندلا نہ ہوا۔ وہ میری نظر میں خدمتِ خلق کے 'برانڈ ایمبسڈر' تھے۔ کہنے کو تو وہ چپراسی تھے لیکن اُن کی شخصیت اور خدمت کی لگن کو دیکھ کر لفظ چپراسی لکھتے ہوئے مجھے شدید احساسِ جرم ہوتا ہے۔ خدا مجھے معاف کرے۔ صبح پانچ بجے سے لے کر رات ۱۲ بجے تک میں نے ہمیشہ اُن کو کام میں مصروف پایا۔ انھوں نے اپنا سارا کام نپٹایا۔ مطبخ میں بچوں کو ناشتہ و کھانا دیا، پھر تمام اساتذہ جن کے ناشتے و کھانے مطبخ سے بندھے تھے، اُن کے گھروں میں ناشتہ و کھانا پہنچایا۔ نہ صرف کھانا پہنچایا بلکہ اُن کے باورچی خانوں کے جھوٹے برتنوں کو دھویا، اُن کو سلیقے سے لگایا، گھروں میں سودہ سلف لا کر دیا، گھروں میں انڈے، بریڈ، مکھن پہنچائے اور یہ تمام کام دور، دور پیدل چل کر انجام دیتے۔ اِن تمام کاموں کی انجام دہی میں، میں نے **آغا صاحب** کو ضرورت سے زیادہ تاخیر کرتے ہوئے نہ دیکھا۔

آغا صاحب نے نہ تو کبھی کسی چیز کی خواہش کی اور نہ کبھی کسی شے پر نظر دوڑائی۔ کسی نے خود سے کوئی چیز پیش کر دی تو انھوں نے اسے بہ صد احترام قبول کر لی۔ حتیٰ کہ کبھی ایک پیالی چائے کی بھی فرمایش نہ کی۔ آندھی، بارش، طوفان ان کے عزم کو شکست نہ دے سکے۔ یہاں تک کہ بیماری اور پیر کی شدید چوٹ میں بھی، وہ پٹی لپیٹے، پائجامے کا ایک پائنچہ اوپر کھوسے، دھیرے دھیرے لنگڑاتے، کراہتے، گھروں کے کام نپٹانے پہنچ جاتے۔ کبھی یہ کہتے نہ سنا کہ کل ہم نہیں آئیں گے۔ بس کام

نپٹانے کی دُھن، اپنے گردوپیش سے بے خبر، ڈھیلی ڈھالی چپل یا ڈھیلا سا جوتا پہنے سڑسڑ سر جھکائے پورے کیمپس میں **آغا صاحب** کہیں نہ کہیں جاتے ضرور مل جاتے۔ صبح سے نصف رات تک یہ سلسلہ چلتا رہتا، **آغا صاحب** کب آرام کرتے کچھ پتہ نہیں۔ اب اُن کا بیٹا جامعہ کی خدمت انجام دے رہا ہے۔ **آغا صاحب** جیسی کام کی دُھن اُس میں بھی موجود ہے۔

جامعہ کے خدمت گزاروں میں ایک ہستی **میاں صدیق** صاحب کی تھی۔ یہ **فیکلٹی آف سوشل سائنس** کے دفتر میں ملازم تھے۔ تمام دفتری کاموں کو انجام دینے کے ساتھ ساتھ کامن روم میں وقفے کے وقت اساتذہ کو باقاعدہ چائے پلانے کا کام بھی انجام دیتے تھے۔ تمام اساتذہ کی نگاہ میں اُن کا خاص احترام تھا۔ کسی لڑکے میں یہ ہمت نہ تھی کہ اُن سے بے تکلف ہو یا بے تکی گپ شپ کرے۔ اُن کی اجازت اور مرضی کے بغیر کوئی لڑکا کام میں مصروف کلرکوں کے پاس نہیں جاسکتا تھا۔

وقفے کے دوران شعبے میں بیٹھے اساتذہ کے درمیان مختلف موضوعات پر تبادلہ خیال ہوتا رہتا اور **صدیق** صاحب سلیقے سے چائے پلاتے رہتے۔ **پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی** صاحب، پرنسپل جامعہ کالج (جو بعد میں فیکلٹی آف آرٹس بنی)، **پروفیسر انور صدیقی** صاحب (صدر شعبہ انگریزی) **پروفیسر رحمت** صاحب (صدر شعبہ معاشیات) **مینائی** صاحب (شعبہ سیاسیات) میرے بڑے بھائی **پروفیسر جعفر رضا بلگرامی** (شعبہ سیاسیات) **سوز** صاحب (شعبہ انگریزی) **ڈاکٹر محمد عمر** صاحب (شعبہ تاریخ) **خرّم قیصر زیدی** صاحب (شعبہ اردو) **پروفیسر مجیب رضوی** (شعبہ ہندی) **حکم چند شاستری** (شعبہ ہندی) اور **عابد ملک** صاحب (شعبہ کیمسٹری) اور دیگر فیکلٹیز کے سینیر اساتذہ کی نشستیں اِس کامن روم میں ہوتی رہتی تھیں اور دلچسپ واقعات اور اُن پر حاشیہ آرائیوں کے سبب یہاں کی فضا علمی سرگرمیوں میں ڈوبی رہتی۔ **پروفیسر عابد حسین** صاحب کا بھی وقتاً فوقتاً آنا جانا ہوتا تھا، وہ اپنے کیے ہوئے ترجموں کو سناتے اور اساتذہ سے رائے و مشورہ کرتے۔ ایسے ماحول میں مجھ جیسے ایک جونیر لکچرر کا بے تکلفانہ آنا جانا اور محفل میں شامل ہونا تقریباً ناممکن تھا، ہاں! کبھی کبھی جب ہنسی مذاق اور علمی گفتگو چل رہی ہوتی تو میں بھی کہیں پیچھے جا کر بیٹھ جاتا اور میری یادداشت میں بھی اچھے اچھے جملے، فقرے اور منطقی استدلال پڑ جاتے۔

ایک دن **ضیاء صاحب پروفیسر مجیب رضوی** صاحب اور **سوز** صاحب کے درمیان گفتگو چل رہی تھی۔ موضوع تھا شیعہ، سنّی کی تفریق۔ اِس کی ابتدا کیسے ہوئی، اِس کا تاریخی پس منظر کیا ہے اور دونوں نظریوں کے بنیادی فرق کیا ہیں؟ اِن پہلوؤں پر اظہارِ خیال کیا جا رہا تھا اور **صدیق** صاحب سب کو چائے پیش کر رہے تھے۔ **صدیق** صاحب نے جب **ضیاء** صاحب کے سامنے چائے کی پیالی رکھی تو **ضیاء** صاحب نے مسکراتے ہوئے پوچھا:

ارے بھائی صدیق میاں اتنی دیر سے آپ ہم
لوگوں کی باتیں سن رہے ہیں، کچھ تم کو بھی
معلوم ہے کہ یہ شیعہ سنّی میں کیا فرق ہے؟

صدیق صاحب پلٹ کر جانے لگے اور جاتے جاتے کہنے لگے

ہم کو تو بس اتنا معلوم ہے کہ جو حضرت علیؓ
کو شدّت سے مانے وہ شیعہ اور جو سُستی سے
مانے وہ سنّی۔

لیجیے سارا جھگڑا ختم سب خاموش ہو گئے۔

فیکلٹی آف آرٹس کی نئی بلڈنگ تعمیر ہو رہی تھی۔ **بی اے** (آنرس) اور **ایم اے** کی کلاسیس کھولی جا چکی تھیں۔ وقتی طور پر بلڈنگ کے قریب ایک شامیانہ لگا دیا گیا تھا۔ جس میں کلاسیں ہوتی تھیں۔ سامنے کی ایک بلڈنگ میں جس میں **شعبہ جغرافیہ** تھا اس کے نیچے ہال میں چند اساتذہ کے وقتی قیام کا انتظام کر دیا گیا تھا۔ اِسی ہال میں میرے بڑے بھائی، **رحمت** صاحب، **انور صدیقی** صاحب، **مجیب رضوی** صاحب اور **عابد ملک** صاحب کا قیام تھا۔ سب اُس ہال اور اُس سے ملحق کمروں میں رہتے تھے۔ **آغا** صاحب پابندی سے ناشتہ اور کھانا فراہم کرتے تھے۔ کسی اساتذہ کو کسی طرح کی شکایت نہ تھی۔ صبح سب کو غسل خانے کی ضرورت ہوتی تھی جس کو باری باری پورا کیا جاتا تھا۔ **عابد ملک** صاحب غسل خانے میں گئے ہوئے تھے۔ اُن کے بعد **انور صدیق** صاحب کی باری تھی۔ **عابد ملک** صاحب دُبلے پتلے اور دراز قد، لمبا پتلا چہرہ جس پر خشخشی ڈاڑھی، بہ ظاہر دیکھنے میں مسیحی خدوخال کے تھے۔ وہ لنگوٹ کا استعمال کرتے تھے جس کو نہانے کے بعد غسل خانے میں ٹانگ دیتے تھے۔ **عابد**

صاحب کو غسل خانے سے نکلنے میں تاخیر ہوئی تو **انور صدیقی** صاحب کی بے چینی بڑھی۔ شاید اُن کو کلاس لینے جانا تھا۔ **عابد صاحب** غسل خانے سے جیسے ہی نکلے تو **انور صاحب** لپکتے ہوئے غسل خانے میں داخل ہوئے اور پھر دیکھا کہ اُسی قدر عجلت کے ساتھ واپس آئے اور کمرے کی طرف جاتے ہوئے **عابد صاحب** سے کہا: ''اِے یَسُوع مسیح اپنی صلیب تو اُتار لیجیے۔'' اُن کا یہ فقرہ **عابد ملک صاحب** کی پوری شخصیت پر چھا کر رہ گیا۔

آج کی طرح جامعہ کے پاس کوئی آڈیٹوریم نہیں تھا۔ تمام کلچرل پروگرام اوپن ائیر تھیٹر جو ہائر سکنڈری اسکول سے ملحق تھا وہیں منعقد ہوتے تھے۔ جامعہ کا فاؤنڈیشن ڈے جو جامعہ میلہ کے نام سے زیادہ مقبول تھا، اُس کے تمام پروگراموں کا مرکز یہی اوپن ائیر تھیٹر ہوا کرتا تھا۔ جامعہ کی ایک قدیم روایت تھی کہ دھلی کے مشہور مشاعرے **شنکر شاد** کے دوسرے دن بیش تر شعرا کو جامعہ مدعو کیا جاتا تھا اور تمام معزز شعرا جامعہ کے مشاعرے میں شرکت کرنے پر فخر محسوس کرتے تھے۔ اوپن ائیر تھیٹر میں انتہائی شان و شوکت کے ساتھ اہتمام کیا جاتا تھا۔ ایک ہفتے کا جامعہ کا میلہ یہاں کی معاشرتی زندگی کا مکمل احاطہ کرتا تھا۔ ہر گھر میں انہماک، ہر گھر میں پروگراموں میں شریک ہونے کی تیاریاں اور دن رات کی چہل پہل سوئی سوئی سی زندگی کو جگمگا دیتی تھی۔ محض جامعہ ہی نہیں اطراف کی آبادیوں میں بھی چہل پہل بڑھ جاتی تھی۔ گوجر خواتین، مرد بچے بچیاں سب صاف ستھرے کپڑوں میں انتہائی سلیقے و تہذیب کے ساتھ پروگراموں کو دیکھنے کے لیے آتے اور لطف اندوز ہوتے۔ اِن لوگوں کی بھیڑ بھاڑ جامعہ کے طلبا و طالبات و اساتذہ اور اُن کے خاندانی افراد کے درمیان کبھی کسی بدمزگی کا سبب نہ بنی۔ وہ جوق در جوق جس جوش و خروش کے ساتھ آتے اُسی جوش و خروش کے ساتھ واپس بھی جاتے، چاہے دن ہو یا نصف شب وہ بے دھڑک اور بے خوف جامعہ کے میلے سے لطف اندوز ہوتے۔

ایک واقعہ یہ بھی سنیے، جامعہ کا مشاعرہ اپنی سابق روایتوں کے ساتھ انتہائی شان و شوکت سے منعقد ہوا، اور صبح پتا چلا کہ **بیگم اختر صاحبہ** بھی آئی ہوئی ہیں۔ **پروفیسر مجیب** صاحب اور دیگر معزز حضرات نے اُن کا ایک پروگرام ترتیب دے کر انھیں اوپن ائیر تھیٹر میں مدعو کیا۔ جامعہ کے تمام اساتذہ اپنی اپنی بیگمات کے ساتھ موجود تھے۔ پہلی صف میں تمام بزرگ اساتذہ

بیٹھے تھے اور اُن میں **انورصدیقی** صاحب بھی تھے۔ **بیگم صاحبہ** تشریف لائیں اور **پروفیسر مجیب صاحب** کے ہمراہ ڈائس پر بیٹھ گئیں۔ ابھی تعارفی کلمات کی ادائیگی ہو ہی رہی تھی کہ دیکھا **بیگم اختر** نے پاس ہی بیٹھے **پروفیسر مجیب صاحب** کے کان میں کچھ کہا اور **مجیب صاحب** ہلکے سے مسکرادیے۔ تعارفی کلمات ختم ہوتے ہی **مجیب صاحب** نے مائک پر فرمایا:

بیگم صاحبہ کی فرمائش ہے کہ انور صدیقی

صاحب اپنی ایک تازہ غزل پیش کریں۔

میں نے دیکھا کہ یہ سنتے ہی **انور صاحب** ایک دم گھبرا گئے اور بے چینی میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگے: "آئیے **انور** صاحب ڈائس پر تشریف لائیے۔" **مجیب صاحب** نے اُن کو مخاطب کیا۔ پھر ساتھ میں بیٹھے تمام اساتذہ نے بھی اصرار کرنا شروع کردیا۔ **انورصدیقی صاحب** اٹھے اور آہستہ آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے ڈائس پر پہنچے۔ ان کی لکھی ہوئی یہ غـــزل عرصہ دراز تک میرے پاس موجود رہی۔ اب نہ جانے کہاں گم ہوگئی۔

میں نے دیکھا کہ غزل کے ہر شعر پر **بیگم صاحبہ** جھوم جھوم جاتیں اور خصوصاً جب انھوں نے یہ شعر پڑھا:

بجھا بجھا سرِ محرابِ در بیٹھا ہوں
کوئی چراغ سمجھ کر جلا گیا مجھ کو

شعر سن کر **بیگم صاحبہ** کا چند سیکنڈ تک ہاتھ اٹھا رہا۔ **انور صاحب** کی اِس غـــزل کے چرچے پوری جامعہ میں خوب ہوئے۔ اِس غزل کے تعلق سے میرے شعبے میں ایک دل چسپ واقعہ بھی رونما ہوا۔ ہمارا شعبہ جس کے سربراہ **پروفیسر رحمت صاحب** تھے، وہ اپنے تمام بے تکلف دوستوں کے ہمراہ شعبے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ **پروفیسر محمد صدیق** صاحب جنھوں نے جامعہ ترانہ لکھا تھا وہ **پروفیسر مشیر الحسن صاحب** کے سسر بھی تھے، **انورصدیقی صاحب**، سوز صاحب، **مینائی صاحب، عابد ملک صاحب** شعبے میں آتے جاتے رہتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ شعبے میں **بیگم صاحبہ** کی غزل سرائی پر اظہارِ خیال کیا جارہا تھا اور **انور صاحب** کی غزل پر بات ہورہی ہے کہ اتنے میں **انورصدیقی صاحب** لپکتے جھپکتے شعبے کے کمرے میں داخل ہوئے۔

او بھائی انور آؤ تمہاری ہی غزل پر تبصرہ چل
رہا ہے۔ بھائی بڑی خوب صورت غزل کہی۔

پروفیسر محمد صدیق سر جھکائے خاموش بیٹھے اپنی پان کی ڈبیہ سے پان نکال کر کھانے میں مشغول تھے۔ **انور صاحب** ہنستے ہوئے بیٹھ گئے۔ **محمد صدیق** صاحب نے پان کھا کر فرمایا: "یار انور ایک بار اپنی غزل کا وہ شعر پھر پڑھو:

بجھا بجھا سرِ محرابِ در بیٹھا ہوں

انور صاحب نے پوری غزل سب کو سنائی اور جب اِس شعر کو پڑھا تو **صدیق صاحب** جواب تک آنکھ بند کیے غزل کو سن رہے تھے ایک دم آنکھ کھول کر بولے:

یار انور جب ہم اس شعر کو سنتے ہیں تو ایک عجیب سا تصور ذہن میں اُبھرتا ہے۔ بھئی محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میں ایک ویران کھنڈر میں کھڑا ہوں۔ سامنے کی بوسیدہ دیوار میں ایک طاق ہے جس میں ایک اُلّو سر جھکائے بیٹھا ہے۔ ہاں پھر پڑھو:

بجھا بجھا سرِ محرابِ در بیٹھا ہوں
کوئی چراغ سمجھ کر جلا گیا مجھ کو

انور صاحب نے ایک زوردار ٹھٹّا لگایا اور کمرے سے باہر نکل گئے۔

میرے ذہن میں دو واقعات یادگار بن کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اُنہی دنوں **مسز اندرا گاندھی** کی جامعہ میں آمد ہوئی۔ ایک بڑے سے پنڈال میں اُن کا استقبال کیا گیا۔ وہ انتہائی بے تکلفی سے تمام پروٹوکول کو بالائے طاق رکھتے ہوئے سب سے ہاتھ ملاتی ہنستی بولتی ڈائس پر جا کر براج مان ہوگئیں۔ **پروفیسر مجیب** صاحب سامنے اگلی صف میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ڈائس پر بیٹھی **اندرا گاندھی** کی نظر جیسے ہی اُن پر پڑی، فوراً اٹھیں اور ساڑی کا پلّو سنبھالتی لپکتی ہوئی ڈائس سے اُتریں اور **پروفیسر مجیب صاحب** کا بازو پکڑ کر جھک کر کہا:

آپ یہاں کیوں بیٹھے ہیں، آپ میرے ساتھ اوپر
تشریف لے چلیے۔

مجیب صاحب اِنکساری میں عظمت کا احساس جگاتے ہوئے **مسز گاندھی** کے ساتھ خراماں خراماں ڈائس پر پہنچ گئے۔

دوسرا واقعہ **پروفیسر مجیب صاحب** کی بیماری کا ہے۔ وہ بے ہوشی کے عالم میں **ہولی فیملی ہسپتال** میں داخل ہوئے، ڈاکٹروں نے ان کے لیے برین کا انتہائی نازک آپریشن تجویز کیا۔ **پروفیسر مجیب صاحب** تمام سینیر ڈاکٹرز ونرسوں کی نگرانی میں تھے۔ کسی سے بھی اُن کی خریت معلوم کی جاسکتی تھی۔ اُس وقت ایسا محسوس ہورہا تھا کہ **ہولی فیملی** میں شاید ایک ہی مریض ہے اور ہسپتال صرف اُسی کے لیے ہے، جس کمرے میں وہ تھے اُس کا برآمدہ ڈاکٹرز اور نرسوں کی سرگرمیوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ جامعہ کا تمام اسٹاف وہاں موجود تھا۔ سب لوگوں کے باہمی مشورے سے یہ طے ہوا کہ باری باری دن رات کی ڈیوٹی لگادی جائے۔ چند دنوں کے بعد بڑے اہتمام سے اُن کا آپریشن کیا گیا۔ آپریشن تو کامیاب ہوالیکن یادداشت جاتی رہی۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ یہ عارضی صورتِ حال ہے۔ اگر دماغی مشق کرائی جائے تو یادداشت واپس ہوسکتی ہے۔

مجیب صاحب اپنے گھر آ گئے۔ وہ سب کچھ بھول چکے تھے۔ پڑھنا تو دور کی بات اُن کو اے بی سی ڈی بھی یاد نہیں۔ وہ حروف کو پہچانتے تک نہیں تھے۔ **ہولی فیملی** کی طرف سے ایکسرسائیز کرانے کا اہتمام کیا گیا۔ روز ماہر نرسوں کی نگرانی میں مشق ہوتی تھی۔ ہم سب لوگ خیرت معلوم کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً جاتے رہتے تھے۔ **مجیب صاحب** کا حال دریافت کرنے کے سلسلے میں پتا چلا کہ باقاعدہ اُن کو نرسری بچوں کی طرح پڑھایا جارہا ہے، لکھنے کی مشق کرائی جارہی ہے۔ تھوڑے عرصے بعد پتہ چلا کہ اُن کی یادداشت تیزی سے واپس آرہی ہے۔ اس حادثے کے بعد اور انتقال سے قبل وہ لکھنے پڑھنے میں ویسے ہی مشغول ہوگئے جیسے پہلے تھے۔ **ہولی فیملی** کے لیے اُن کی شخصیت انتہائی قابلِ احترام تھی۔ انھوں نے جامعہ کیمپس میں نرسوں کے قیام کے لیے ایک بلڈنگ مختص کردی اور ایک خوب صورت **حضرت عیسیٰ** کا چوبی مجسمہ ہسپتال کو پیش کیا جو **ہولی فیملی** کے داخلی دروازے میں عرصہ تک نصب دیکھا گیا۔ آج بھی **ہولی فیملی ہسپتال** کو جامعہ سے جوانسیت ہے وہ قایم ودایم ہے۔

جامعہ کی خواتین کی زندگی یہاں کی تہذیبی و معاشرتی زندگی میں ڈوبی ہوئی ہے۔ وہ شانہ بہ شانہ تمام پروگراموں میں نہ صرف شریک ہوتی ہیں بلکہ تیاریوں میں بھی پورا تعاون کرتی ہیں وہ اپنے منفرد پروگرام بھی پیش کرتی ہیں اور بہت سی ایسی فلاحی تنظیمیں بھی چلاتی ہیں جس سے فورتھ کلاس ملازمین کے خواتین و بچوں کی تعلیم و تربیت، ہنر سازی، بیماری آزاری، شادی بیاہ میں نہ صرف مدد کی جاتی ہے بلکہ پورے انہماک کے ساتھ ان میں شریک بھی ہوا جاتا تھا۔ آج نہ جانے کتنے بچے بچیاں اچھی تعلیم و تربیت سے مزین ہو کر اچھی ملازمتوں کے ساتھ پُرسکون زندگی گزار رہے ہیں۔ **جامعہ کا میلہ** جو **جامعہ فاؤنڈیشن ڈے** کے طور پر منعقد کیا جاتا ہے، جامعہ کی خواتین کے لیے خصوصی کشش کا باعث ہوتا ہے۔ وہ گویا ان کے لیے عید ہوتی جس میں وہ پورے جوش و خروش کے ساتھ شریک ہوتی ہیں۔ ہفتوں پہلے ملبوسات کی تیاریاں، پروگراموں میں شرکت کی ترجیحات، پھر اپنے پسندیدہ پروگراموں میں شب و روز کا لحاظ کیے بغیر، شرکتِ جامعہ سے قلبی لگاؤ کا ثبوت دینا۔ وہ جامعہ برادری کی ہر خوشی و غم میں شریک رہتیں۔ یہ **جامعہ میلہ** صرف جامعہ برادری کا نہیں بلکہ جامعہ بستی کے لیے بھی ہوتا جہاں جامعہ برادری کے ہمراہ بستی کے عوام بالخصوص خواتین و بچے شریک ہوتے اور مختلف پروگراموں سے لطف اندوز ہوتے۔ میں نے آج تک **جامعہ ملیہ** کے پُرشور اژدِحام میں کسی ناخوش گوار واقعہ یا کسی بدمزگی کو نہیں دیکھا۔

جامعہ کا اشاعتی ادارہ جس کو **مکتبہ جامعہ** کہا جاتا ہے اپنی نوعیت کا منفرد ادارہ ہے جو نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرونی ممالک میں اپنی ایک خاص شناخت رکھتا ہے۔ کسی یونیورسٹی کے پاس اتنا بڑا اشاعتی ادارہ نہ ہوگا جتنا **مکتبہ جامعہ** ہے۔ اِس ادارے سے نہایت پابندی کے ساتھ ادبی رسالہ: **کتاب نما** اور بچوں کا ماہنامہ پرچہ: **پیامِ تعلیم** ،نکلتا ہے۔ ان رسالوں کی اشاعت میں، میں نے کبھی تاخیر نہ دیکھی۔ **اردو ادب** پر جتنا مواد اِس ادارے نے شائع کیا ہے، شاید ہی کسی دوسرے ادارے نے شائع کیا ہو۔ اس کے علاوہ ادب کے قیمتی ذخیروں کو 'پاکٹ سائز' کی شکل دے کر مزید مقبول کیا۔ **مکتبہ جامعہ** نے نہ صرف تنقید و ادب بلکہ دیگر میدان مثلاً تعلیم، سوانح، اسلامیات، مذہب، سائنس و طب، لسانیات، صحافت میں بھی انتہائی اہم کتابوں کو شائع کیا ہے۔ **کتاب نما** کی اب تک تقریباً چالیس سے زائد خصوصی اشاعتیں منظر عام پر آ چکی ہیں، جو انتہائی اہم ہیں۔ اس کے

علاوہ جامعہ ملیہ اسلامیہ سے تین پرچے رسالہ جامعہ ، اسلام اور عصرِ جدید اور انگریزی میں *Islam and the Modern Age* باقاعدگی سے شائع ہورہے ہیں۔ آج جامعہ میں خاصی تبدیلی ہو چکی ہے۔ اس تبدیلی کا کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا کہ ایک سنسان بستی دیکھتے ہی دیکھتے ایک پُر شور شہر میں بدل جائے گی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے **فیکلٹی آف آرٹس** (سوشل سائنس) **فیکلٹی آف سائنس**، **فیکلٹی آف کامرس**، **سوشل ورک**، **لائبریری** کی شاندار عمارت، پُر شکوہ **مسجد**، **انصاری آڈیٹوریم**، **ایم۔ سی آر سی** کی عظیم الشان عمارت، دو خوب صورت **گیسٹ ہاؤس**، **رجسٹرار آفس** اور اُس کے وسیع لان اور داخلہ کا خوب صورت جدید گیٹ، **انجینئرنگ کالج** کی وسیع عمارت، **پولیٹیکنک**، **کمپیوٹر سائنس** کی شاندار عمارت، **ڈینٹل کالج** اور **انصاری ہیلتھ سینٹر** کی شاندار عمارتیں، اساتذہ کی رہایش گاہیں، **وائس چانسلر لاج**، لڑکوں اور لڑکیوں کے **ہوسٹلس**، **کمیونٹی سینٹر** (شادی گھر) متعدد **ریسرچ سینٹرس**، **اسپورٹس کامپلیکس** چاروں طرف مخصوص عمارتوں کے داخلوں کے لیے بلند و بالا گیٹ ہر طرف ہرے بھرے لان، پھولوں اور خوب صورت پیڑوں کی قطاریں، **آرٹ کرافٹ** کے نمونوں سے سج چکی ہیں۔ جامعہ کو جب سے مرکزی یونی ورسٹی کا درجہ ملا ہے، تعلیم وتدریس و ریسرچ کے معیار نہ صرف بلند ہوئے ہیں بلکہ بین الاقوامی سطح پر شہرت کے حامل بھی ہوئے ہیں۔ اِن میں **ماس کمیونیکیشن**، **فیکلٹی آف ایجوکیشن**، **آرٹس اینڈ کرافٹ** نے خصوصی مقام حاصل کیا ہے۔ جامعہ کا **اسپورٹس کامپلیکس** بین الاقوامی سطح کے پریکٹس کے میدان کی ذیل میں اپنی شناخت قایم کر چکا ہے۔

سب کچھ بہت تیزی سے بدلا اور جامعہ وقت کے تقاضوں کے بہ موجب اپنے زندہ و متحرک ہونے کا ثبوت پیش کرتی رہی۔ آج جامعہ کو وقت کے تقاضوں میں ڈھلتے دیکھ کر طمانیت و فخر کا احساس ہوتا ہے۔ اِس برق رفتاری سے بدلتے حالات میں جامعہ کو ڈھلتے دیکھ کر طمانیت کا احساس اُس وقت اور شدید ہو جاتا ہے جب جولینا کے چوراہے سے گزرتے ہوئے ایور گرین ریسٹورنٹ کے پُرانے بزرگ مالک احتراماً مسکرا کر خریت پوچھ لیتے ہیں یا اوکھلا گاؤں کے بازار کے **چھابڑا**، اور **جگدیش** جنرل اسٹور کے مالک، گاہکوں کی بھیڑ میں کھڑا

دیکھ کر فوراً کہتے: "ماسٹر صاحب آگے آؤ آپ کو کیا چاہیے۔" آج **چھپروالی مسجد** سے گزرتے ہوئے بٹلہ ہاؤس جانے لگتے ہیں تو سامنے شوں شوں کرتی گزرتی میٹرو ٹرین کی پُرشور آواز کے درمیان اپنے گھر کی چوکھٹ پر بیٹھی **محمدی** دھوبن کی مدھم آواز "بھیا اچھے ہو؟" کانوں میں پڑتی ہے اور احساس جگا دیتی ہے کہ جامعہ کا معاشرتی کردار زندہ و توانا ہے:

یہ اہلِ شوق کی بستی یہ سرپھروں کا دیار
یہاں کی صبح نرالی یہاں کی شام نئی

ہوئے تھے آ کے یہاں خیمہ زن وہ دیوانے
اٹھتے تھے سن کے جو آوازِ رہبرانِ وطن

یہیں سے شوق کی بے ربطیوں کو ربط ملا
اسی نے ہوش کو بخشا جنوں کا پیراہن

('جامعہ ترانہ': **محمد صدیق**)

جامعہ ملیہ اسلامیہ
چند باتیں کچھ یادیں

محمد سالم قدوائی

انیسویں صدی کا آخر اور بیسویں صدی کا ابتدائی دور ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ہر اعتبار سے پریشانی اور کسم پرسی کا دور تھا۔ علمی وسماجی حیثیت سے ان کی پہچان تقریباً ختم ہوگئی تھی اور معاشی طور پر بھی ساکھ باقی نہ رہی تھی۔ دولت وثروت جو ان کے قدم چومتی تھی اب ان سے دور بھاگتی تھی، جو دوسروں کو کھلاتے تھے اب خود فاقہ کش ہوگئے تھے، علوم وفنون جن کے دم سے زندہ تھے اب وہ بے مائیگیِ علم سے دوچار تھے، اور یہ سب خود ان کے کردہ یا ناکردہ گناہوں کی سزا تھی۔ ان بدترین حالات میں کچھ ذی ہوش لوگ اصلاحِ حال کے لیے کمر بستہ ہوئے، اصلی وجوہات پر غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ بنیادی طور پر تعلیم کی کمی، بے راہ روی، احساسِ برتری، رسوم ورواج کی شدت، مذہبی امور میں ہٹ دھرمی اور حالات سے سمجھوتہ نہ کرسکنا اس کی اہم وجوہات ہیں۔

ان حالات میں جن لوگوں نے اپنی قوم کی اس زبوں حالی کو بدلنے کی کوشش کی ان میں نمایاں

نام **سرسید احمد خاں** اوران کے ہم نواؤں کا نظر آتا ہے، جنھوں نے مرض کی تشخیص اوراس کے علاج کی ذمہ داری نہ صرف قبول کی بلکہ دوسرے بہت سے لوگوں کو اپنے ساتھ سرگرم کیا، شروع میں **سرسید** کی باتیں لوگوں کی سمجھ میں نہ آئیں، مگر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، حالات میں تبدیلی آتی گئی اوران کی بے غرض محنت رنگ لاتی گئی، بہت سے لوگ اس قافلے میں شریک ہوئے، وقت کے تقاضوں کو سمجھا، اورعلوم جدیدہ کو حاصل کرنا اور مذہبی بے راہ روی سے بچنا ان کی اصلاحی کوششوں کے بنیادی اصول تھے۔ تعلیمی اصلاح اور معاشرے کوبہتر بنانے کی ان کی جدوجہد رنگ لائی جو ایک **مدرسہ، کالج** اور پھر **یونیورسٹی** کی شکل میں آج بھی یادگار ہے اور حال و مستقبل کو منفرد اور عزت وشان کو برقرار رکھنے کی طرف گامزن ہے۔

بقول **سید ہاشم علی** مرحوم (سابق وائس چانسلر، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ):

اگر سرسید نے یہ قدم نہ اٹھایا ہوتا تو آج ہندوستان
کے بیش تر مسلمان محض گھاس کھودنے والے ہوتے۔

بیسویں صدی کی ابتدا میں ہندوستان کے حالات بہت تیزی سے بدل رہے تھے۔ **انگریزوں** کے خلاف بددلی اورنفرت بڑھ رہی تھی، **ہندوستانی قومیت** زندہ ہورہی تھی اور آزادی کے نعرے زور پکڑ رہے تھے۔ **مہاتما گاندھی** کی آواز کو استحکام مل رہا تھا اوران کی تحریک مضبوط ہورہی تھی۔ مسلم علما اور دانش ور **ملکی وقومی تحریک** کو آگے بڑھارہے تھے، صرف مسلم یونیورسٹی علی گڑھ مسلمانوں کے تعلیمی مسائل کو پوری طرح حل کرنے کے لیے کافی نہیں سمجھی جارہی تھی۔ اس وقت اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ایک ایسی تعلیم گاہ بنائی جائے جو مکمل طور پر قومیت کے پس منظر میں ہو اورعلم کے ساتھ عمل کی بھی تحریک ہو اور اعتدال اس کا نصب العین ہو۔ **گاندھی جی** اور **ٹیگور** بھی اس تحریک کے علم بردار تھے، ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ ہی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام سے اس ادارے کی بنیاد پڑی۔ اس کے اصل محرک اور قایم کرنے والے **مولانا محمود حسن، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، عبدالمجید خواجہ** اور **ڈاکٹر ذاکر حسین** تھے۔ ان سب نے ایک رائے سے یہ طے کیا کہ یہ ایک **قومی ادارہ** ہوگا جو طالبِ علموں میں ذہنی بیداری، مذہبی لگن، آپسی محبت واخوت، سماجی یگانگی اور جدید تعلیم کی راہ ہم وار کرے گا اور مسلمانوں کے ساتھ ساتھ دوسری تمام قوموں اور مذاہب کے طلبا کے لیے اس کے دروازے کھلے رہیں گے۔

تھوڑے ہی عرصے بعد **حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، ڈاکٹر ذاکر حسین** اور ان جیسے چند ذمے دار اصحاب کے مشورے سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کو ۱۹۲۵ء میں کرائے کی چند عمارتوں میں قرول باغ (دھلی) منتقل کیا گیا۔ چند اساتذہ اور تھوڑے سے طالب علموں کا یہ قافلہ اپنی ہمت، لگن اور انسان دوستی کے سہارے آگے بڑھنے لگا۔ بار بار ایسے حالات پیدا ہوئے کہ ہمتیں پست ہو گئیں اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ اب یہ ناؤ ڈوب جائے گی، مگر ہر آڑے وقت کوئی نہ کوئی سہارا مل جاتا اور کشتی ڈوبنے سے بچ جاتی، کبھی **مولانا محمود حسن** دعا گو ہوتے، کبھی **گاندھی جی، پنڈت نہرو، حکیم اجمل خاں** ہمت بندھاتے اور پھر **ذاکر حسین خاں، پروفیسر محمد مجیب** اور **ڈاکٹر عابد حسین** اپنے جسم کی توانائی، علم کی ہوش مندی اور وقت کی ضرورت کو سمجھتے ہوئے تن من دھن سے اس کی آبیاری میں لگ گئے۔ خدمت کے جذبے نے ایک ٹیم مہیا کر دی جس میں نہ کوئی بڑا تھا نہ چھوٹا، سب ایک دوسرے کے مددگار اور جامعہ کے وفادار تھے۔ اسی جذبے نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیادوں کو مضبوط کیا اور ابتدائی ڈھانچہ ترتیب دیا۔ تھوڑے ہی عرصے بعد جب کام آگے بڑھا تو جامعہ ملیہ اسلامیہ کو ۱۹۳۵ء میں دھلی کی گھنی آبادی سے دور اوکھلا کے تقریباً غیر آباد علاقے میں منتقل کر دیا گیا جس کے سبب ایک بستی وجود میں آ گئی جس کا نام جامعہ نگر رکھا گیا۔ پہلے **جامعہ** کے **ابتدائی اور ثانوی اسکول** کی عمارتیں بنیں اور پھر یہ سلسلہ آگے بڑھتا رہا اور اب وقت کی ضرورت کے حساب سے اس کی شکل و صورت نکھرتی چلی گئی۔ جامعہ ایک تناور درخت کی طرح اپنی شاخوں پر علوم و فنون کے رنگا رنگ ثمروں سے مزین ہر ایک کی ضرورتوں کو پورا کرنے میں مصروف بلکہ ترقی کی راہوں پر گامزن ہے۔

مجھے فخر ہے کہ نہ صرف میں بلکہ میرے والد **مولانا عبدالسلام قدوائی** (مرحوم) اور میرے سب بھائی بہن اس جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پروردہ ہیں اور ہم آج جو کچھ بھی ہیں اسی جامعہ ملیہ کی تعلیم اور بنیادی تربیت کا نتیجہ ہیں۔ میں نے جو جامعہ دیکھی تھی وہ اب خواب معلوم ہوتی ہے۔ آپ کو بھی بتاؤں تا کہ وہ ماحول اور جذبات آپ بھی میرے ساتھ بانٹ سکیں، اور ان اساتذہ کو خراجِ عقیدت پیش کروں جن کی کردار سازی کی وجہ سے میری ہی نہیں بہتوں کی زندگیاں بن گئیں، میری کوشش ہوگی کہ جامعہ کے کارکنان و اساتذہ جو میری یادوں کے

نہاں خانوں میں محفوظ ہیں ان کے نام مع تعارف کے پیش کرسکوں۔ ہوسکتا ہے مجھ جیسے کچھ اور لوگ اس میں اضافہ وترمیم کرسکیں گے اور یہ جامعی حضرات کی ایک یادگاری فہرست بن جائے جو شاید کبھی کسی کے کام آجائے۔

والد صاحب قرول باغ کی جامعہ میں دار العلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) سے تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے ۱۹۳۱ء میں آئے تھے۔ **رئیس احمد جعفری**[1] اور **مجیب احمد سہالوی**[2] بھی ان کے ساتھ تھے۔ یہ تینوں گہرے دوست تھے، اس زمانے میں (اور شاید آج بھی) جامعہ میں عربی مدارس کے طالبِ علموں کے لیے خصوصی تعلیم کا انتظام تھا، ان تینوں کا داخلہ اسی کلاس میں ہوا تھا۔ غالباً ان تینوں حضرات نے دو سال یہاں تعلیم حاصل کی، پھر مالی دشواریوں کی وجہ سے ملازمت کی تلاش ہوئی، **رئیس صاحب** اور والد صاحب بمبئی چلے گئے جہاں خلافت، اخبار میں ملازمت مل گئی۔ **مجیب صاحب** لکھنؤ واپس چلے گئے۔ ۱۹۳۴ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) میں والد صاحب کا استاد کی حیثیت سے تقرر ہوگیا۔ ۱۹۴۳ء میں ندوۃ العلماء کے حالات کچھ ایسے تھے کہ ان کو وہاں سے علاحدگی اختیار کرنا پڑی۔ اسی زمانے میں امین آباد (لکھنؤ) میں کچھ عالی ہمت عمائد اور حکومت کے اعلا عہدے داروں کی رائے اور مدد سے ایک ادارے کی بنیاد پڑی جس کا نام ادارۂ تعلیماتِ اسلام رکھا گیا، اس کا مقصد عربی زبان اور قرآن وحدیث کی تعلیم دینا تھا اسی کے ساتھ ساتھ اسلام کی تاریخ اور عربی زبان کی ترویج کے لیے کتابیں بھی تیار کرنا تھا۔ والد صاحب کے ساتھ **عبد الغفار ندوی، مشیر الحق مجری آبادی، احتشام علی رحیم آبادی** وغیرہ بھی اسی ادارے سے متعلق تھے۔

۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم کے اثرات تمام علمی و تعلیمی اداروں میں نمایاں ہونے لگے، بہت لوگ پاکستان منتقل ہوگئے، **مولانا عبد الحئی فاروقی صاحب** جو جامعہ میں ناظمِ دینیات تھے اور جامعہ میں مذہبی امور کی نگرانی کے ذمہ دار۔ ان کے پاکستان چلے جانے سے یہ جگہ لمبے عرصے تک خالی رہی، والد صاحب جامعہ کے تعلیم یافتہ تھے، **ذاکر حسین صاحب، پروفیسر محمد مجیب صاحب** اور **سید عابد حسین صاحب** ان کے استاد رہ چکے تھے، اس جگہ کے لیے ان لوگوں کی نظرِ انتخاب والد صاحب پر پڑی۔ **ڈاکٹر عابد حسین صاحب** نے جو اس وقت جامعہ کالج کے پرنسپل تھے والد صاحب کو ۱۹/جولائی ۱۹۵۱ء کو مندرجہ ذیل خط لکھا:

عابد صاحب کے خط کا عکس

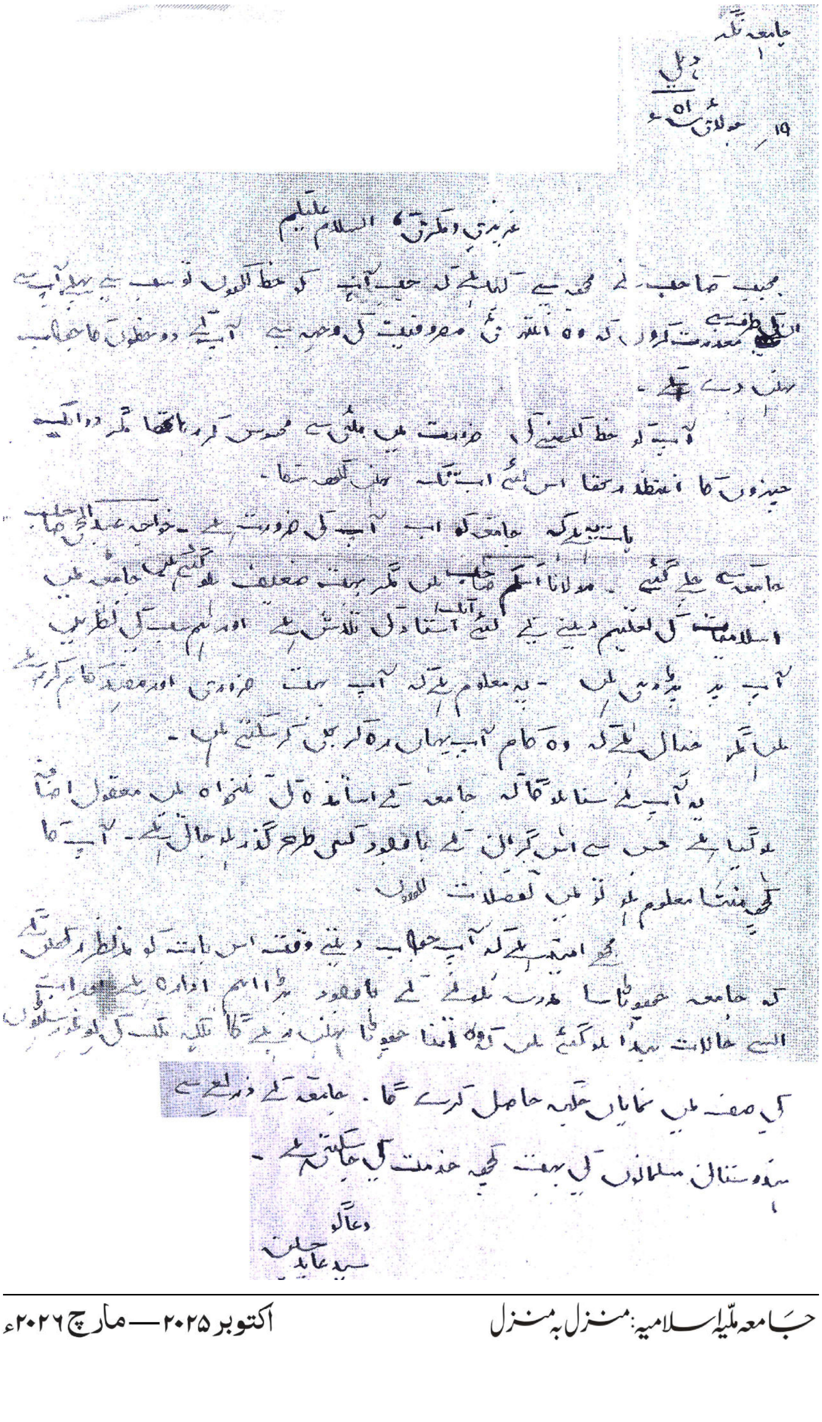

جامعہ نگر
دہلی
۱۹ جولائی ۵۱ء

عزیزی و مکرمی، السلام علیکم

مجیب صاحب نے مجھ سے کہا ہے کہ جب آپ کو خط لکھوں تو سب سے پہلے آپ سے ان کی طرف سے معذرت کروں کہ وہ اتنی مصروفیت کی وجہ سے آپ کے دو خطوں کا جواب نہیں دے سکے۔

آپ کو خط لکھنے کی ضرورت میں بہت دنوں سے محسوس کر رہا تھا مگر دو ایک چیزوں کا انتظار تھا اس لئے اب تک نہیں لکھ سکا۔

بات یہ ہے کہ جامعہ کو اب آپ کی ضرورت ہے۔ خواجہ عبدالحئی صاحب جامعہ سے چلے گئے۔ مولانا اسلم صاحب ہیں مگر بہت ضعیف ہو گئے ہیں۔ جامعہ میں اسلامیات کی تعلیم دینے کے لئے آپ ایسے استاد کی تلاش ہے اور ہم سب کی نظریں آپ پر پڑ رہی ہیں۔ یہ معلوم ہے کہ آپ بہت ضروری اور مفید کام کر رہے ہیں مگر خیال ہے کہ وہ کام آپ یہاں رہ کر بھی کر سکتے ہیں۔

یہ آپ نے سنا ہوگا کہ جامعہ کے اساتذہ کی تنخواہ میں معقول اضافہ ہو گیا ہے جس سے اس گرانی کے باوجود کسی طرح گزر ہو جاتی ہے۔ آپ کو جتنا معلوم ہو تو میں تفصیلات لکھوں۔

مجھے امید ہے کہ آپ جواب دیتے وقت اس بات کو مد نظر رکھیں گے کہ جامعہ چھوٹا سا ادارہ ہونے کے باوجود بڑا اہم ادارہ ہے اور اب تو ایسے حالات پیدا ہو گئے ہیں کہ وہ اپنا چھوٹا پن نہیں رہے گا بلکہ ملک کی تعلیمی سلسلوں کی صف میں نمایاں جگہ حاصل کرے گا۔ جامعہ کے ذریعے سے ہندوستانی مسلمانوں کی بہت کچھ خدمت کی جا سکتی ہے۔

دعا گو
سید عابد حسین

جامعہ نگر، دہلی

۱۹؍جولائی ۵۱ء

عزیزی ومکرمی، اسلام علیکم

مجیب صاحب نے مجھ سے کہا ہے کہ جب آپ کو خط لکھوں تو سب سے پہلے آپ سے ان کی طرف سے معذرت کروں کہ وہ انتہائی مصروفیت کی وجہ سے آپ کے دوخطوں کا جواب نہیں دے سکے۔

آپ کو خط لکھنے کی ضرورت میں مئی سے محسوس کر رہا تھا مگر دو ایک چندوں کا انتظار تھا اس لیے اب تک نہیں لکھ سکا۔

بات یہ ہے کہ جامعہ کو اب آپ کی ضرورت ہے۔**خواجہ عبدالحئی صاحب** جامعہ سے چلے گئے۔**مولانا اسلم صاحب** ہیں مگر بہت ضعیف ہوگئے ہیں جامعہ میں اسلامیات کی تعلیم دینے کے لیے ایک استاد کی تلاش ہے اور ہم سب کی نظریں آپ پر پڑ رہی ہیں۔ یہ معلوم ہے کہ آپ بہت ضروری اور مفید کام کر رہے ہیں مگر خیال ہے کہ وہ کام آپ یہاں رہ کر بھی کر سکتے ہیں۔

یہ آپ نے سنا ہوگا کہ جامعہ کے اساتذہ کی تنخواہ میں معقول اضافہ ہوگیا ہے جس سے اس گرانی کے باوجود کسی طرح گزر ہو جاتی ہے۔ آپ کا کچھ منشا معلوم ہو تو میں تفصیلات لکھوں۔

مجھے امید ہے کہ آپ جواب دیتے وقت اس بات کو مدِ نظر رکھیں گے کہ جامعہ چھوٹا سا مدرسہ ہونے کے باوجود بڑا، اہم ادارہ ہے اور اب ایسے حالات پیدا ہوگئے ہیں کہ وہ اتنا چھوٹا نہیں رہے گا بلکہ ملک کی یونیورسٹیوں کی صف میں نمایاں جگہ حاصل کرے گا۔ جامعہ کے ذریعے سے ہندوستانی مسلمانوں کی بہت کچھ خدمت کی جا سکتی ہے۔

دعا گو

سید عابد حسین

والدصاحب نے اس خط کے جواب میں ادارہ تعلیماتِ اسلام کی ضرورت، اہمیت اور اپنی اس سے دینی وقلبی وابستگی کا اظہار کیا اور یہاں کے کاموں کے رُک جانے کا اندیشہ ظاہر کیا۔ **ڈاکٹر عابد صاحب** نے ان کے ان خدشات کے جواب میں ۲۷ر جولائی ۱۹۵۱ء کو لکھا:

عابد صاحب کے خط کا عکس

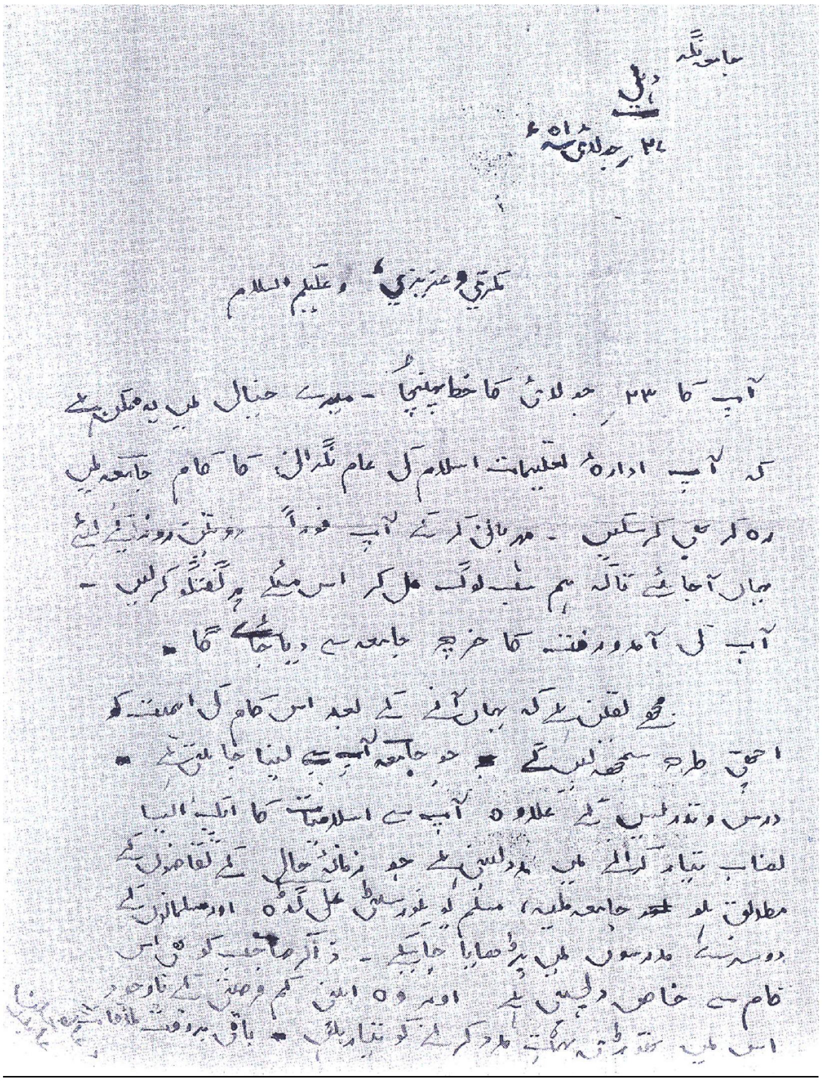

جامعہ نگر
دہلی
۲۷ رجولائی ۱۹۵۱ء

مکرمی و عزیزی، وعلیکم السلام

آپ کا ۲۳ جولائی کا خط پہنچا۔ میرے خیال میں یہ ممکن ہے کہ آپ ادارہ تعلیمات اسلام کی عام نگرانی کا کام جامعہ میں رہ کر بھی کر سکیں۔ مہربانی کرکے آپ فوراً دو تین روز کے لئے یہاں آجائیے تاکہ ہم سب لوگ مل کر اس مسئلے پر گفتگو کر لیں۔ آپ کی آمد و رفت کا خرچ جامعہ سے دیا جائے گا۔

مجھے یقین ہے کہ یہاں آنے کے بعد اس کام کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھ لیں گے۔ جو جامعہ آپ سے لینا چاہتی ہے۔ درس و تدریس کے علاوہ آپ سے اسلامیات کا ایک ایسا نصاب تیار کرانے میں مدد لینی ہے جو زمانۂ حال کے تقاضوں کے مطابق ہو اور جامعہ ملیہ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور مسلمانوں کے دوسرے مدرسوں میں پڑھایا جا سکے۔ ذاکر صاحب کو بھی اس کام سے خاص دلچسپی ہے اور وہ اپنی کم فرصتی کے باوجود اس میں تھوڑا تھوڑا وقت مدد کرنے کو تیار ہیں۔ باقی بروقت ملاقات [illegible]

جامعہ نگر،

دہلی

۲۷/جولائی ۵۱ء

عزیزی ومکرمی، اسلام علیکم

آپ کا ۲۳/ جولائی کا خط پہنچا۔ میرے خیال میں یہ ممکن ہے کہ آپ ادارہِ تعلیمات اسلام کی عام نگرانی کا کام جامعہ میں رہ کر بھی کرسکیں۔ مہربانی کر کے آپ فوراً دو تین روز کے لیے یہاں آجایئے تا کہ ہم سب لوگ مل کر اس مسئلے پر گفتگو کرلیں۔ آپ کی آمد ورفت کا خرچہ جامعہ سے دیا جائے گا۔

مجھے یقین ہے کہ یہاں آنے کے بعد اس کام کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھ لیں گے جو جامعہ آپ سے لینا چاہتی ہے۔ درس وتدریس کے علاوہ آپ سے اسلامیات کا ایک ایسا نصاب تیار کرانے میں مدد لینی ہے جو زمانۂ حال کے تقاضوں کے مطابق ہو جو جامعہ ملیہ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور مسلمانوں کے دوسرے مدرسوں میں پڑھایا جاسکے۔ ذاکر صاحب کو بھی اس کام سے خاصی دلچسپی ہے اور وہ اپنی کم فرصتی کے باوجود اس میں تھوڑی بہت مدد کرنے کو تیار ہیں۔ باقی بروقت ملاقات۔

دعا گو

عابد حسین

اس کے بعد والد صاحب کے پاس معذرت کے لیے کوئی گنجایش باقی نہ رہی۔ بزرگ استادوں کی محبت بھری خواہش حکم کا درجہ رکھتی تھی، وہ اس کے بعد جامعہ آئے اور جامعہ میں رہتے ہوئے ادارہ تعلیماتِ اسلام کے کاموں کو کس طرح جاری رکھیں گے یہ سب باتیں طے ہوگئیں۔

اس طرح اگست ۱۹۵۱ء میں ان کا تقرر **جامعہ ملیہ اسلامیہ** میں استاد اور **ناظمِ دینیات** کی حیثیت سے ہوگیا اور والد صاحب ہم سب کو لے کر **جامعہ** آگئے۔ میرا، اور دوسرے بھائیوں کا داخلہ **جامعہ** میں ہوگیا، میں اور **عاصم**، **ممتاز انٹر کالج (لکھنؤ)** میں نویں اور ساتویں کلاس میں پڑھتے تھے، یہاں بھی قانونی طور پر ٹسٹ کے بعد انھی کلاسوں میں داخلہ مل گیا، اس وقت **جامعہ** میں ہائی اسکول تک دوسرے مضامین کے ساتھ ساتھ سائنس اور ریاضی بھی لازمی تھی، میں ان دونوں سے تقریباً ناواقف تھا، لیکن اسی سال سائنس اور آرٹس کے مضامین اختیاری ہوگئے اور میں آنے والی مشکلات سے بچ گیا۔

جامعہ میں **ناظمِ دینیات** کا عہدہ بڑی اہمیت کا حامل تھا، **ناظمِ دینیات**، **مجلس تعلیمی**، **مجلسِ منتظمہ** اور **کورٹ** کا ممبر ہوتا تھا۔ مذہبی امور کی تعلیم کے ساتھ ساتھ عملی دیکھ بھال بھی ناظم کی ذمہ داریوں میں شامل تھی، **محمد علی ہال** (**جامعہ** کی موجودہ جامع مسجد) کا انتظام وانصرام بھی اسی میں شامل تھا، جہاں پانچوں وقت کی نماز اور جمعہ کی نماز ہوتی تھی اور جلسوں کے لیے بھی اس کا استعمال ہوتا تھا۔ اس وقت عیدین کی نماز **بھوپال گراؤنڈ** میں ہوتی تھی جس میں قرب وجوار کے لوگ بھی شریک ہوتے تھے۔ والد صاحب نے اپنی مدد کے لیے جناب **عبدالغفار مدھولی صاحب** کو **نائب ناظم** بنالیا تھا۔ **مدھولی صاحب** اپنے اصولوں اور وقت کی پابندی کے لیے مشہور تھے، اس میں کسی قسم کی لچک اور کسی کی شخصی اہمیت بھی آڑے نہ آسکتی تھی، اس سلسلے میں مجھے ذاتی طور پر چند واقعات یاد ہیں جو تبرک کے طور پر قارئین کی خدمت میں پیش ہیں۔

محمد علی ہال میں کوئی اہم جلسہ تھا، جس کی صدارت **ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب** کو کرنا تھی، **ذاکر صاحب** اس وقت **علی گڑھ مسلم یونیورسٹی** کے **وائس چانسلر** تھے، ان کو آنے میں کچھ تاخیر ہوئی، **مدھولی صاحب** نے وقتِ مقررہ پر کسی کم عمر طالب علم کو کرسیِ صدارت پر بٹھا کر جلسہ وقت سے شروع کرا دیا اور جب **ذاکر صاحب** آئے تو ان کو اس طالبِ علم کے برابر بٹھا کر صدارت کرائی، چوں کہ **مدھولی صاحب ذاکر صاحب** کے ساتھ **جامعہ** کے ابتدائی دور میں کام کر چکے تھے اس لیے وہ ان کے مزاج سے واقف تھے، اس پر انھوں نے اپنی تقریر میں خوشی کا اظہار بھی کیا۔ اسی طرح ایک مرتبہ جب **ذاکر صاحب نائب صدر جمہوریہ ہند** تھے تو ان کو عید کی نماز **جامعہ** میں پڑھنا

تھی، یہاں بھی انتظام **مدھولی صاحب** کا تھا اور ان کی گھڑی اور وقت کی وہی اہمیت تھی، جب نماز کا مقررہ وقت ہوا تو **ذاکر صاحب** کی سواری پہنچ چکی تھی لیکن **مدھولی صاحب** نے **امام صاحب** کو آگے بڑھا کر جماعت کھڑی کردی، اسی وقت **ذاکر صاحب** بھی شریک ہوگئے۔ تیسرا واقعہ ہمارے گھر کا ہے، والد صاحب نے کچھ لوگوں کو کھانے پر مدعو کیا تھا، ان میں **مدھولی صاحب** بھی تھے، ہم سب باوجود کوشش کے وقت کی پابندی نہیں کرپاتے، یہاں بھی یہی کچھ ہوا، لوگوں کا انتظار ہورہا تھا، **مدھولی صاحب** بار بار اپنی گھڑی دیکھ رہے تھے، جب دسترخوان بچھنے میں تاخیر ہوئی تو انھوں نے کہا مولانا مجھے اجازت دیجیے، والد صاحب ان کے مزاج کو سمجھتے تھے اس لیے بہت معذرت کے ساتھ ان کو تنہا اصرار کر کے کھانا کھلا دیا اور رخصت کیا۔[۳]

جامعہ کی چند گراں قدر خوبیاں تھیں، وقت کی پابندی، اپنا کام خود کرنا، کسی بھی کام کو حقیر نہ سمجھنا، دوسروں کی مدد کرنا اوران کے کام آنا، بڑوں کی عزت کرنا، اپنی ذمہ داریوں کو ایمانداری سے نبھانا وغیرہ۔ یہ خوبیاں انسان کو انسان بنانے میں مددگار ہوتی ہیں، اور انہی باتوں کی وجہ سے **جامعہ** کے لوگ ممتاز تھے۔ طالبِ علموں کے لیے سال میں ایک دن ایسا بھی ہوتا تھا جب یہ سب چیزیں عملی طور پر پیش کی جاتی تھیں، اس دن اسکولوں کے تمام اساتذہ، دفتری کام کرنے والے اور صفائی کرنے والے تمام ملازمین کو چھٹی دے دی جاتی تھی اوران کے تمام کام طالب علم انجام دیتے تھے۔ یہ دن '**ایک دن کا مدرسہ**' کہلاتا تھا۔ طلبا ہی استاد ہوتے تھے، وہی دفتر کے کام کرتے، بورڈنگ کی صفائی، کلاس روم کی صفائی، غسل خانوں وغیرہ کی صفائی دھلائی کرتے تھے، یہ بات اس وقت کی ہے جب حوائجِ ضروریہ کے لیے قدمچوں کا استعمال ہوتا تھا۔ تمام طلبا ان کاموں میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ بعد میں عمدہ کارکردگی کی بنیاد پر انعامات بھی ملتے تھے۔

جامعہ میں **یومِ تاسیس** اور اس سے متصل بچوں کا **تعلیمی میلہ** اس دور میں بڑی اہمیت کا حامل ہوتا تھا، ہفتوں پہلے سے اس کی تیاریاں شروع ہوجاتی تھیں، اسکولوں میں بچوں کو تعلیمی پروجیکٹ دیے جاتے تھے جو انھیں اساتذہ کی رہنمائی میں خود ہی تیار کرنا ہوتے تھے، **اردو** کی کلاس میں ادیبوں، شاعروں اور ادبی تحریکوں پر مضامین تیار ہوتے تھے، ٹائٹل پیج بھی طلبا خود تیار کرتے تھے، تاریخ

اور جغرافیہ میں بڑے بڑے پوسٹرز بنتے تھے جو سلسلہ وار تاریخی و جغرافیائی مناظر پیش کرتے تھے، ڈرائنگ کلاس میں شاندار تصاویر، اسکیچز اور پینٹنگز بنائی جاتی تھیں اور انتہائی سلیقے سے میلے کے زمانے میں ان کی نمایش ہوتی تھی۔ یہ میلہ عام طور سے تین دن کا ہوتا تھا جو **یومِ تاسیس** کے موقع پر ۲۹/اکتوبر سے ۳۱/اکتوبر تک چلتا تھا۔ اس میں بچوں کی بیت بازی، بچوں کا مشاعرہ، بچوں کا مباحثہ اور مضمون نگاری وغیرہ کا اہتمام ہوتا تھا۔ اسی کے ساتھ بڑے لوگوں کے لیے بھی مشاعرے، مباحثے، تقریری مقابلے، ڈرامے، کھیل کود کے مقابلے اور کیمپ فائر وغیرہ کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ کھانے پینے اور چائے وغیرہ کی دکانیں بھی ہوتی تھیں۔ **یومِ تاسیس** پر دھلی اور ملک کے اہم لوگوں کو مدعو کیا جاتا تھا، مختلف فنکشنز کے افتتاح اور صدارت کے لیے بھی اہم اور باوقار شخصیات کو دعوت دی جاتی تھی۔ یہ چند دن جامعہ برادری کے لیے انتہائی خوش گوار، دلچسپ اور اہم ہوتے تھے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ **حبیب تنویر صاحب** کا شہرۂ آفاق **ڈراما**: آگرہ بازار، پہلی بار ایسے ہی کسی موقع پر اسٹیج کیا گیا تھا اور اس میں جامعہ کے متعدد لوگوں نے حصہ لیا تھا۔ مشاعروں کی بھی بڑی اچھی روایت تھی ان میں ہندوستان اور پاکستان کے عظیم شعرا شرکت کرتے تھے ایسے ہی کسی مشاعرے میں پاکستان کی مشہور و معروف شخصیت محترمہ **زہرہ نگاہ** بھی پہلی بار تشریف لائی تھیں، ان کی شاعری اور شخصیت بہت دن تک جامعہ میں موضوعِ گفتگو رہی تھی۔ میں اس وقت جامعہ کالج کی یونین **'انجمن اتحاد'** کے رسالہ: جوہر' کا ایڈیٹر تھا، ان کی اور دوسرے بہت سے شعرا کی سنائی ہوئی غزلیں اور اشعار اس پرچے میں شامل کیے گئے تھے۔ یہ غالباً ۱۹۵۵ء کی بات ہے۔

ہندوستان اور بیرونِ ملک سے آنے والی اہم شخصیات بھی جامعہ آئی تھیں، جن چند بہت ہی اہم لوگوں کو میں نے جامعہ میں دیکھا ان میں **ڈاکٹر راجندر پرشاد** (پہلے صدرِ جمہوریہ) **پنڈت جواہر لال نہرو** (پہلے وزیرِ اعظم) **ڈاکٹر رادھا کرشنن** (نائب صدرِ جمہوریہ ہند) **ہدایت اللہ صاحب** (چیف جسٹس، جمہوریہ ہند) **جمال عبدالناصر**، **شاہ سعود**، **شاہ و ملکہ ثریا**، **ایرانی**، **بلگانن**، **خرورشچیف** وغیرہ اور بھی بہت سے لوگ جامعہ آتے تھے۔ **ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب** اس وقت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے **وائس چانسلر** بعد میں گورنر بہار، پھر نائب صدر اور صدر جمہوریہ ہند بنے، وہ بھی برابر جامعہ آتے رہتے تھے اور یہاں کے لوگوں سے اس پرانے انداز

میں ملتے اور خوش ہوتے۔

جامعہ میں دوطرح کے طلبا تھے ایک وہ جو بورڈنگ میں رہتے تھے اور ان کی دیکھ بھال اور نگرانی اتالیق (وارڈن) حضرات کے ذمہ ہوتی تھی جو اسی ہوسٹل کے ایک حصے میں رہتے تھے۔ مدرسہ ثانوی (سکنڈری اسکول) اور مدرسہ ابتدائی (پرائمری اسکول) دونوں کے نظم و نسق کم و بیش یکساں تھا، جس زمانے میں ہم لوگ آئے تھے اس وقت مدرسہ ثانوی کے تین بورڈنگ تھے، ایک کے اتالیق جناب **اختر حسن صاحب** تھے، جو بہت اچھے آرٹسٹ اور بڑے ہمدرد استاد تھے، اور جن لوگوں نے جامعہ سے پیانِ وفا باندھا تھا ان میں سے ایک تھے۔ جنھوں نے غالباً لکھنؤ آرٹس کالج میں تعلیم حاصل کی تھی۔ دوسرے **برکت علی** صاحب تھے ریاضی کے استاد تھے اور بہت اچھے انسان تھے، تیسرے **مجاہد حسین صاحب زیدی** تھے جو تاریخ کے استاد اور پروفیسر **مجیب صاحب** کے لائق شاگرد تھے۔ طالبِ علم ان سے بہت خوش اور قریب رہتے تھے۔ مدرسہ ثانوی کے پرنسپل **عبدالرزاق** صاحب تھے جو انگریزی کے استاد بھی تھے یہ بھی جامعہ کے حیاتی رکن تھے۔ مدرسہ ابتدائی کی دیکھ ریکھ جہاں تک مجھے یاد ہے **آزاد رسول صاحب** کے ذمے تھی، کھانا دونوں جگہ ڈائننگ ہال ہی میں ہوتا تھا، مدرسہ ابتدائی میں پنج گانہ نماز محمد علی ہال میں ہوتی تھی، مدرسہ ثانوی میں زیادہ تر ڈائننگ ہال اور کبھی کبھی بیچ کے حصے میں ہوتی تھی۔ کھیل کود اور مختلف قسم کی ورزشیں تمام بچوں کے لیے ضروری تھیں، کھیل شروع ہی سے بھوپال گراؤنڈ میں ہوتے تھے۔ ہوسٹل کے نظم و ضبط اور قاعدہ قانون کی پابندی لازم تھی۔ چھٹی کے دنوں میں ہوسٹل کے یا اسکولوں کے درمیان فٹ بال، کرکٹ اور ھاکی کے میچ بھی ہوتے تھے، دوسرے اسکولوں کی ٹیمیں بھی آتی تھیں۔ کرکٹ اور فٹ بال کا طلبا کے زیادہ شوق تھا۔

جامعہ کے پاس پڑوس اور جامعہ برادری کے بچے ڈے اسکالر کے طور پر تعلیم حاصل کرتے تھے اور کھیل کود میں ہوسٹل کے طلبا کے ساتھ حصہ لیتے تھے، ہم لوگ ڈے اسکالر تھے، ہمارا، ایک کلب تھا جس کا نام **پھول کلب** تھا، اس میں کھیل کود کے ساتھ بیت بازی، مضمون نگاری، مباحثہ وغیرہ کے مقابلے ہوتے تھے، خاص طور سے مدرسہ ثانوی اور ابتدائی کے بچوں سے، اس کلب کی صدر **فریدہ خاتون** تھیں جو ہم سب میں سینیر تھیں، یہ **شفیع الدین نیر** صاحب کی بیٹی تھیں۔ کچھ

ممبروں کے نام اب تک یاد ہیں میرا چھوٹا بھائی **عاصم قدوائی**، **نیاز احمد**، **فیروز احمد** (**مشتاق احمد** صاحب کے صاحبزادے) **محمد طاہر**، **محمد طارق** (**نیرّ** صاحب کے صاحبزادے) **تحسین حامد** (**حامد علی** صاحب کے صاحبزادے) **حسیب حسّان**، **شعیب حسّان** (**حسین حسّان** صاحب کے صاحبزادے) **احمد سعید** (**سعید انصاری** صاحب کے صاحبزادے) **نیلوفر** (**ارشاد الحق صاحب کی بیٹی**) **عذرا خانم** (**غلام ربانی تابان صاحب کی بیٹی**) ان کے علاوہ اور بھی بہت سے بچے تھے جن کے نام اس وقت ذہن میں نہیں ہیں۔ اس کلب کو چلانے کے لیے کچھ ماہانہ فیس تھی جو بہت مختصر تھی، اس لیے جامعہ کے مشفق بزرگوں سے بھی کچھ حاصل کیا جاتا تھا ان میں **پروفیسر محمد مجیب صاحب**، **ڈاکٹر عابد حسین صاحب**، **سعید انصاری صاحب**، **پروفیسر عاقل صاحب**، **ڈاکٹر سلامت اللہ صاحب**، **ارشاد الحق صاحب**، اور **حامد علی خاں** صاحب کے نام میرے حافظے میں ہیں۔

بعض بزرگ مشروط رقم دیتے تھے اور بعض بغیر کسی شرط کے ماہانہ دیتے تھے۔ ایک بات اس زمانے کے حساب سے اور بتادوں کہ کوئی بھی دو تین روپے ماہانہ سے زیادہ نہیں دیتا تھا۔ اس رقم سے کھیل کود کا سامان خریدا جاتا تھا اور کبھی کبھی پکنک یا تفریحی پارٹی وغیرہ کا بھی اہتمام کیا جاتا تھا۔ میرے ذہن میں ایک ہلکی سی شبیہ ہے کہ ایسی کسی پارٹی کا انتظام کیا گیا تھا، کھانے پینے کا سامان وافر مقدار میں تھا، اس دن اتفاق سے کلب کے ممبر کم تعداد میں آئے تھے اور سامان بہت بچ گیا تھا، یہ پارٹی کلب کی صدر **فریدہ آپا** کے گھر (یعنی **نیر صاحب** کے گھر) پر تھی جو اسٹاف کوارٹر میں تھا، ہم لوگوں نے کسی بزرگ کو مدعو نہیں کیا تھا، جب سامان بہت بچ گیا تو سوچا کہ پاس پڑوس کے بزرگوں کو بلالیں، مجھے یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ لوگوں کے گھر جاکر بلالاؤں۔ میں نے سب سے پہلے صاحبِ خانہ **نیر صاحب** کے پاس جاکر شرکت کی درخواست کچھ اس طرح کی کہ ہم آپ کو پہلے نہ بلا سکے مگر اب سامان خاصا بچ گیا ہے تو آپ بھی آکر شریک ہوجائیں۔ **نیر صاحب** پرانی تہذیب کے دلدادہ، بے حد برہم ہوئے کہ کس قدر بدتہذیبی کی بات ہے کہ پہلے سے مدعو نہ کیا اور اب جب سامان بچ گیا تو فقیروں کی طرح ہم کو بلانے آگئے، ہم سراسیمہ ہوکر واپس آگئے اور دوسروں تک جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ دوسرے دن انھوں نے ہم کو بلایا، ہم ڈرتے ڈرتے گئے تو بڑی محبت وشفقت سے سمجھایا کہ بزرگوں سے اس طرح نہیں کہا جاتا، یہ توہین آمیز بات ہے کہ تم کسی بزرگ کو بچی ہوئی چیزوں پر دعوت دو۔ اس وقت تو شاید بات سمجھ میں نہ

آئی ہوگی، مگر آج سوچتا ہوں کہ کس قدر بدتہذیبی کی بات سرزد ہوگئی تھی، اب ایسی شفقت اور ہدایت دینے والے کہاں ہیں۔

کچھ اور بھولی بسری باتیں یاد آتی ہیں، غالباً ۱۹۵۴ء میں **جامعہ** کے اسٹاف کوارٹرس نئے نئے بنے تھے (**پروفیسر مجیب صاحب** کے گھر کے سامنے) گھروں میں پانی کے لیے ہینڈ پمپ لگا دیے گئے تھے، مگر روشنی کے لیے بجلی نہ تھی، کچھ دنوں کے بعد بڑی کوششوں سے بجلی کا کنکشن مل گیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس دن بزرگوں کے ساتھ سب بچے بھی بہت خوش تھے اور گھر گھر جا کر مٹھائی کھا رہے تھے، آج ہمیں یہ کوئی اہم بات نہیں معلوم ہوتی لیکن اس وقت کسی گھر میں بجلی ہونا بڑی خوش کن بات تھی، غالباً اس دن عید سے بھی زیادہ خوشی منائی گئی تھی، آج یہ بات بہت معمولی لگتی ہے لیکن جو لوگ اب بھی ان نعمتوں سے محروم ہیں ان سے اس کی قدر و قیمت پوچھیے۔ وہ زمانہ بڑی محبت، لگاؤ اور اپنائیت کا تھا ایک دوسرے سے واقعی تعلق محسوس ہوتا تھا، ہم سب ہر گھر کو اپنا گھر سمجھتے تھے اور بڑی بے تکلفی سے ہر گھر میں آتے جاتے تھے۔ **جامعہ** کا ماحول ایک بڑے خاندان کا سا تھا ہر ایک کو دوسرے کی فکر رہتی اور خوشی و غم میں برابر کے شریک ہوتے تھے۔

پروفیسر محمد مجیب صاحب **شیخ الجامعہ** تھے مگر نہ کوئی حاجب نہ دربان، لوگ آسانی سے ان سے مل سکتے تھے، کالج کے طلبا کو تاریخ کا درس دیتے تھے۔ **ذاکر صاحب** کے **علی گڑھ** جانے کے بعد **جامعہ** کا نظم و نسق اور اس کو چلانے کی ذمہ داری ان کو سونپی گئی تھی، بڑے خوش مزاج، ذمہ دار اور ذہین انسان تھے، اپنی منصبی ذمہ داریوں کو بڑے انہماک سے پورا کرتے تھے، اسٹاف اور طلبا سب کے لیے ان کے دروازے کھلے رہتے تھے، علمی مشاغل کے لیے بھی وقت نکالتے تھے، **انگریزی**، **اردو** اور **جرمن** زبانوں پر یکساں قدرت حاصل تھی، ہر جگہ اپنی عالمانہ شان کی وجہ سے نمایاں رہتے تھے، بڑے صبر و ضبط والے انسان تھے، لیکن ایک بار میں نے ان کو بہت غصے کی حالت میں دیکھا۔ **انجمن اتحاد** جو **جامعہ کالج** کے طلبا کی یونین تھی، کا مسند نشینی کا جلسہ تھا، **شیخ الجامعہ** اس کے پیٹرن تھے اور صدارت کر رہے تھے، طلبا کے علاوہ بہت سے لوگ جو اس انجمن کے حیاتی ممبر تھے اور **جامعہ** میں بہت سینیر تھے وہ بھی موجود تھے۔ اس وقت **ایوب سید صاحب**[۵] **انجمن** کے صدر منتخب ہوئے تھے، اس زمانے میں **جامعہ** سے شہر آنے جانے کے لیے سواریوں

کی بہت دقت ہوتی تھی، صرف ایک بس چلتی تھی اور بھیڑ کی وجہ سے اس میں سفر کرنے میں بہت مشکل ہوتی تھی، اکثر ایسا ہوتا تھا کہ لوگ بس کے انتظار میں کھڑے کھڑے پریشان ہوجاتے تھے، **مجیب صاحب** کے پاس شیخ الجامعہ ہونے کے ناطے کار تھی جس کو وہ عام طور پر جامعہ کے کاموں کے لیے استعمال کرتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ لوگ بس کے انتظار میں کھڑے ہیں اور ان کی گاڑی گزر گئی۔ ظاہر ہے نہ وہ سب کو بٹھا سکتے تھے نہ ان کے لیے یہ مناسب تھا۔ اس زمانے میں آزادیِ گفتار اپنے عروج پر تھی، **ایوب سعید صاحب** نے اپنے خطبے میں شیخ الجامعہ کو اسی بات پر تنقید کا نشانہ بنایا تھا اور ان کے کار کے سفر کو آڑے ہاتھوں لیا تھا، شیخ الجامعہ، **انجمن** کے پیٹرن تھے، یہ سب باتیں اور یہ انداز ان کے مزاج کے خلاف تھا، ناگواری سے ان کا چہرہ سرخ ہوگیا اور انھوں نے اس جلسے کو فوری طور پر ملتوی کر دیا اور اٹھ کر چلے گئے۔ یہ اس وقت کی جامعہ تھی آج تو شاید کوئی طالبِ علم ایسی جرأت بھی نہ کر سکے گا۔

جامعہ کے بہت سے اساتذہ اور متعلقین جن کو میں نے دیکھا اور جن سے شرفِ تلمذ حاصل ہوا، ان کا بھی ذکر ان یادداشتوں میں کرتا چلوں تا کہ جامعہ کے بزرگوں اور قدما کے کم از کم کچھ نام ہی محفوظ ہوجائیں اور کچھ باتیں بھی جو بہت پرانی ہیں، ہوسکتا ہے یہ یادداشت کسی صاحبِ قلم دوست کے لیے کارآمد ہو اور اس میں اضافہ وترمیم ہوسکے۔ یہاں اختصار ملحوظ رکھا گیا، جس کا نام یاد آیا، لکھ دیا۔ کوئی ترتیب بھی نہیں ہے، بس یہ خیال ہے کہ ان ناموں کو اور ان کے کاموں کو یاد رکھا جائے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں

جامعہ کے قیام سے جامعہ کے استحکام تک ان کی جدوجہد رنگ لائی، جامعہ کے ابتدائی دور میں جب اس کا وجود ہی خطرے میں تھا تو **ذاکر صاحب** نے اس کی آبیاری کی اور آخر وقت تک اس کی ترقی اور بہبودی کے لیے کام کرتے رہے۔ علی گڑھ کے وائس چانسلر، بہار کے گورنر، جمہوریہ ہند کے نائب صدر اور صدر ہونے تک ان کا تعلق باقی رہا۔ انتقال کے بعد بھی ان کی آرام گاہ جامعہ ہی ہے۔ یہاں کے لوگوں سے ملنا اور ہمت بندھانا ان کے اوصافِ حمیدہ میں تھا۔ میرے پاس ان کے چند خطوط ہیں اور چند ملاقاتیں یادگار ہیں۔

پروفیسر محمد مجیب

ذاکر صاحب کے **علی گڑھ** جانے کے بعد **شیخ الجامعہ** کی ذمہ داری نہ صرف سنبھالی بلکہ خوش اسلوبی سے انجام دی۔ بہت نیک اور ملنسار تھے، علمی اور انتظامی امور میں ماہر تھے، زندگی بہت سادہ تھی، **جامعہ** کے لوگ ان سے ہر وقت مل سکتے تھے اور اپنی بات آسانی سے کہہ سکتے تھے۔ مورخ کی حیثیت سے انھوں نے بہت سی تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ ابتدائی دور میں پابندی سے **کالج** میں پڑھایا کرتے تھے، **جامعہ** کے طالبِ علموں کو تاریخی مقامات دکھانے لے جایا کرتے تھے، پوری زندگی **جامعہ** کے نام وقف کر دی تھی۔

ڈاکٹر عابد حسین

عابد صاحب نے بھی بیرونی ملکوں میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد **جامعہ** کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ **فلسفہ** اور **اردو ادب** ان کے موضوعات تھے، مدتوں **جامعہ کالج** کے پرنسپل رہے، دوسری زبانوں سے **اردو** میں ترجمہ کرنے میں ماہر تھے۔ **اسلام اینڈ دی ماڈرن ایج** ادارہ کے بانی تھے۔ انھوں نے **اردو** میں **اسلام اور عصرِ جدید** اور **انگریزی** میں **اسلام اینڈ دی ماڈرن ایج** کے نام سے دو رسالے جاری کیے، یہ پرچے اور رسالہ: **جامعہ** اب **جامعہ ملیہ اسلامیہ** کے ایک شعبے **ڈاکٹر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز** سے نکل رہے ہیں۔

ڈاکٹر سعید انصاری

جامعہ کے حیاتی ممبران میں سے تھے، غالباً **کولمبیا یونیورسٹی** سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی۔ جب **جامعہ** میں **استادوں کا مدرسہ (ٹیچرز ٹریننگ کالج)** بنا تو ان کو پرنسپل کی ذمہ داری سونپی گئی۔ بڑے محنتی، ذمہ دار اور مخلص انسان تھے، مذہبی رواداری اور ایمان داری ان کی خوبی تھی، والد صاحب سے بہت تعلق تھا، اکثر ملاقات ہوتی تھی، **جامعہ** اور اس کے تعلیمی معیار کو بہتر بنانا ان کا مشن تھا، شروع ہی سے **جامعہ** سے منسلک تھے۔

ڈاکٹر سلامت اللہ خاں

بہت پڑھے لکھے انسان تھے، **استادوں کے مدرسہ** کو آگے بڑھانے میں بہت کوشش کی۔

ان کے سلسلے میں مجھے زیادہ معلومات نہیں ہیں، سنجیدہ اور پُر وقار انسان تھے۔ علمی محفلوں میں شریک رہتے غالبًا **سعید انصاری صاحب** کے بعد ان کو پرنسپل منتخب کیا گیا تھا۔

عبدلرزاق

مدرسہ ثانوی (سکنڈری اسکول) کے پرنسپل تھے، اپنے اصولوں کے پکے، صاف گو اور مذہبی انسان تھے۔ طلبا پر نظر رکھتے تھے اور تحصیلِ علم پر زور دیتے تھے، نرم مزاج اور باوقار تھے، **انگریزی** پڑھاتے تھے، گرامر پر زیادہ زور نہیں دیتے تھے کہتے تھے جب آگے پڑھیں گے تو خود بخود آجائے گی۔ غالبًا قرول باغ ہی میں جامعہ آگئے تھے۔

اختر حسین فاروقی

لکھنؤ کے رہنے والے تھے، **مدرسہ ثانوی** میں ڈرائنگ کے استاد تھے۔ ہمیشہ سفید کھدر کے کپڑوں میں دیکھا، **بورڈنگ** کے اتالیق بھی تھے۔ ان کے برش میں بڑی جان تھی، جامعہ میں بہت سی جگہوں پر ان کے شاہ کار لگے ہوئے تھے، بڑی دلچسپی سے طالبِ علموں کو ڈرائنگ کے گُر سکھاتے تھے، خوش مزاج اور ہمدرد انسان تھے، شروع ہی میں جامعہ آگئے تھے۔ ان کے صاحبزادے **شکیل اختر** میرے کلاس فیلو اور دوست تھے، جامعہ کے خاموش کارکن تھے۔

شفیع الدین نیّر

بچوں کے عظیم شاعر تھے، طلبا سے بہت محبت کرتے تھے، **مدرسہ ثانوی** میں **اردو** کے استاد تھے۔ ان کا ایک واقعہ اوپر بیان کر چکا ہوں مزید ایک اور یاد آگیا، مجھے کسی غلطی پر کلاس میں ڈانٹ دیا، مجھے بُرا لگا اور میں ان سے کترانے لگا، غالبًا انھوں نے اسے محسوس کرلیا، ایک دن آواز دے کر بلایا، شفقت سے سر پر ہاتھ رکھا اور کہا بیٹے اگر استاد کی بات کا برا مانو گے تو پھر تمھیں کون سمجھائے گا، باپ اپنی اولاد کا برا نہیں چاہتا ہے۔ میرے آنسو نکل آئے، کہا جب تم بڑے ہوگے اور کوئی ڈانٹنے والا نہ ہوگا تو تم کو اس محبت کا اندازہ ہوگا۔ اللہ ان کو جزائے خیر دے، ان کے اس سبق کو میں نے ہمیشہ یاد رکھا اور اب عمر کے تجربے کے ساتھ یہ یاد یقین میں تبدیل ہوگئی ہے۔

مولانا جمال الدین

مدرسہ ثانوی میں **اسلامیات** اور عربی پڑھاتے تھے، شفیق اور سادہ مزاج تھے۔ مذہبی

معلومات بہت اچھی تھیں، تعلیم سے زیادہ بچوں کی تربیت پر زور دیتے تھے، غالبًا اعظم گڑھ کے رہنے والے تھے، پان کھانے کے عادی تھے۔

مجاہد حسن زیدی

جامعہ ہی کے طالب علم اور پکے جامعی تھے، **پروفیسر مجیب صاحب** کے شاگردِ رشید تھے، ذہین اور سمجھ دار تھے، ہندوستان کی تاریخ پر اچھی نظر تھی، **مدرسہ ثانوی** میں تاریخ کے استاد تھے، طلبا میں ہر دل عزیز اور بورڈنگ کے نگراں بھی تھے۔ ہر وقت طلبا ان کے پاس جمع رہتے تھے، اور یہ ہر طرح سے سب کی مدد کرتے تھے، بعد میں غالبًا جرمنی چلے گئے، وہیں شادی بھی کی، پھر ہندوستان آ گئے۔

محمد امین

مدرسہ ثانوی میں **جغرافیہ** کے استاد تھے، پھر **جامعہ کالج** منتقل ہو گئے، **انگریزی** بہت اچھی جانتے تھے، **مدرسہ ثانوی** میں **جغرافیہ** کے ساتھ **انگریزی** بھی پڑھاتے تھے، میں نے بھی ان سے پڑھا ہے، بڑی محنت اور توجہ سے پڑھاتے تھے، **جامعہ کالج** میں گیمس انچارج تھے، مجھے کالج کی کرکٹ ٹیم کا کپتان بنایا تھا۔

پنڈت ایشور

مدرسہ ثانوی میں **ہندی** کے استاد تھے، بڑی توجہ اور محنت سے پڑھاتے تھے، میں ان ہی کا شاگرد ہوں، مجھے اتنی **ہندی** سکھا دی تھی کہ **ہائی اسکول** میں **ہندی** میں امتیازی نمبروں سے کامیاب ہوا تھا، سادہ مزاج تھے، عام طور سے کھادی کا کرتا پائجامہ پہنتے تھے۔

رابرٹ

مدرسہ ثانوی میں **انگریزی** کے استاد تھے، مذہباً **عیسائی** تھے، نوجوان اور اسپورٹس مین تھے۔ طالبِ علموں کو **انگریزی** بولنے کے لیے اصرار کرتے تھے، کھیل کے میدان میں بھی لڑکوں کی دیکھ بھال کرتے تھے، خوش پوش اور ہمدرد انسان تھے، مزاج اور اخلاق بہت اچھا تھا۔

عبدالواسع

جامعہ میں تمام طالبِ علموں کے لیے کوئی نہ کوئی ہنر سیکھنا ضروری تھا، اس زمانے میں

ریڈیو کا بہت رواج تھا، **عبدالواسع صاحب** اس سلسلے میں بنیادی معلومات سے بچوں کو واقف کراتے تھے، ریڈیو بنانا اور مرمت کرنا بھی سکھاتے تھے، ان کے پاس بندوق تھی، کبھی کبھی شکار کھیلنے جاتے تھے اور اپنے جاننے والوں کی شکار کے گوشت سے خوب خاطر کرتے تھے۔

چٹرجی

پورا نام یاد نہیں ہے، **بنگالی** تھے، خاصے معمر تھے۔ سلائی سکھاتے تھے، **مدرسہ ثانوی** میں گنبد کے اندران کا کلاس ہوتا تھا، بہت سے بچے ان سے سلائی سیکھتے تھے، میں نے بھی ان سے سلائی مشین چلانا اور چھوٹے موٹے کپڑے سینا سیکھا تھا، میں آج بھی ان کو یاد کرتا ہوں اور دعائے خیر کرتا ہوں۔

حسین حسّان

غالباً **مکتبہ جامعہ** سے نکلنے والے بچوں کے رسالے: **پیامِ تعلیم** ، کا کام دیکھتے تھے، پرانے **جامعی** تھے، بڑے خوش اخلاق اور ہمدرد انسان تھے۔ ان کے دو بیٹے **حسیب حسّان** اور **شعیب حسّان** ہمارے دوست تھے۔

حامد علی خاں

مکتبہ جامعہ کی دیکھ ریکھ اور اس کے تمام کاروبار کے ذمہ دار تھے، **ذاکر صاحب** وغیرہ کے بہت قریب تھے، **جامعہ** میں ان کے اور **ذاکر صاحب** کے مکان قریب قریب تھے۔ ان کے دو بیٹے **احسن حامد** اور **تحسین حامد** ہم سے بڑے تھے لیکن چھوٹے بیٹے **تحسین حامد** ہمارے ساتھیوں میں تھے۔ کرکٹ کے شوقین تھے، اکثر **جامعہ** کے میچوں میں کھیلتے تھے۔

برکت علی

مدرسہ ثانوی میں **ریاضی** کے استاد تھے، کرکٹ سے بہت دلچسپی تھی، طالبِ علموں کو میدان میں کرکٹ سکھاتے تھے، مجھے بھی انھوں نے ہی کھیلنا سکھایا تھا، ایک دلچسپ بات یاد آگئی جس وقت ہمارا داخلہ **جامعہ** میں ہوا، اس وقت **ریاضی** لازمی مضمون تھا، مجھے اس میں دلچسپی نہیں تھی اور نہ ہی سمجھ میں آتی تھی اس لیے کلاس میں پیچھے بیٹھتا تھا، ان کو یہ بات معلوم تھی، کبھی کبھی کہتے تھے، باہر کا نظارہ بعد میں کریں اس وقت سمجھنے کی کوشش کریں۔ سب طلبا ہنسنے لگتے تھے اور مجھے شرمندگی کا احساس

ہوتا تھا۔

آزادرسول

مدرسہ ابتدائی کے پرنسپل تھے، مذہبی امور کے پابند تھے، اعظم گڑھ کے **مولانا سعید صاحب** کے مرید تھے جو **نقشبندی** سلسلے سے تعلق رکھتے تھے، مزاج قدرے سخت تھا، جامعہ کی سیاست میں حصہ دار رہتے تھے، مدرسہ کے تعلیمی نظام پر اچھی قدرت تھی۔

عبدالغفارمدھولی

بہت خوش مزاج اور اچھے انسان تھے، زندگی جامعہ کے لیے وقف کردی تھی، مدرسہ ابتدائی میں استاد تھے، بچوں کی تربیت اچھے انداز سے کرتے تھے، وقت کی پابندی ان کا خاص وصف تھا، اوپر کچھ واقعات کا ذکر ہو چکا ہے۔ انھوں نے جامعہ کی کہانی ، بڑی محنت سے مرتب کی ہے یہ کتاب جامعہ کی ابتدائی تاریخ کی اولین کوشش ہے۔

حافظ فیاض احمد

جامعہ کے مخلصین اور ابتدائی لوگوں میں سے تھے، پانی پت کے رہنے والے تھے، میں نے ان کو خاصی بڑی عمر میں دیکھا تھا، ان پر جامعہ کی کیا ذمے داریاں تھیں مجھے یاد نہیں ہے۔

حافظ نبی احمد

حافظ فیاض صاحب کے بیٹے تھے جامعہ کی لائبریری کے انچارج تھے، شروع میں لائبریری، مدرسہ ثانوی کی عمارت میں تھی، کتابیں بہت زیادہ اور رکھنے کی جگہ کم، بڑی محنت اور توجہ سے کام ہوتا تھا، ان کے چھوٹے بیٹے **صفی احمد** میرے دوست تھے، مجھ سے ایک سال سینیر تھے۔

عرفان بیگ نوری

حافظ نبی احمد کے ساتھ لائبریری میں کام کرتے تھے، بڑے خوش مزاج اور اچھے انسان تھے۔ عربی زبان وادب پر بڑی قدرت تھی، پروفیسر **سلمان بیگ** (انجینئرنگ کالج علی گڑھ) اور پروفیسر **فیضان بیگ** (شعبہ عربی علی گڑھ) ان کے نیک نام بیٹے ہیں، پروفیسر **سفیان بیگ** انجینئرنگ کالج علی گڑھ میں پروفیسر اور کالج کے پرنسپل **سلمان بیگ** کے بیٹے اور **نوری** کے پوتے ہیں۔

سید حسن

آزاد رسول سے پہلے **مدرسہ ابتدائی** کی ذمہ داری ان کے سپرد تھی۔ **بہار** کے رہنے والے تھے، غالباً **جامعہ** ہی سے تعلیم یافتہ تھے، بعد میں **بہار** چلے گئے اور وہاں **انسان اسکول** قایم کیا جو مختلف مراحل سے گزر کر اب غالباً **کالج** کی شکل اختیار کرگیا ہے، کچھ دن پہلے ان کا انتقال ہوگیا، ان کی 'میراث' ان کے بچے سنبھال رہے ہیں۔

مولانا اسلم جیراجپوری

علی گڑھ چھوڑ کر ابتدا ہی میں جامعہ آ گئے، **عربی ادب** اور **تاریخِ اسلام** پر گہری نظر تھی۔ بڑے پایہ کے مصنف، تاریخِ اسلام پر ان کی کتابیں مستند ہیں، **قرآن مجید** کی تفسیر اور تاریخ پر ان کا علم مستحکم تھا کچھ لوگوں نے ان کو **علم حدیث** سے انحراف کا مورد قرار دیا ہے، لیکن ایسا نہیں ہے وہ **حدیث** کی علمی وتاریخی حیثیت کے قائل تھے، لیکن عملی طور پر **قرآن** کے پیروکار تھے، ان کے بعض شاگردوں نے ان کی شخصیت کو متنازع بنانے کی کوشش کی مگر ان پر کوئی بھی الزام عائد نہ ہوسکا (میرے علم کے مطابق) میں نے ان سے **عربی** اور **اسلامیات** کی تعلیم کئی سال تک حاصل کی ہے۔ میں **جامعہ کالج** کی **طلبا یونین انجمن اتحاد** کے رسالہ: جوھر، کا ایڈیٹر تھا، یہ رسالہ عام طور سے قلمی نکلتا تھا، ان کے انتقال کے بعد ان کے نام سے ایک نمبر نکالا تھا، مجھے یاد ہے کہ اس میں جامعہ کے کئی اہم اہلِ علم حضرات کے مضامین شامل تھے، مثلاً **ڈاکٹر عابد حسین**، **صالحہ عابد حسین**، **مولانا عبدالسلام قدوائی** وغیرہ۔ یہ خاص نمبر اور دوسرے عام شمارے میں نے جامعہ کی **لائبریری** میں جمع کرادیے تھے، ممکن ہے کہ تلاش کنندگان کی رسائی وہاں تک ہوجاتی ہوگی۔ مولانا پر بہت کام ہونے کی ضرورت ہے۔

اندر پال سنگھ

کالج میں **انگریزی** کے استاد تھے، خاص لہجے اور انداز میں پڑھاتے تھے، امتحان میں نمبر بہت سختی سے دیتے تھے، جواب بالکل درست ہونے پر بھی حقِ استادی کا استعمال کرتے تھے۔

حکم چند شاستری

کالج میں **ھندی** پڑھاتے تھے، کلاس میں اپنے پرانے اور اچھے شاگردوں کا ذکر ضرور کرتے تھے، عام طور سے کُرتا دھوتی کھادی کے پہنتے تھے، سادھو سنتوں کے بناوٹی دھندوں سے بہت خفا رہتے تھے،

دھلی کے قریب بلّب گڑھ میں رہتے تھے روزانہ آتے جاتے تھے، اپنے گاؤں کا قصہ سناتے تھے کہ کسی زمانے میں قحط کی سی کیفیت ہوئی، غلّے کی بہت کمی تھی ان کے گاؤں میں کوئی میاں جی (نام میں بھول گیا) تھے انھوں نے اپنے گھر کا تمام غلّہ لوگوں میں تقسیم کر دیا، جامعہ والے ان کی بہت عزت کرتے تھے۔

ضیاءالحسن فاروقی

بہت سمجھ دار، بزمِ دل، خوش اخلاق انسان تھے، علم و عمل سے مالا مال تھے۔ جامعہ آنے سے پہلے مدنیہ، اخبار (بجنور) میں کام کرتے تھے، سنا ہے کہ جب جامعہ آئے تو مجیب صاحب سے ملے اور کہا کہ جب تک جامعہ میں مجھے کوئی جگہ نہیں ملتی ہے بغیر تنخواہ کام کرتا رہوں گا۔ (بی اے) میں میرے پاس اختیاری مضامین میں عربی، انگریزی اور تاریخ تھے، ضیاء صاحب کے تاریخ کے تینوں پرچے یعنی تاریخِ ھند، تاریخِ انگلستان اور تاریخِ مڈل ایسٹ پڑھاتے تھے اور بہت اچھے انداز میں پڑھاتے تھے، مزید تعلیم حاصل کرنے مک گل یونیورسٹی بھی گئے تھے، کالج کے پرنسپل رہے، فیکلٹی کے ڈین بھی رہے، کئی مرتبہ وائس چانسلر کی عدم موجودگی میں ان کی ذمہ داری بھی سنبھالی۔ میرے اندازے کے مطابق جامعہ کے تمام لوگوں میں یکساں مقبول تھے اور جامعی مزاج کے حامل تھے۔ علمی اعتبار سے بھی ان کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ بڑی بڑی علمی مجلسیں اس کی گواہ ہیں، ذاکر صاحب پر ان کی تحقیقی کاوش شھیدِ جستجو، اپنی مثال آپ ہے۔ اس بات کی بہت ضرورت ہے کہ ان کی زندگی اور کاموں پر تفصیلی کام کیا جائے، شعبہ اسلامك اسٹڈیز جو بڑی حد تک ان کے خیالات کی آماج گاہ ہے۔ کسی علمی ریسرچ اسکالر کے ذریعہ یہ کام کرایا جاسکتا ہے۔[۶]

عابد ملک

کالج میں استاد تھے، بہت نرم مزاج اور ہمدرد انسان تھے، طالب علموں میں ہر دل عزیز تھے، جامعہ کالج کے ہوسٹل کے نگراں تھے، غالباً راجستھان کے رہنے والے تھے۔ جامعہ میں کام کرنے کے بعد میوات میں کسی کالج کے پرنسپل ہو گئے تھے۔

نذیرالدین مینائی

کالج میں سیاسیات کے کامیاب استاد تھے، بہت ذہین تھے اور اچھی گفتگو کرتے تھے،

طالب علم ان سے بہت خوش رہتے تھے، **عابد ملک صاحب**، **ضیاء الحسن صاحب** اور **مینائی صاحب** اکثر ساتھ ساتھ رہتے تھے، جامعہ کی ترقی میں ان سب کا حصہ تھا، لکھنؤ کے قریب امیٹھی کے رہنے والے تھے، تعلیم کے لیے اپنے عزیزوں کے پاس جے پور چلے گئے تھے اور وہیں سے جامعہ آئے تھے۔

اعزازالدین خاں

جامعہ کالج کے پرنسپل منتخب ہوئے تھے، خاصے سخت مزاج تھے، ان کا انداز جامعہ والوں سے میل نہیں کھاتا تھا، بھوپال کے رہنے والے تھے، جامعہ کے لوگوں سے ان کا ربط ضبط کم تھا، غالباً ان کے بعد ہی **ضیاء الحسن صاحب** کا انتخاب پرنسپل کے لیے ہوا تھا۔

محمد ادریس

جامعہ کالج میں انگریزی کے استاد تھے، علی گڑھ کے تعلیم یافتہ تھے، بہت شفیق اور اچھے استاد تھے۔ میں ان کا شاگرد رہا ہوں، انگریزی کے ساتھ اردو پر بھی عبور تھا، اردو سے انگریزی میں ٹرانسلیشن کے لیے کلاس میں فی البدیہ شستہ اردو میں کسی بھی عنوان پر دو صفحے لکھوا دیتے تھے۔ جامعہ سے آسٹریلیا چلے گئے تھے۔ وہاں سے واپس ہوئے تو علی گڑھ آ گئے، جہاں ان کے اہل وعیال ان کی واپسی سے پہلے منتقل ہو چکے تھے۔ ہم لوگوں سے ان کے گھریلو تعلقات تھے، ہم انھیں چچا جان کہتے تھے، علی گڑھ ہی میں ان کا انتقال ہوا، ان کے دو بیٹے علی گڑھ میں ہیں، چچی جان چھوٹے بیٹے کے ساتھ لندن میں رہتی ہیں، صحت خراب رہتی ہے۔

پروفیسر محمد عاقل

جامعہ کالج کے پرانے اساتذہ میں تھے، علی گڑھ سے تعلیم یافتہ تھے، **اکنامکس** کے استاد تھے، دورانِ تعلیم یا اس کے آس پاس روس بھی گئے تھے، بہت کم گو تھے، لوگوں سے بہت کم ملتے تھے، زیادہ تر اپنے گھر ہی میں مطالعے میں مصروف رہتے تھے۔

مشتاق احمد

اعظم گڑھ کے رہنے والے تھے، غالباً **جامعی** تھے، بڑے محنتی اور لگ کر کام کرنے والے تھے۔ **شفیق الرحمٰن قدوائی** صاحب نے تعلیمِ بالغان کا سلسلہ شروع کیا تھا، ان کے بعد یہ اس سے متعلق

کاموں میں لگ گئے جامعہ میں اس کا باقاعدہ شعبہ قائم ہوا تو ان کو اس کا ڈائرکٹر بنادیا گیا، تعلیم کے سلسلے میں امریکہ بھی گئے، نائیجیریا اور زامبیا میں بھی کچھ کام کیا، ان کو اسی زمانے میں **نہرو لٹریسی ایوارڈ** بھی ملا، جامعہ میں کچھ دن کام کرنے کے بعد **لٹریسی ہاؤس لکھنؤ** کے ڈائرکٹر ہوکر لکھنؤ چلے گئے، ان کے چھوٹے بیٹے **فیروز احمد** علی گڑھ سے شعبہ کیمسٹری میں پروفیسر ہوکر ریٹائر ہوئے۔ بڑے بیٹے **نیاز احمد** کسی کمپنی میں کام کرتے ہیں۔ **مشتاق صاحب** اور ان کی بیوی اب دونوں اس دارِفانی میں نہیں ہیں۔ ہم لوگوں کا خاص طور سے میرے چھوٹے بھائی **عاصم قدوائی** کا ان سب سے گھریلو تعلق رہا ہے۔

محمد طیب

غالباً مراد آباد کے رہنے والے تھے، شاید قرول باغ میں ندوہ سے تعلیم حاصل کر کے آگئے تھے، بہت نیک اور منظّم انسان تھے، جامعہ کے دفترِ خازن میں محاسب کے عہدے پر فائز تھے، بہت ایمان دار اور اصول و قانون کے پابند تھے۔

کلام صاحب

طلبا کی عملی تعلیم کے لیے جامعہ میں ایک **فاؤنڈری** قایم کی گئی تھی، ان کو اس کا انچارج بنایا گیا تھا، بڑے محنتی اور عملی انسان تھے۔

ارشاد الحق

ابتدا میں جامعہ آگئے تھے، مسجّل (رجسٹرار) تھے امتحانات اور ان سے متعلق امور کی دیکھ بھال، **مجلسِ تعلیمی، مجلسِ منتظمہ** اور **مجلسِ ملی (کورٹ)** کے جلسے کرانا سب ان کی ذمہ داری تھی ان کے دفتر میں **محمد شعیب، سجاد علی**، ایک صاحب کوئی اور تھے جو ان کے مددگار تھے، ردولی ضلع بارہ بنکی کے رہنے والے تھے، بہت ذمہ دار اور بہت نیک، کم گو، خوش اخلاق اور سنجیدہ شخصیت کے مالک تھے، پوری زندگی جامعہ کی خدمت کے لیے وقف کردی تھی، والد صاحب سے گہرے تعلقات تھے اکثر ایک دوسرے سے ملتے رہتے تھے۔ ان کے دو بیٹے **عبید الحق** اور **جنید الحق** ٹریننگ کالج میں پڑھاتے تھے، ان کی بیٹی **نیلوفر** ہمارے چھوٹے بھائی **عاصم** کی کلاس فیلو تھی۔ ان کے بھتیجے **مسعود الحق** بھی ٹریننگ کالج میں پڑھاتے تھے۔

عبداللطیف اعظمی

شیخ الجامعہ **پروفیسر مجیب صاحب** کے پرسنل اسسٹنٹ تھے، بڑے محنتی انسان تھے، اچھے ادیب اور علمی شخصیت کے مالک تھے، رسالہ: جامعہ، کی ذمہ داری بہت دن تک ان کے ہی سپرد رہی، پرانے **جامعی** تھے، جامعہ کی تاریخ اور اس کے مختلف ادوار سے پوری طرح واقف تھے، علمی ادبی اور سماجی تحریکوں میں پیش پیش رہتے تھے۔ جامعہ کی بہتری اور ترقی کے لیے زندگی وقف کردی تھی۔

قیصر زیدی

جامعہ کالج میں اردو کے استاد تھے، میں نے ان سے فیض اٹھایا ہے، انٹرمیڈیٹ میں اردو پڑھی ہے۔ پڑھانے کا انداز بہت اچھا تھا، ادبی لطائف اور اشعار کے حوالے دے کر کلاس میں اپنا مخصوص اثر ڈالتے تھے۔ عام طور سے کھادی کے کرتے پائجامے میں ملبوس رہتے تھے، سردیوں میں کندھوں پر شال ڈال لیتے تھے۔ بہت اچھے شاعر تھے، مشاعروں میں شریک ہوتے تھے اور داد و تحسین وصول کرتے تھے، ادبی اور علمی تحریکوں میں پیش پیش رہتے تھے۔ طالب علموں کے ساتھ سلوک بہت اچھا تھا، میں نے جب انٹرمیڈیٹ کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا تو بہت خوش ہوئے اور انعام دیا، فوٹوگرافی کا شوق تھا، اس زمانے کے اچھے کیمرے ان کے پاس تھے۔ ان کے بیٹے **پروفیسر مصطفیٰ زیدی** علی گڑھ میں **لائبریری سائنس** کے معروف استاد ہیں۔

شبیر ندوی

قرول باغ ہی میں ندوہ سے تعلیم حاصل کرکے جامعہ آگئے تھے، بڑے منتظم تھے، جامعہ کے **مطبخ** کا انتظام ان کے ذمے تھا جسے انھوں نے بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا، جامعہ کے دوسرے کاموں میں بھی پیش پیش رہتے تھے، ملنے جلنے والوں کا حلقہ وسیع تھا، جامعہ کی تاریخ اور بعد کی سیاست سے دلچسپی تھی، ندوہ میں والد صاحب کے شاگرد تھے۔

سجاد علی

ہم لوگوں کے ہم وطن تھے، یہ بھی ندوہ سے جامعہ آگئے تھے، **مدرسہ ابتدائی** میں دفتر کے کام ان کے ذمے تھے، بعد میں رجسٹرار آفس منتقل ہوگئے تھے، اردو ٹائپ میں ماہر تھے، محنتی

اور ذمہ دار تھے، عام طور سے کھادی کا کرتا پائجامہ استعمال کرتے تھے۔

عبدالحفیظ قدوائی

والد صاحب کے رشتے کے چچازاد بھائی تھے، جب والد صاحب ندوہ میں تھے تو یہ بھی وہاں تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ندوہ کی اسٹرائک میں ان کو بھی شامل قرار دیا گیا تھا، جس کے بعد وہ جامعہ آ گئے کچھ دن تعلیم حاصل کرنے کے بعد مدرسہ ثانوی (سکنڈری اسکول) کے دفتر میں ملازمت مل گئی، ہم لوگ جب جامعہ آئے تو کافی دن ان کے ساتھ ہی رہے تھے، کسی وجہ سے جامعہ کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر جامعہ چھوڑ دی اور رائے بریلی کے کسی کالج میں ملازمت کر لی۔

عبدالحق خاں

ٹریننگ کالج میں استاد تھے، **عبدالرزاق** صاحب کے بعد مدرسہ ثانوی کے پرنسپل منتخب ہوئے، بڑے محنتی اور دبنگ انسان تھے، لڑکوں پر گہری نظر رکھتے تھے، اساتذہ سے ان کی ذمہ داریاں پوری کراتے تھے۔

محمد شعیب

غالباً جامعہ ہی کے تعلیم یافتہ تھے، رُدولی کے رہنے والے تھے، **ارشادالحق صاحب** کے بعد جامعہ کے رجسٹرار منتخب ہوئے، بہت خاموش اور اچھے منتظم تھے، اپنی ذمہ داریوں کو بخوبی سنبھالتے تھے۔

سنہا صاحب

پورا نام یاد نہیں ہے، جامعہ کالج میں تاریخ کے استاد تھے، میں نے ان سے انٹرمیڈیٹ میں پڑھا تھا نیک اور سیدھے انسان تھے، غالباً کہیں سے ریٹائر ہو کر جامعہ آئے تھے، محنت اور توجہ سے پڑھاتے تھے۔

عبدالحلیم ندوی

ندوہ میں والد صاحب کے شاگرد تھے، بہت پہلے جامعہ آ گئے تھے، عربی زبان پر بڑی قدرت تھی، آل انڈیا ریڈیو میں عربی سیکشن میں بہت دن کام کیا، عربی بالکل عربوں

کے لہجے اور انداز میں بولتے تھے، زبان وادب پر ان کی متعدد کتابیں بھی ہیں، جب جامعہ کو یونیورسٹی کا درجہ ملا اور مختلف شعبے قایم ہوئے تو ان کا تقرر شعبہ عربی میں استاد کی حیثیت سے ہو گیا۔

قاضی زین العابدین

ان کا تقرر **مولانا اسلم صاحب** کی جگہ ہوا تھا اس وقت **اعزاز الدین صاحب** پرنسپل تھے، میرٹھ کے رہنے والے اور وہاں کے قاضی شہر تھے، اچھی علمی وسماجی حیثیت کے انسان تھے، ان کی تصانیف بہت ہیں غالباً الحرم، کے نام سے ایک رسالہ بھی نکالتے تھے، جامعہ کے ماحول سے پوری طرح مطمئن نہ تھے۔ والد صاحب سے اچھے تعلقات تھے، ان کے بیٹے **قاضی زین الساجدین** علی گڑھ کے شعبہ دینیات سے پروفیسر ہو کر ریٹائر ہوئے۔

محمد حسین صاحب 'ابّو'

ابتدائی اسکول میں تعلیم دیتے تھے، بچوں سے بہت محبت کرتے تھے، سب بچے ان کو 'ابّو'، ہی کہا کرتے تھے، جامعہ کے اہم بزرگوں اور مقبول ترین لوگوں میں تھے، تعلیم سے زیادہ بچوں کی تربیت پر توجہ دیتے تھے، ابتدائی اسکول کے کسی ہوسٹل کے نگراں بھی تھے۔

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ ہیں جن کے نام ابھی یاد نہیں آرہے ہیں۔ جامعہ میں بہت کم خواتین ملازمت کرتی تھیں، صرف چند خواتین کے نام اس وقت ذہن میں ہیں:

جامعہ کی معروف خواتین

صالحہ عابد حسین

ڈاکٹر عابد حسین صاحب کی بیگم جامعہ کی معزز ومحبوب خواتین میں سے تھیں، یہ جامعہ میں ملازم نہیں تھیں لیکن جامعہ کی سماجی اور علمی زندگی میں ان کا بہت اثر تھا، جامعہ میں انھوں نے خواتین کے لیے ایک مجلس سہیلی سبھا کے نام سے قایم کی تھی، جس کے جلسے زیادہ تر انہی کے گھر پر اور ان ہی کی ضیافت میں ہوتے تھے، جامعہ کی بہت سی خواتین اس میں شریک ہوتی تھیں۔ صالحہ صاحبہ افسانہ نگار اور ناول نگار بھی تھیں، مولانا حالی کی نواسی تھیں، بڑی نیک سلیقہ مند

اور خوش اخلاق خاتون تھیں، **عابد صاحب** کے ساتھ نے ان کی خوبیوں کو مزید اجاگر کر دیا تھا۔ معروف ادیبہ جامعہ ملیہ کے شعبۂ اردو میں استاد **پروفسر صغریٰ مہدی** ان کی ہی بھانجی تھیں اور مجھ سے کچھ جونیر۔

مشیر فاطمہ صاحبہ

جامعہ نرسری ان کے ذمے تھی، بہت اچھی نیک خاتون تھیں، نرسری کو بچوں کی دلچسپی کا مرکز بنانا ان کا بڑا کارنامہ تھا، جامعہ کے سب لوگ ان کی بہت عزت کرتے تھے۔

جمال فاطمہ

'ممی باجی' کے نام سے مشہور تھیں، **اختر فاروقی صاحب** کی بیٹی تھیں، **جامعہ نرسری** کی دیکھ بھال ان کے ذمے تھی، بچوں سے بہت محبت کرتی تھیں، سوئٹر بننے میں ماہر تھیں، جامعہ ہی میں **سجاد علی صاحب** سے ان کی شادی ہوئی تھی۔

○

آخر میں، میں اپنے کچھ ہم سبق اور ساتھیوں کے نام بھی لکھ رہا ہوں:

سینیر ساتھی

صدیق الرحمٰن قدوائی، غلام حیدر، شاہ عبدالقیوم، عبدالعظیم صدیقی، ریاض احمد، تجمل حسین خاں، صفی احمد، جتیندر کمار، ابراہیم سعد، محمد صالح نیر، فریدہ خاتون وغیرہ۔

کلاس فیلوز

شکیل اختر فاورقی، محمد صدیقی ایولوی، خالد سیف اللہ، اقبال احمد، عبدالقادر خمسانی، عبدالجبار خمسانی، رشید احمد، انیس احمد، نور محمد، احمد حسن، چمن لال بھاردواج، ہرسروپ۔

اس مضمون میں، میں نے جو بھی لکھا ہے وہ میرے ذاتی خیالات ہیں اور محض یاد داشت کے بھروسے لکھے ہیں جو ۱۹۵۱ء سے تقریباً دس برس پر محیط ہیں۔ ساٹھ برسوں سے زیادہ کی پرانی باتوں کو پوری طرح یاد رکھنا خاصا مشکل ہوتا ہے، ممکن ہے کہیں بھول چوک ہو گئی ہو، جس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں۔ مذکورہ افراد کے نام کسی ترتیب سے نہیں ہیں حافظے میں جو آیا لکھتا چلا گیا۔

حواشی

۱۔ قیامِ پاکستان کے بعد وہاں چلے گئے، عظیم مصنف اور اچھے **ناول نگار** تھے۔

۲۔ لکھنؤ میں قومی آواز ، میں بہت دن کام کیا۔ کالم 'گلوریاں' انہی کی نگارشات ہوتی تھیں۔

۳۔ ان تینوں موقعوں پر میں موجود تھا۔

۴۔ یہ رسالہ قلمی نکلتا تھا۔ مولانا **اسلم صاحب** کے انتقال کے بعد **اسلم نمبر** بھی قلمی نکلا تھا۔ یہ رسالے میں نے بعد میں جامعہ کی **لائبریری** میں دے دیے تھے، ممکن ہے اب بھی کہیں محفوظ ہوں۔

۵۔ بی۔اے (فائنل) کے طالب علم تھے، بڑے بے باک، بعد میں علی گڑھ سے ایم اے، پی ایچ ڈی کیا۔ آفتاب ہوسٹل میں رہتے تھے۔ میں بعد میں اسی ہوسٹل میں رہا مگر ان سے بہت جونیر۔ کئی **انگریزی** اخباروں کے ایڈیٹر بھی رہے۔ پروگریسو خیالات کے تھے۔

۶۔ میرے پاس ان کے کچھ خطوط ہیں، اگر کوئی صاحب انھیں جمع کریں یا استعمال کرنا چاہیں تو مجھ سے لے سکتے ہیں۔

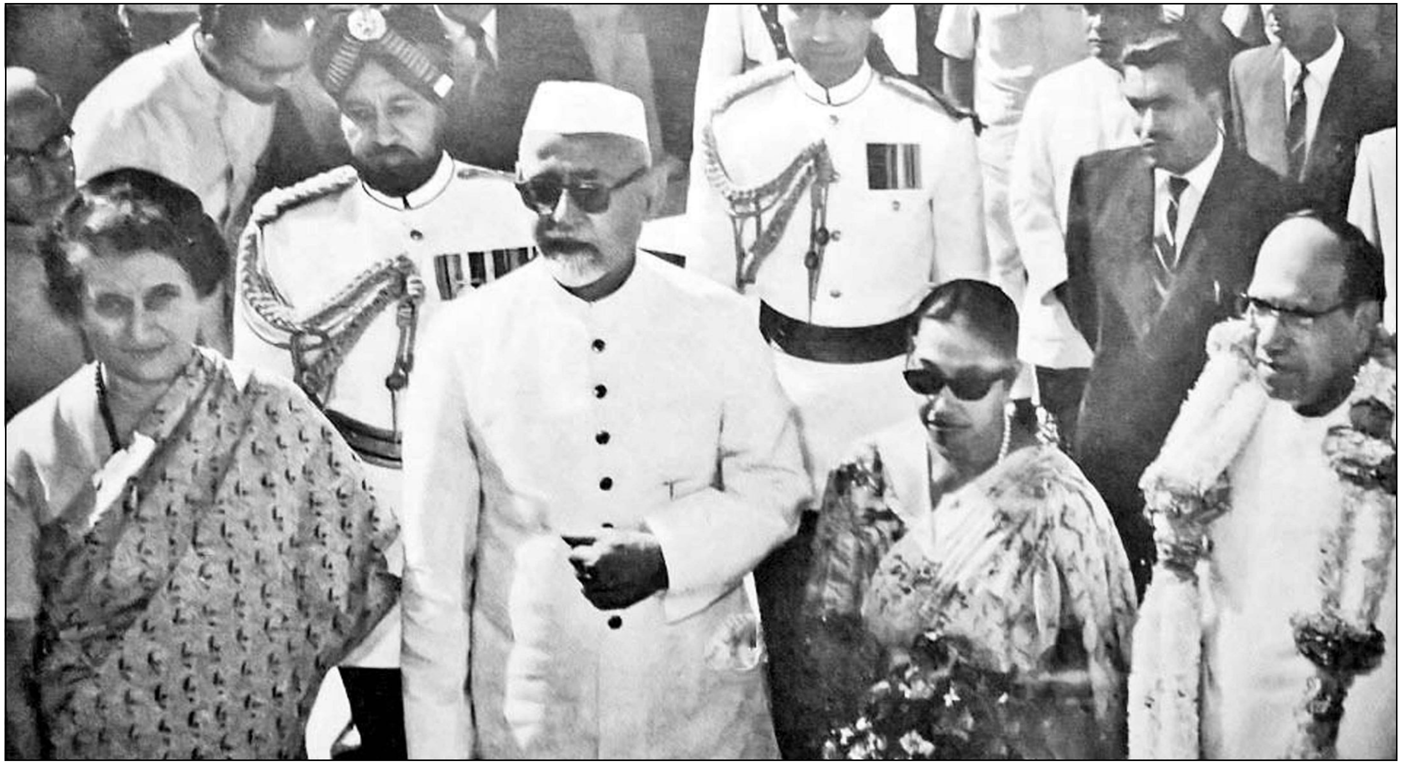

ڈاکٹر ذاکر حسین وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی کے ہمراہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ

خوش گوار یادیں

پروفیسر مجیب اشرف*

جامعہ کی یادوں کو ایک بحرِ بیکراں سے مماثلت کرنا بے جا نہ ہوگا۔ شعوری زندگی کے سینتالیس برس جامعہ ہی میں گزرے، جس کا ہر لمحہ کسی نہ کسی یاد سے جڑا ہوا ہے۔ جب ماضی کی طرف جھانکتے ہیں تو تمام واقعات کل کی سی بات لگتے ہیں اور تمام واقعات ایک فلم کی مانند نظروں کے سامنے کوند جاتے ہیں۔ اِن لامحدود زریں یادوں کو ایک مضمون میں سمونا دریا کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہے۔

بدایوں قصبہ گنور کے مختلف اسکولوں میں، راقم کی ابتدائی تعلیم ہوئی۔ بعدازاں ایس ایم ایچ اسلامیہ انٹر کالج (اٹاوہ) میں آٹھویں جماعت میں داخلہ کرایا گیا۔ ایگری کلچر اور سائنس کی تعلیم نویں جماعت میں ہوئی۔ یہ کالج خان بہادر مولوی بشیرالدین صاحب نے قایم کیا تھا۔ اس درس گاہ کی شہرت پورے ہندوستان میں تھی۔ اس کا اقامتی کردار تھا اور تعلیمی نصاب دیگر اسکولوں سے ہٹ کر تھا۔ دست کاری اور دیگر مشاغل کے ذریعہ طالبِ علموں کی بہترین

* سابق ڈین فیکلٹی آف ہیومینٹیز اینڈ لینگویجز، جامعہ ملیہ اسلامیہ

تربیت کی جاتی تھی۔غریب طالب علموں کے لیے **خان بہادر صاحب** نے ایک کنسیشنل اسکیم (Concessional Scheme) کا انتظام کیا ہوا تھا، جس کے تحت طلبہ دست کاری سیکھ کر اپنے خرچے خود اٹھاتے تھے۔ یہاں کے اساتذہ محنتی اور لائق وفائق تھے۔اسکول میں طلبہ کے لیے مختلف کھیلوں، جیسے ہاکی، فٹ بال، بیڈمنٹن اور جسمانی ورزشوں کا انتظام کیا گیا تھا۔اس اسکول میں بچوں کو سیر وتفریح کی غرض سے باہر بھی لے جایا جاتا تھا۔شہر میں اکثر اوقات مشاعرے اور ادبی نشستیں منعقد ہوا کرتی تھیں جس میں اساتذہ شرکت کرتے تھے اور طلبہ کو بھی غیر نصابی سرگرمیوں کے تحت اس میں شریک ہونے کی ترغیب دی جاتی تھی۔

جامعہ رورل انسٹی ٹیوٹ سے راقم نے ۱۹۶۱ء میں گریجویشن کرنے کے بعد **بال سہیوگ** میں سوشل ورکر کی حیثیت سے دسمبر ۱۹۶۲ء تک ملازمت کی۔پھر دسمبر ۱۹۶۲ء میں جامعہ رورل سروسز میں اے وی آپریٹر کی آسامی پر خدمت کرنے کا موقع ملا۔

جامعہ کے **وائس چانسلر** پروفیسر **محمد مجیب** نے ۱۹۲۳ء میں **انڈین ہسٹری اینڈ کلچر** میں پہلا پوسٹ گریجویٹ شعبہ قایم کیا۔حالانکہ اس وقت تک تاریخ کے مضمون سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی،مگر میرے دل میں اعلا تعلیم حاصل کرنے کی خواہش جاگ اٹھی تھی۔چنانچہ ڈائرکٹر **ہاشم علی صاحب** کی اجازت سے (ایم اے) **ہسٹری** میں داخلہ لے لیا۔صبح کو کلاسز کرتا تھا اور شام کو رورل سروسز کے طلبہ کو فیلڈ ورک کرانے کی ڈیوٹی انجام دیتا تھا۔شعبے کی **لائبریری** میں شام سے رات تک تاریخ کی اہم کتابوں کا مطالعہ کرتا تھا۔اسی دوران تاریخ کے عظیم مورخین سے درس لینے کا شرف بھی حاصل ہوا۔پروفیسر **محمد مجیب صاحب** سوشل اور کلچرل ہسٹری اور دوسرا آرٹ اینڈ آرکٹیکچر ' کا پیپر پڑھاتے تھے۔**مجیب صاحب** کی شاگردی نے تاریخ کے مطالعے سے میرے شوق میں خاصا اضافہ کیا۔**مجیب صاحب** اپنے طالب علموں کو سوالات پوچھنے کا پورا پورا موقع دیتے تھے،وہ کہتے تھے:

> تاریخ پڑھنے والوں کو حقیقت جاننے کی
> جستجو اور تجسس ہونا چاهیے اور یه که
> حقائق اور دلائل کی روشنی هی میں کسی
> نتیجے پر پهنچنا چاهیے۔

عہدِ وسطیٰ کی سیاسی تاریخ، **مجاہد زیدی** صاحب پڑھاتے تھے۔ پہلی بار معلومات افزا کتابوں کے مطالعہ سے 'دورِ سلطنت میں مسلمانوں کی فتح کے اسباب' پر ایک مقالہ لکھا جو **زیدی صاحب** کو بہت پسند آیا۔ میرے ایک دوسرے استاذ **اقتدار صدیقی** صاحب نے کچھ مخصوص کتابوں کے حوالے دے کر ایک مقالہ **شاہ ولی اللہ** پر لکھوایا اور اسے جانچ کر رسالہ 'جامعہ' میں شائع کرا دیا۔ یورپ کی تاریخ، پروفیسر **ضیاء الحسن فاروقی صاحب** پڑھاتے تھے۔ 'سلطانوں کے دور کا نظامِ سلطنت' کا پرچہ مشہور مورخ **سرن صاحب** نے پڑھایا۔ ہسٹوریوگرافی 'کا پرچہ پروفیسر **ترمذی صاحب** پڑھاتے تھے۔ انگلینڈ کی تاریخ، پروفیسر **محبّ الحسن صاحب** سے پڑھتے تھے جو شعبے کے صدر بھی تھے اور لائبریری کے چیرمین بھی۔ یہ میری خوش نصیبی تھی کہ مجھے معروف مورخین سے تاریخ کے اسباق پڑھنے کا شرف حاصل ہوا، اور اس طرح تاریخ کے مطالعے سے میرا شوق روز افزوں بڑھتا گیا۔ (ایم اے) فرسٹ ایئر میں میری فرسٹ پوزیشن آئی۔

پروفیسر **محبّ الحسن صاحب** نے تاریخ میں میرا انہماک دیکھ کر (ایم اے) کے بعد مجھے اسپیشل کلاس اور (بی اے) کی ہسٹری پڑھانے کے لیے مامور کر دیا۔ اسی کے ساتھ (ایم اے) کے ٹیوٹوریل پڑھانے کی ذمہ داری بھی دی گئی۔ میرے استاذ پروفیسر **محبّ الحسن صاحب** جب کبھی مجھے لائبریری کے ریڈنگ روم میں مطالعہ کرتے ہوئے دیکھتے تو مجھ سے کہتے کہ تم فکر مت کرو میں تمہارے لیے کچھ انتظام کر رہا ہوں۔ اس سے پیش تر میں لکچرر شپ کے ایک انٹرویو میں شریک ہو چکا تھا۔ جس میں **ڈاکٹر ایس این سنہا صاحب** کا تقرر ہوا تھا۔ (ایم اے) کرنے کے بعد **پروفیسر مجیب صاحب** نے مجھے ایک ٹاپک دے کر تحقیق کی طرف راغب کر دیا۔ جامعہ میں ابھی (پی ایچ ڈی) کا انتظام نہیں ہوا تھا۔ اس لیے میں نے کچھ اساتذہ کے مشورے پر دہلی یونیورسٹی میں (پی ایچ ڈی) کورس میں داخلہ لے لیا۔ پروفیسر **امبا پرشاد** کو میرا سپروائزر مقرر کیا گیا۔ تقریباً آٹھ برس کی محنتِ شاقّہ کے بعد میں نے تھیسز کا پہلا ڈرافٹ تیار کر لیا۔ لیکن جمع کرنے سے جھجھک رہا تھا، میں نے اپنی سینیر ساتھی **حمیدہ آپا** سے تھیسز پر ایک نظر ڈالنے کی درخواست کی۔ انھوں نے میرا تھیسز ٹائپ کرا کر فوراً دلّی یونیورسٹی میں جمع کروا دیا۔ ۱۹۸۱ء میں دلّی یونیورسٹی کے کانووکیشن میں ہندوستان کے **وائس پریزیڈنٹ** اور جامعہ کے **چانسلر ہدایت اللہ صاحب** کے بابرکت ہاتھوں سے

مجھے (پی ایچ ڈی) کی ڈگری تفویض کی گئی۔ جیسے ہی مجھے یہ ڈگری ملی میرے ہم جماعت اور دوست **محمد احمد** جو جید پریس کے مالک تھے، انھوں نے تھیسز کو شائع کرانے پر اصرار کیا۔ وہ اس زمانے میں تاریخ کی کتابیں بھی شائع کر رہے تھے۔ لہٰذا، ۱۹۸۲ء میں یہ تھیسز شائع ہو گیا۔ اس دوران میں نے ایک مقالہ 'مرزا غالب کے سیاسی افکار' لکھا جو بہت پسند کیا گیا۔

۱۹۶۸ء میں شعبہ تاریخ میں ہسٹری لکچرر کی پوسٹ کے لیے انٹرویو ہوا، اس انٹرویو میں میرے استاد ڈاکٹر **محمد عمر صاحب** بھی شریک ہوئے۔ وہ پہلے سے رورل انسٹی ٹیوٹ میں لکچرر کی پوسٹ پر کام کر رہے تھے۔ چنانچہ اس انٹرویو میں میرا، اسسٹنٹ لکچرر کی پوسٹ پر تقرر ہو گیا۔ دوسرے انٹرویو میں مجھے لکچرر کی پوسٹ پر مستقل کر دیا گیا۔ اس انٹرویو میں میرے شاگرد اور ساتھی **سید جمال الدین صاحب** نے بھی شرکت کی تھی۔ بعد ازاں اُن کا بھی شعبہ تاریخ میں بحیثیت لکچرر تقرر ہو گیا۔

مجیب صاحب کے ریٹائرمنٹ کے بعد **مسعود حسین خاں** صاحب جامعہ کے **وائس چانسلر** مقرر ہوئے۔ انھوں نے شعبوں کی صدارت کے روٹیشن کا اصول بدل کر صدارت سینیر لکچرر تک محدود کر دی۔ **محبّ الحسن صاحب**، **گرودر صاحب**، **حمیدہ آپا** یہ سب ریٹائر ہو چکے تھے۔ **پروفیسر اظہر انصاری صاحب** صدارت کا ٹرم پورا کر چکے تھے۔ ڈاکٹر سنہا کئی سال شعبے کے صدر رہ چکے تھے اس لیے سینیر لکچرر کی حیثیت سے راقم کو شعبے کی صدارت کا چارج دے دیا گیا۔ غالباً یہ بات **پروفیسر اظہر انصاری صاحب** اور **سنہا صاحب** کو اپنے شایانِ شان نہ لگی۔ **انصاری** صاحب کی شہ پر سنہا صاحب نے کورٹ میں مقدمہ کر دیا۔ کورٹ نے یہ کہہ کر کہ ایسے کیس کو طے کرنے کا مجاز جامعہ کی انتظامیہ کو ہے، کیس واپس کر دیا۔ نتیجے کے طور پر یہ کیس جامعہ کے **چانسلر ہدایت اللہ صاحب** کے سامنے پیش کیا گیا۔ جب **چانسلر صاحب** کی طرف سے میری پیشی کے لیے خط آیا تو میں نے جوابی خط میں یہ لکھ کر بھیج دیا کہ حقائق کی روشنی میں **چانسلر صاحب** جو بھی فیصلے کریں گے مجھے منظور ہوگا۔ اس لیے مجھے حاضری سے معاف رکھا جائے لیکن پیشی سے قبل **چانسلر صاحب** نے میری حاضری پر اصرار کیا۔ چنانچہ ایک دن ہماری پیشی قایم مقام رجسٹرار **ضمیر صاحب** کے ساتھ **چانسلر صاحب** کے روبہ رو **اشوکا ہوٹل** میں ہوئی۔ **چانسلر صاحب** بڑی شفقت سے پیش آئے۔ انھوں نے **سنہا صاحب** سے کہا کہ **مجیب اشرف** نے تو مجھے اختیار دے دیا ہے، اب آپ بتائیے کہ آپ کیا کہتے ہیں۔ غرض یہ کہ تمام سنوائی کے بعد **چانسلر صاحب** نے غالباً سینیر ٹی کی

بنیاد پر **سنہا صاحب** کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ اس واقعہ سے ہمارے اور **سنہا صاحب** کے ذاتی تعلقات پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ اس کے برعکس جب میرا ریڈر شپ کے عہدے پر پروموشن کا مسئلہ آیا تو **سنہا صاحب** اور **وائس چانسلر پروفیسر علی اشرف صاحب** نے میری بہت مدد کی اور میرا تقرر ریڈر پر ہو گیا۔

پروفیسر **بشیر الدین صاحب** کے **وائس چانسلر** مقرر ہونے کے بعد مجھے اساتذہ نے ٹیچرس ایسوسی ایشن کا سکریٹری منتخب کر لیا۔ اساتذہ کے کئی اہم مسئلے التوا میں پڑے ہوئے تھے۔ بالخصوص **پروفیسر علی اشرف صاحب** کے بعد میرٹ پروموشن کی اسکیم بند کر دی گئی تھی۔ کئی مسئلوں پر **بشیر الدین صاحب** سے گفتگو ہوئی۔ کچھ مسئلوں پر اختلاف اور ٹکراؤ بھی ہوا۔ امتحانات کے ممتحنانہ پر نظرِ ثانی کرنے اور ٹیچرس لانج تعمیر کرانے پر **وائس چانسلر صاحب** راضی ہو گئے، لیکن پروموشن کی اسکیم پر دوبارہ عمل درآمد کرنے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ افسوس کی بات یہ تھی کہ ہمارے ہی ایک ساتھی انھیں ورغلا رہے تھے۔ آخر کار یوجی سی سے پروموشن اسکیم کے پرانے سرکلر حاصل کیے گئے جس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ یہ اسکیم ہمیشہ جاری رہنے والی ہے۔ بہت تکرار کے بعد **وائس چانسلر صاحب** پروموشن کی اسکیم پر عمل درآمد کرنے پر راضی ہو گئے۔ نتیجے کے طور پر متعدد ٹیچرس کا ریڈر اور پروفیسر کی اسامی پر پروموشن ہو گیا۔ دیگر یونیورسٹیوں کے سکریٹریوں نے بھی پروموشن اسکیم کو دوبارہ بحال کیے جانے کے سلسلے میں رابطے کیے۔

پروموشن اسکیم کے تحت راقم الحروف بھی انٹرویو میں شریک ہوا۔ چوں کہ **وائس چانسلر صاحب** سے کئی مسائل پر تکرار ہو چکی تھی، اس لیے مجھے تھوڑا بہت خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔ انٹرویو بورڈ میں کئی یونیورسٹیوں کے پروفیسر ایکسپرٹ کی حیثیت سے ممبر تھے۔ خدا کا شکر کہ انٹرویو تسلی بخش ہوا۔ انٹرویو میں راقم کے علاوہ شعبے کے دیگر کئی اساتذہ بھی شریک ہوئے تھے، لیکن اس میں صرف میرا ہی پروموشن منظور کیا گیا۔ جب میری صدارت میں دیگر اساتذہ کے پروموشن کا سوال آیا تو میں نے انٹرویو کرا کے اُن تمام اساتذہ کے پروموشن کروا دیے۔

ریٹائرمنٹ سے چند ماہ قبل **وائس چانسلر سید شاہد مہدی صاحب** نے مجھے فیکلٹی آف ہیومنٹیز کا ڈین مقرر کر دیا۔ دراصل اس پوسٹ پر میرے سینیر ساتھی **رفاقت صاحب** کے بعد میرا نمبر آنا چاہیے تھا، لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ میری فیکلٹی کے ایک دوسرے ساتھی کو ڈین مقرر کر دیا گیا ہے۔

میرے کچھ ساتھیوں نے مجھ سے احتجاج کرنے کے لیے کہا، مگر چوں کہ وہ ڈین مقرر کردیے گئے تھے اور میرے اچھے دوستوں میں سے تھے۔ اس لیے میں نے کسی طرح کا احتجاج درج نہیں کرایا۔ کچھ عرصے کے بعد مجھے ڈین مقرر کردیا گیا، یہ تقرر مجھے نہایت افسوس کے ساتھ قبول کرنا پڑا، کیونکہ میرے یہ ساتھی دوست ہارٹ فیل ہوجانے کی وجہ سے رحلت فرما گئے تھے۔ بہرحال ایک ذمہ داری مجھ پر آپڑی تھی، اس کو تو نبھانا ہی تھا۔ ڈین شپ کے دوران مجھے اپنی فیکلٹی کے امتحانات کرانے کی ذمہ داری بھی سونپی گئی۔

جامعہ کے پروگرام اور تعلیمی نصاب

جامعہ کا قیام **گاندھی جی** کی عدم تعاون کی تحریک کے پس منظر میں ۲۹/اکتوبر ۱۹۲۰ء کو علی گڑھ میں آیا۔ **مولانا محمد علی جوہر** اس کے پہلے **وائس چانسلر** مقرر ہوئے۔ تعلیم کی غرض سے پہلے پہل لال ڈگی کی عمارت میں کلاسوں کو شروع کیا گیا۔ **ذاکر صاحب** بھی اس مہم میں شامل ہوئے تھے۔ ۱۹۲۲ء تک وہ جامعہ (علی گڑھ) میں پڑھاتے رہے۔ ۱۹۲۲ء میں **ذاکر صاحب** (پی ایچ ڈی) کرنے جرمنی چلے گئے۔ **مولانا محمد علی** نے سیاسی مشاغل کی مصروفیت کے باعث جامعہ کے کاموں سے سبک دوشی اختیار کرلی۔ **مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب** جو جامعہ کے فاؤنڈرس میں تھے، جامعہ کو قرول باغ لے آئے۔ ۱۹۲۴ء میں جامعہ کے بند ہونے کی نوبت آگئی تھی۔ **ذاکر صاحب** جامعہ کی زبوں حالی کے بارے میں پوری طرح باخبر تھے۔ انھوں نے **حکیم صاحب** سے درخواست کی کہ اُن کے جرمنی سے لوٹنے تک جامعہ کو کسی نہ کسی طرح قایم رکھا جائے۔ ۱۹۲۶ء میں **ذاکر صاحب** جب جرمنی سے واپس آئے تو جامعہ کو بے حال دیکھ کر اُن کے منہ سے حسبِ ذیل یہ اشعار نکلے:

گلشن میں کہیں بوئے دمساز نہیں آتی
اللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی
بیگانہ ہوئی دنیا رسم رہِ الفت سے
اک میری طبیعت ہے کہ باز نہیں آتی

ذاکر صاحب نے ہمدردانِ جامعہ کی ایک کمیٹی بنا کر چندے کی مہم شروع کی۔ ملک کی

خاص ہستیوں سے ملاقات کر کے چندے میں ایک بڑی رقم جمع کی گئی جس سے ۱۹۳۵ء میں اوکھلا گانو کے قریب ایک وسیع قطعہ اراضی خریدا گیا۔ اس رقم سے سب سے پہلے **ثانوی اور ابتدائی مدرسوں** کی عمارتوں کی تعمیر کا کام شروع ہوا۔ **برطانوی حکومت** سے کسی امداد کی توقع نہیں تھی اور نہ ہی مدد حاصل کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ البتہ **ہمدردانِ جامعہ** نے ایک لاکھ روپے سالانہ کا انتظام کر دیا تھا۔ **راج گوپال اچاریہ** نے **جامعہ** کو ساڑھے چار لاکھ روپے عنایت کیے تھے۔ اس کے علاوہ ڈھائی لاکھ روپے **استادوں کے مدرسے** کی عمارت کے لیے بھی عطا کیے۔ (**غلام حیدر**: '۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے' غیر مطبوعہ مقالہ) اس طرح اس قلیل آمدنی سے **جامعہ** کا خرچہ، اساتذہ اور دیگر اسٹاف کی تنخواہوں کا خرچہ نکالا جاتا تھا۔ اساتذہ بڑی قلیل تنخواہ پر کام کرتے تھے۔ خود **ذاکر صاحب** -/۱۲۵ روپے ماہانہ تنخواہ لیتے تھے اور دیگر اساتذہ -/۸۰ روپے سے -/۱۰۰ روپے تک تنخواہ پاتے تھے۔ ۱۹۳۸ء میں **استادوں کے مدرسے** کی عمارت کی بنیاد رکھی گئی۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے **مدرسہ ثانوی جامعہ نگر اوکھلا** کی اپنی عمارت میں **قرول باغ** سے منتقل کر دیا گیا۔ البتہ ۱۹۴۷ء تک **مدرسہ ابتدائی** کی تعلیم **قرول باغ** میں ہی جاری رہی تھی۔ (ملاحظہ ہو: **جامعہ کی یادیں**، **دھرمندر ناتھ** کا غیر مطبوعہ: مقالہ)

ذاکر صاحب کے جامعہ کے تعلیمی پروگراموں میں، **مدرسہ ابتدائی، ثانوی، کالج** اور باہر کے **مدرسے، تعلیمِ بالغاں**، نوخواندہ بالغوں کے لیے کتابوں کی اشاعت، **رات کے مدرسے**، **سماجی کاموں کے لیے مراکز**، **مکتبہ جامعہ** اور **اردو اکادمی** کے ذریعہ تصنیف واشاعت شامل تھے۔ اعلیٰ معیاری کتابوں کی اشاعت کے پنج سالہ منصوبے کے تحت اسکولوں کے لیے نصابی کتابیں تیار کرنا تھا۔ علاوہ ازیں **جامعہ** میں ایک نایاب کتابوں کی **لائبریری** قایم کی گئی جس میں نادر مخطوطات وخطبات جمع کیے گئے۔ **جامعہ** میں اسکاوٹ کی مضبوط تنظیم بھی کی گئی، **جامعہ** برادری اور اس کا کلب قایم کیا گیا، **بالک ماتا سینٹر** بھی قایم کیا گیا۔ رسالہ: **ہمدرد** اور معیاری رسالہ: **جامعہ** اور بچوں کا رسالہ: **پیامِ تعلیم** جاری کیے گئے۔ دراصل **ذاکر صاحب** چاہتے تھے کہ **جامعہ** جیسے مدرسے پورے ملک میں قایم کیے جائیں۔

ذاکر صاحب کی جامعہ محض ایک تعلیمی ادارہ نہیں تھا بلکہ **گنگا جمنی تہذیب وتمدن**

کا ایک بے مثال مرکز تھا۔ اس ادارے میں بچوں کو نہ صرف بنیادی تعلیم دی جاتی تھی بلکہ اخلاقی اور شائستگی کے عملی سبق بھی دیے جاتے تھے۔ لوگوں سے بلاتفریق مذہب وملت، محبت، ہمدردی اور رواداری سے پیش آنا، بزرگوں کی عزت اور خدمت کرنا سکھایا جاتا تھا۔ طالبِ علموں کی اس طرح تربیت کی جاتی تھی کہ جب جامعہ کا طالبِ علم کسی کے سامنے گفتگو کرے تو ہزاروں میں پہچانا جائے۔ اساتذہ میں یہ خصوصیات کچھ تو پہلے ہی سے موجود تھیں اور پھر **ذاکر صاحب** کی صحبت میں رہ کر مزید پیدا ہوجاتی تھیں۔ **ذاکر صاحب** طالبِ علموں میں انسانی قدروں کا وہ جذبہ بھر دیتے تھے جن کی مثالوں اور قربانیوں سے طلبہ روزافزوں اپنی شناخت کو نکھارنے میں منہمک رہتے تھے۔

ڈاکٹر **ذاکر حسین** نے **جامعہ** کا جو تعلیمی نصاب مرتب کیا تھا وہ بقول **دھرمندر ناتھ** (فرزند **گوپی ناتھ امن** [مقالہ] 'جامعہ کی یادیں' از: **دھرمندر ناتھ**، غیر مطبوعہ) واردھا کی بنیادی تعلیم' کی اسکیم پر مبنی تھا، مگر راقم کے مطالعے کے مطابق ذاکر صاحب کا جامعہ کا سارا تعلیمی نصاب اور دیگر مشاغل مولوی **بشیرالدین صاحب** کے اٹاوہ کالج سے تحریک پائے ہوئے تھے اور جب انھوں نے **واردھا** کی بنیادی اسکیم تیار کی تو اس وقت بھی **ذاکر صاحب** کے اپنے قدیمی اسکول کے نصاب اور مشاغل کا نقشہ ذہن میں رہا ہوگا۔ البتہ اس میں کوئی شک نہیں کہ **ذاکر صاحب** نے اپنے ذہن وذکاوت سے **جامعہ** کو اعلا پیمانے پر بہتر انداز سے پیش کیا تھا۔

تعلیمی نصاب میں مذہبی تعلیم طلبہ کے درس وتدریس کا ایک اہم حصہ تھی۔ اس سے طلبہ کے دماغ روشن ہوتے تھے۔ واضح رہے کہ ہندو طلبہ کے لیے ہندو اِتھکس کا بھی انتظام کیا گیا تھا، لیکن **گوپی ناتھ امن صاحب** نے اپنے صاحب زادوں کو **اسلامیات** پڑھنے کی تلقین کی تھی اور وہ اکثر جلسوں میں **قرآن شریف** کی تلاوت کرتے تھے۔ سائنس اور تمام سماجی علوم کے ساتھ ساتھ کسی نہ کسی طرح کی دست کاری یا ہنر کی تربیت بھی دی جاتی تھی۔ دست کاری میں خصوصیت سے **ابری کا کام، گتّے کا کام، ٹین کے کھلونے بنانا** اور **باغبانی** سکھائے جاتے تھے۔ اساتذہ کی نگرانی میں **بچوں کا بینک، خوانچہ** اور **بچوں کی دکان** وغیرہ کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ دراصل اس طرح بچوں کو مزدوری کے وقار (*Dignity of Labour*) کا سبق دیا جاتا تھا۔ بچوں کے نصاب میں قومی تحریک کی تاریخ شامل تھی۔ **سید احمد علی صاحب** ابتدائی درجوں میں پانچویں کلاس تک کی **تاریخ** پڑھاتے تھے۔ اقبال کا

قومی ترانہ، بچوں کی دعااور میرا وطن، جیسے ترانوں سے تعلیمی مرکز کا ہال گونجا کرتا تھا۔

اساتذہ اور طالب علموں کا ڈسپلن

جامعہ میں کردار سازی اور انسانی قدروں پر بہت زور دیا جاتا تھا۔ اساتذہ طلبہ کے ذہنوں کی نشو ونما میں ہر ممکن کوشش کرتے تھے۔ دراصل معلمین کی زندگی طالبِ علموں کے لیے شمعِ ہدایت ہوتی ہے۔ جامعہ کے اساتذہ مشکل سے مشکل کام کو سرانجام دینے میں اولوالعزمی، یقین محکم اور عمل پیہم سے طلبہ کے لیے مثال بنتے تھے۔ مولوی **بشیرالدین صاحب** جامعہ کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> علی گڑھ یونیورسٹی کے طلبہ کے مقابلے میں
> جامعہ کے طلبہ میں جو چیز سب سے زیادہ قابلِ
> تعریف تھی وہ اُن کی سادہ یونیفارم اور نماز
> روزے کی پابندی ہے۔

جامعہ، عدم تعاون کی تحریک کے پس منظر میں قایم ہوئی تھی جس کے باعث جامعہ کے اسٹاف اور طلبہ نے انگریزی لباس کو خیر باد کہہ کر کھدّر یا سادہ لباس پہننا شروع کر دیا تھا۔ جامعہ میں پانچوں وقت نماز پڑھنا اور ٹوپی پہننا ضروری تھا۔ ایک بار ایک طالبِ علم بغیر ٹوپی پہنے گیٹ تک پہنچا تھا کہ **ذاکر صاحب** نے اسے دیکھ لیا، وہ ایک دوسرے گیٹ سے جانے کی کوشش کر رہا تھا کہ **ذاکر صاحب** وہاں بھی پہنچ گئے۔ بچے کو سمجھایا کہ غلطی چھپانے سے بہتر ہے کہ اس کا سدھار کر لیا جائے۔ **ذاکر صاحب** اکثر مطبخ میں اچانک پہنچ جاتے تھے۔ طلبہ اکثر نان کے کنارے توڑ توڑ کر الگ کر دیتے تھے۔ ایک روز **ذاکر صاحب** وہاں پہنچ گئے اور نان کے کنارے کھانے لگے۔ اسی دن سے طلبہ نے نان کے کنارے توڑ کر ضائع کرنا بند کر دیے۔ اگر **ذاکر صاحب** کسی طالبِ علم کی شیروانی کے بٹن کھلے دیکھتے تو وہ اس کے پاس جا کر اپنے ہاتھوں سے شیروانی کے بٹن لگا دیتے تھے۔ راستے میں کاغذ کے ٹکڑے پڑے ہوتے تھے تو اُن کو اٹھا کر ڈسٹ بن میں ڈال دیتے تھے۔ بورڈنگ ہاؤس کا معائنہ کرنے پر اگر دیواروں پر فلمی ستاروں کی تصاویر چسپاں پاتے تو انھیں نصیحت کرتے کہ بڑے بڑے

قومی رہنماؤں کی تصویریں لگایا کرو۔ **ذاکر صاحب** نے اس طرح اساتذہ اور طلبہ کے لیے عملی مثالیں چھوڑی تھیں۔ **ذاکر صاحب** نے طلبہ کی تربیت کے لیے اپنی متعدد چھوٹی چھوٹی کہانیوں کی کتابیں بھی شائع کرائیں۔مثلاً ابوّ جان کی بکری ، مرغی کا بچہ وغیرہ،جنھیں پڑھ کر محنت،شرافت اور بہادری کی مثالوں سے طلبہ کی تربیت ہوتی تھی۔ **کیلاٹ صاحب** عیسائی تھے مگر طلبہ کو فجر کی نماز کے لیے جگاتے تھے۔ ماسٹر **عبدالواحد سندھی** صاحب وقتِ ضرورت طلبہ کو کھانا اور ناشتہ کراتے تھے۔ ہمارے زمانے میں **رزّاق صاحب** ضرورت مند طلبہ کی فیاضانہ طریقے سے مدد کرتے تھے۔

جامعہ میں ثقافتی مشاغل

اعلیٰ تعلیم کے ادارے یعنی **جامعہ کالج** ، **استادوں کا مدرسہ** اور **رورل انسٹی ٹیوٹ** ،جامعہ ملیہ اسلامیہ کا نام روشن کررہے تھے۔ثقافتی مشاغل کا مرکز پہلے کی طرح **ابتدائی اور ثانوی مدرسوں** کا کیمپس ہی تھا۔ یہ دونوں اقامتی درس گاہیں تھیں اور **کالج** میں طلبہ کی تعداد بہت کم تھی۔ اِن اسکولوں کے طلبہ اور دیگر کالجوں کے طلبہ مختلف کھیلوں جیسے **فٹ بال** ، **ھاکی** اور **کرکٹ** وغیرہ کھیلتے تھے۔ بہرحال جامعہ میں ثقافتی مشاغل پر خاص توجہ دی جاتی تھی۔جامعہ کے ثقافتی مشاغل میں اساتذہ اور طلبہ کے تئیں جامعہ کے **یومِ تاسیس** کے موقع پر تین دن کے تعلیمی میلے کو بہت اہمیت حاصل تھی، تمام اداروں کے طلبہ اور جامعہ سے باہر کے اسکولوں کے طلبہ مختلف کلچرل پروگراموں کے مقابلوں میں حصہ لیتے تھے۔ان مشاغل میں **موسیقی** کے مقابلے،**ڈرامے**،**تقریریں**، **تمثیلی مشاعرے**، **بیت بازی** کے مقابلے وغیرہ منعقد کیے جاتے تھے۔ اِن مشاغل کی تیاریاں بہت پہلے سے شروع ہوجاتی تھیں۔ تین روز تک مقابلوں کے بعد طلبہ کو انعامات تقسیم کیے جاتے تھے۔ جامعہ کی **بیت بازی** اور **تمثیلی مشاعرہ** بہت مشہور ہوگئے تھے۔جامعہ چوں کہ مخلوط تعلیم (*Co-Education*) کا ادارہ ہے، اس کی طلبہ بھی اِن تمام مشاغل میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھیں۔ بالخصوص **بیت بازی** کی ٹیم میں طلبہ بہت ماہر تھیں اور عظیم شاعروں کے اشعار یاد کر کے بڑی روانی سے پڑھتی تھیں۔

ظہور محمد خاں صاحب رورل انسٹی ٹیوٹ کے طلبہ کو گروپ سانگ سکھا کر

موسیقی کے مقابلے میں حصہ دلاتے تھے اور انعام بھی حاصل کرتے تھے۔ لڑکوں میں **ظہور محمد خاں صاحب** اور **پریم پرکاش صاحب** بڑی خوش الحان آواز میں غزلیں اور گیت گاتے تھے۔ لڑکیوں میں **لئیقہ مخموری** اور **انوری بیگم** کی آوازیں بہت اچھی تھیں اور موسیقی کے مقابلے میں اکثر انعام حاصل کرتی تھیں۔

جامعہ کا **تمثیلی مشاعرہ** تو اتنا مشہور ہوگیا تھا کہ باہر سے دعوت نامے آنا شروع ہوگئے تھے۔ ایک بار بلند شہر کی نمایش میں جامعہ کے تمثیلی مشاعرے کے شعرا کو مدعو کیا گیا۔ اس میں راقم نے بھی حصہ لیا تھا، میں نے **مجروح سلطانپوری صاحب** کی مشہور غزل:

ہمیں شعورِ جنوں ہے کہ جس چمن میں رہیں

انہی کے انداز میں پیش کی تھی۔ **انور صابری صاحب** کی غزل **رشید الوحیدی صاحب** نے پڑھی تھی۔ **خالد سیف اللہ صاحب** نے **سردار جعفری** اور **کیفی اعظمی** کی نظمیں اُنہی کے انداز میں پیش کی تھیں اور **روش صدیقی** کی غزل اُنہی کے انداز میں **وجاہت صاحب** نے پیش کی تھی۔ اس مشاعرے کو سُن کر سامعین بے حد محظوظ ہوئے تھے۔

جامعہ کا میلہ صبح سے شروع ہو کر دیر رات تک جاری رہتا تھا۔ اس کے پروگراموں میں صبح کو موسیقی، غزل سرائی، بیت بازی اور تقریروں کے مقابلے اور رات کو ڈرامے اور مشاعروں کی محفلیں سجتی تھیں۔ ہر ادارہ اپنا ڈراما یا کوئی ایکٹ پیش کرتا تھا۔ **مجیب صاحب** نے ایک **ڈرامیٹک سوسائٹی** قایم کی تھی۔ **مجیب صاحب** کے لکھے ہوئے ڈرامے سوسائٹی پیش کرتی تھی۔ اساتذہ اور طلبہ اِن ڈراموں میں حصہ لیتے تھے۔ مشہور ڈائرکٹر **حبیب تنویر صاحب** بھی اپنے ڈرامے، جامعہ میں پیش کرتے تھے۔ اِن ڈراموں میں جامعہ کے اساتذہ اور طلبہ حصہ لیتے تھے۔ اُن کا ایک ڈرامہ 'آذر کا خواب' میں **مینائی صاحب** اور **سعیدہ سلامت اللہ صاحبہ** نے خاص کردار نبھائے تھے۔ ایک دوسرے ڈرامے 'آگرہ بازار' میں جامعہ کے سینیر اساتذہ **عابد ملک صاحب**، **یوسف پاپا**، **اسد صاحب** اور دیگر اساتذہ اور طلبہ نے حصہ لیا تھا اور بعد کو یہی ڈراما انٹر یونیورسٹی یوتھ فیسٹیول (میسور) میں پیش کیا گیا۔ ہماری ایک انگلش ٹیچر **مسز کپیلا** بھی ڈرامے ڈائریکٹ کرتی تھیں۔ انھوں نے جامعہ میں ایک میلے میں 'تھری اسمائل' ڈرامہ پیش کیا تھا، جس میں، راقم نے خاص کردار نبھایا تھا۔ **حبیب تنویر صاحب** نے **مرزا غالب** پر بھی ایک ڈراما لکھا تھا،

انھوں نے جامعہ ہی میں رہ کر اس ڈرامے کی تیاری کی تھی۔

جامعہ کے میلے میں **ابتدائی اور ثانوی اسکول** کے طلبہ ٹی اسٹال اور ہوٹل بھی کھولتے تھے۔ ناظرین پروگرام دیکھنے کے بعد وہاں جاتے اور کھانا کھاتے تھے۔ **ابتدائی اور ثانوی مدرسوں** کے طلبہ میلے کے زمانے میں بڑے بڑے خوب صورت میوزیم سجاتے تھے، جن کو لوگ دیکھ کر دنگ رہ جاتے تھے۔ جامعہ میں **اوپن ایر تھیٹر** میں پروگرام تلاوتِ قرآن سے شروع ہوتے تھے۔ اس کے بعد جامعہ کا ترانہ پیش کیا جاتا تھا۔ پہلے **شفیع الدین نیر صاحب** کا لکھا ہوا ترانہ پیش کیا جاتا تھا۔ بعد ازاں ایک دوسرا ترانہ پیش کیا جانے لگا جسے **خلیق صاحب** کی نظم پر تیار کیا گیا تھا، اس کے بول حسبِ ذیل ہیں:

دیارِ شوق میرا شہرِ آرزو میرا

اس ترانے کی طرز **اشتیاق صاحب** کے بھائی جناب **اشفاق صاحب** نے تیار کی تھی اور سب سے پہلے ہمارے گروپ نے یہ ترانہ پیش کیا تھا۔ اس گروپ میں راقم کے علاوہ **ظہور محمد خاں صاحب، پریم پرکاش، اعجاز احمد، افضال چودھری** اور **ٹیچرس کالج** کی طلبہ بھی شامل تھیں۔ جب یہ ترانہ ہارمونیم اور طبلے کی دھن پر پیش کیا جاتا تھا تو ایک سماں بندھ جاتا تھا اور پورا ہال ترانے سے گونجنے لگتا تھا۔

سال کے وسط میں **تعلیمی میلے** کے بعد **ثانوی مدرسے** میں **ایک دن کا مدرسہ** منعقد کیا جاتا تھا، جس میں اس دِن ہر کلاس کے ایک ذہین طالب علم کو کلاس کا ٹیچر مقرر کیا جاتا تھا۔ اس دن تمام اساتذہ پکنک منانے کسی تاریخی مقام پر چلے جاتے تھے۔ پورے دن مختلف کھیل کھیلتے، دوپہر کا کھانا کھاتے اور شام کو واپس آتے تھے۔ میرے طالب علمی کے زمانے میں **مجیب صاحب** نے ایک منتخب طالب علم کو **نہرو پرائز** دینے کی اسکیم شروع کی تھی۔ یہ انتخاب زبانی امتحان کی بنیاد پر کیا جاتا تھا۔ پہلے برس **ثانوی مدرسے** کے ایک طالبِ علم **عامر** کو **نہرو پرائز** کا مستحق قرار دیا گیا۔ دوسرے برس **رورل انسٹی ٹیوٹ** کا ایک طالب علم **راشد نعمانی** **نہرو پرائز** کا اہل قرار دیا گیا۔

سال کے آخر میں یعنی مارچ یا اپریل میں **دلی کلاتھ مل** کے مالک **شنکر وشاد** کی طرف سے انڈو–پاک مشاعرہ منعقد کیا جاتا تھا، جس میں دونوں ملکوں کے مشہور اور چنندہ شعرا شرکت کرتے تھے۔ اس طرح کے مشاعروں میں دوستوں کے ساتھ راقم کو بھی جانے کا موقع ملا۔ ایک مشاعرے میں مشہور اداکار **دلیپ کمار صاحب** نے مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی تھی۔ ایک دیگر مشاعرے

میں مشہور فن کار و آرٹسٹ **فدا حسین صاحب** سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا۔ اِن مشاعروں میں **سردار جعفری**، **کیفی اعظمی**، **فراق گورکھپوری**، **بیکل اُتساہی** کے علاوہ پاکستان کے شعرا کو بھی سننے کا موقع ملا۔ اس مشاعرے کے بعد **مجیب صاحب** ان تمام شاعروں کو جامعہ میں مدعو کر کے مشاعرہ کراتے تھے۔ یہ تمام شاعر جامعہ میں بڑے خلوص کے ساتھ شرکت کرتے تھے، کیوں کہ یہاں کے تمام تعلیم یافتہ حضرات سے انھیں بھرپور داد و تحسین ملتی تھی۔

ایک دیگر اہم ثقافتی پروگرام **انٹر یونیورسٹی یوتھ فیسٹیول** بھی شروع ہوا تھا۔ طلبہ کا یہ میلہ دس دِن تک جاری رہتا تھا۔ راقم نے طالب علمی کے زمانے میں 'یوتھ فیسٹیول' کے ایک گروپ سانگ کی نمائندگی کی تھی، جو تال کٹورا گارڈن میں منعقد ہوا تھا۔ یہ گروپ سانگ **رفعت سروش صاحب** کے گیت پر تیار کیا گیا تھا جس کے بول حسبِ ذیل ہیں:

ناچ رہی ہے زمیں جھوم رہا آسماں
آگئی نئی بہار زندگی ہے شادماں

ہمارا یہ گروپ سانگ بہت پسند کیا گیا تھا۔

سب لوگ خیموں میں دس دن تک رہتے تھے۔ کھانے اور ناشتے کا بہترین انتظام ہوتا تھا۔ تمام یونیورسٹیوں کے طلبہ کے غول کے غول دن رات مشہور فلمی گانوں کی دُھنوں پر ڈانس کرتے نظر آتے تھے۔ صبح اور رات میں کلچرل پروگراموں کا مقابلہ ہوتا تھا۔ میلے کے دوران ایک بار **پروفیسر محمد مجیب صاحب** ہم لوگوں سے ملنے آئے، وہ ہمیں **پنڈت جواہر لال نہرو** سے ملانے اُن کی کوٹھی پر لے گئے۔ عصرانے کے بعد اُن کے ساتھ گروپ فوٹو بھی ہوا تھا۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ھندوستان کے عظیم رہنما اور وزیرِ اعظم **پنڈت جواہر لال نہرو** سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ دوسرے سال **انٹر یونیورسٹی فیسٹیول** (میسور) میں منعقد ہوا تھا۔ اس میں بھی راقم نے گروپ سانگ کی نمائندگی کی تھی، اس بار **ہلال صاحب** نے **مرزا غالب** کی ایک غزل قوالی کے انداز میں تیار کرائی تھی۔ **جامعہ** ہی سے طلبہ نے ایک **ڈراما** 'مرزا شہرت' فیسٹیول میں پیش کیا تھا۔ چوں کہ مجھے پہلے سے فیسٹیول کے مشاغل کا تجربہ تھا، اس لیے میں نے ایک **پیروڈی** تیار کی جو دیگر یونیورسٹیوں کے طلبہ کو بہت پسند آئی۔ **پیروڈی** کے بول حسبِ ذیل تھے:

ممبئی دلّی والوں کی، محفل ہے دل والوں کی
نگر نگر ڈگر ڈگر دھوم مچی متوالوں کی

ہمارے گروپ کے اتالیق **قادری صاحب** تھے، اور نائب اتالیق **پروفیسر مینائی صاحب**۔ **قادری صاحب** ہماری حرکات وسکنات پر سخت نظر رکھتے تھے اور **مینائی صاحب** دوستوں کی طرح ہم سب میں شیر وشکر ہو گئے تھے۔ ایک مرتبہ میں اور **افضال چودھری** لڑکیوں کے کمپارٹمنٹ میں غلطی سے داخل ہو گئے اور ٹرین چل پڑی۔ اسٹیشن آنے تک ہمیں وہیں رکنا پڑا۔ ہمارے ایک ساتھی **راشد نعمانی** صاحب نے **قادری صاحب** کے کانوں تک یہ خبر پہنچادی۔ **قادری صاحب** نے ہمیں سخت تاکید کی کہ ایسی حرکت آئندہ نہ ہو۔ میں نے اپنے ساتھی کی اس چغل خوری پر اسی وقت ایک **پیروڈی** لکھی جس کے بول حسبِ ذیل تھے:

سی آئی ڈی ہے یہاں موچھوں کی تانے کماں
کھیل نہ کھیلو کوئی نہ بولو کہہ دے گا سب داستاں

یہ **پیروڈی** بہت پسند کی گئی اور **مینائی صاحب** کے اصرار پر بار بار گائی گئی۔

جامعہ میں سیر وسیاحت کی اہمیت

جامعہ میں ثقافتی پروگراموں کے تحت سیر وسیاحت کو خصوصی اہمیت حاصل رہی ہے۔ جامعہ میں طالبِ علمی کے زمانے میں اور دورانِ معاش متعدد بار سیر وسیاحت کے مواقع میسر آئے۔ ابتدا میں اسٹاف کلب کی جانب سے سیر وتفریح کے پروگرام محض تفریح اور تبدیلیِ شغل کے طور پر کیے جاتے تھے، لیکن جب استادِ محترم **پروفیسر محمد مجیب صاحب** نے ہمیں (ایم اے) میں **فنِ تعمیر** 'کا پرچہ پڑھانا شروع کیا تو پھر سیر وسیاحت کا نظریہ ہی بدل گیا۔ اب یہ ایک بامعنی عملی تعلیم کا حصہ بن گیا تھا۔ اسی کے ساتھ ہمارے شوق وتجسس میں زبردست اضافہ ہوا۔ ہم استادِ محترم کی رہنمائی میں تاریخی عمارتوں کی باریکیاں، **مغل۔ ایرانی اور ہندوستانی فنِ تعمیر** کی صفات اور آمیزش کو تلاش کرتے اور سیکھتے۔ آگرے کے **تاج محل** کے خوب صورت گنبد اور **پرانے قلعے** کا حسین شیش محل اور دلّی کے **لال قلعے** اور **جامع مسجد** کی خوب صورت محرابیں، **قطب مینار** کی بلندی، **علائی دروازے** کی اسکوئنچ نما اور پہلا اصل **محرابی دروازہ**، احمد آباد کی **مسجد کی لرزشی پتھروں کی مینار** اور دیگر متعدد تاریخی عمارتوں کو فنی نظر سے

دیکھنے لگے تھے اور جب ہم قدرتی مناظر دیکھنے جاتے تو اونچی پہاڑیوں پر سفید چاندی نما برف سے ڈھکی چوٹیوں کو دیکھ کر قدرت کی کاریگری کے قائل ہو جاتے۔ خوش نما پھولوں سے سجی وادیاں اور مسلسل بہتے ہوئے جھرنے دیکھ کر خدا کی خدائی پر یقینِ کامل ہو جاتا تھا۔

جامعہ کی توسیع: کورسز اور عمارتیں

جامعہ میں **مولانا محمد علی جوہر روڈ** کے شمال مغرب میں دو بڑی عمارتیں تھیں۔ ایک کالج کی عمارت جس میں (بی اے) کے کلاسز ہوتے تھے۔ اس وقت کالج کے پرنسپل جناب **اعزاز الدین صاحب** تھے۔ دوسری عمارت کالج کے طلبہ کے ہوسٹل کے لیے مختص تھی۔ کالج کی عمارت کے پسِ پشت **بھوپال گراؤنڈ** کے نزدیک ایک دو منزلہ فلیٹ تھا جو اسٹاف کی رہایش کے لیے مخصوص کیا گیا تھا۔ اسی طرح ہوسٹل کی عمارت کے پسِ پشت ایک دو منزلہ فلیٹ اس وقت کے پرنسپل جناب **ضیاء الحسن فاروقی صاحب** کی رہایش گاہ تھی۔ ایک دو منزلہ فلیٹ خضر آباد گانو کے نزدیک ہے وہ بھی اسٹاف کی رہایش کے لیے مختص ہے۔

محمد علی جوہر روڈ کے شمال مغرب ہی میں جامعہ کے **ابتدائی اور ثانوی مدارس** کی عمارتیں ہیں۔ **ذاکر صاحب** نے ان عمارتوں کی تعمیر میں خصوصی دلچسپی لی۔ ان عمارتوں کی تعمیر میں خصوصی توجہ دے کر تعمیر کرایا تھا۔ انھوں نے جرمنی کے ایک آرکیٹیکٹ **ہائنس** کی خدمات حاصل کیں۔ نتیجے کے طور پر اِن عمارتوں میں جرمن اور **اسلامك فنِ تعمیر** کی خوب صورت آمیزش نظر آتی ہے۔ اِن عمارتوں کو لال اینٹوں اور خوب صورت سفید گول گنبدوں سے تعمیر کیا گیا ہے جو دور ہی سے بے حد دل کش لگتے ہیں۔ **ابتدائی اور ثانوی مدرسوں** کی عمارتیں طلبہ کی اقامت گاہ کے طور پر استعمال کی جاتی ہیں۔ انہی عمارتوں میں اتالیق اور مدارس کے نگراں کی رہایش گاہیں بھی ہیں۔ انہی عمارتوں میں طلبہ کی کلاسز بھی ہوتی ہیں۔ ثانوی کی عمارت میں **وائس چانسلر محمد مجیب صاحب** کا دفتر تھا اور **ڈسپنسری** بھی۔ **ابتدائی مدرسے** کی عمارت کی پشت میں طلبہ کا مطبخ اور ڈائننگ ہال بھی ہے۔ اسی کی پشت میں ایک کشادہ دالان نما عمارت تھی جو **محمد علی ہال** کے نام سے جانی جاتی تھی اور جس میں نماز کا اہتمام ہوتا تھا۔ اب اس عمارت کو مسمار کر کے اس کی جگہ ایک وسیع و خوب صورت **جامع مسجد** تعمیر کرا دی

گئی ہے، جس کی تعمیر ٹیچرس کالج کے سابق پرنسپل سعید انصاری صاحب کی دیکھ ریکھ میں ہوئی تھی۔ اسی کے ساتھ سڑک کے کنارے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کا مقبرہ اور میوزیم تعمیر کرایا گیا ہے۔

مدرسہ ثانوی کی عمارت کے پشت میں محمد علی جوہر روڈ کے کنارے ایک دومنزلہ عمارت ہے جس میں پہلے رجسٹرار آفس تھا، بعد میں رجسٹرار آفس کو تعلیم وترقی کے شعبے کی عمارت میں منتقل کر دیا گیا۔ اسی طرح ثانوی مدرسہ کی عمارت سے وی سی آفس بھی تعلیم وترقی کی عمارت میں شفٹ کر دیا گیا ہے۔ جامعہ کا اکاؤنٹس آفس بھی اسی عمارت میں پہنچا دیا گیا ہے۔ ثانوی مدرسے کی عمارت میں نیچے کی منزل میں جامعہ کی لائبریری تھی جس کے لائبریرین نبی صاحب تھے۔ یہ لائبریری پہلے تعلیم وترقی کی عمارت میں منتقل کی گئی اور بعد میں لائبریری کو محمد علی جوہر روڈ کے شمال مغرب میں ذاکر صاحب کے مزار کے قریب ایک نئی عمارت میں شفٹ کر دیا گیا۔ بہر حال لائبریری کی ایک اور نئی عمارت تعمیر کرائی گئی ہے جو کالج کیمپس میں واقع ہے۔ جنوب مشرق میں وی سی آفس کے بیرونی گیٹ کے باہر ایک چھوٹا سا بازار تھا، جہاں جامعہ کوآپریٹیو اسٹور، راشن کی دکان، مکتبہ جامعہ کی کتابوں کی دکان اور نیم کے درخت کے نیچے شاہد پان والے اور دیگر پان والوں کی دکانیں تھیں۔ وی سی آفس کو جو راستہ جاتا ہے اس کے دوسری جانب بوخاں کا کینٹین، ڈاک خانہ ایک فروٹ مرچنٹ کی عارضی دکان، رشید سائکل والے کی دکان، ممتاز پان والے کی دکان، نذیرہ کباب والے کی دکان اور پیارے بھائی نگینہ اسٹور ہوتا تھا۔ اس کے پشت میں دو کمروں میں اسٹاف کلب میں اسٹاف کے لوگ رات کو تاش، کیرم، ٹیبل ٹینس وغیرہ کھیلنے آتے تھے۔ دوسری جانب یعنی ڈاک خانے کے پشت میں نرسری کے قریب بیڈمنٹن کھیلنے کا انتظام تھا، جہاں ہم لوگ روز شام کو کھیلنے جاتے تھے۔ ہر سال ٹورنامنٹ ہوتے تھے۔ یہ بازار اب مسمار کر دیا گیا ہے۔ ڈاک خانہ، مکتبہ جامعہ، بینک اور دیگر دکانیں بھوپال گراؤنڈ سے متصل جمنیزیم کے قریب تعمیر کرادی گئی ہیں۔ وی سی آفس کے ہی نزدیک نرسری کے بچوں کے لیے ایک چھوٹی سی عمارت تھی، جس کی نگراں مشیر آپا تھیں۔

محمد علی جوہر روڈ کے جنوب مشرق میں اوکھلا گانو کے قریب استادوں کے مدرسے کی عمارت کا سنگِ بنیاد ۱۹۳۸ء میں رکھا گیا تھا۔ یہ عمارت سیمنٹڈ ہے اور اس پر بھی ایک خوب صورت گنبد تعمیر کرایا گیا ہے۔ اس عمارت کے قریب زیدی کوارٹرس کے نزدیک میں جامعہ کے گرلس ہوسٹل کی

عمارت تھی جواب لاء ڈپارٹمنٹ کو دے دی گئی ہے۔

جنوب مشرق میں نور نگر کی سڑک چھوڑ کر **ٹیچرس کالج** اور **مکتبہ جامعہ** کو جو راستہ جاتا ہے اس کے اطراف میں **ذاکر صاحب**، **عابد صاحب** اور **غلام السیدین صاحب** کی کوٹھیاں واقع ہیں۔ گرلس ہوسٹل اور اِن کوٹھیوں کے درمیان **مجیب صاحب** کی کوٹھی 'نسیم باغ' ہے اسی کے سامنے پرانے **اسٹاف کوارٹرس** ہیں۔ ٹیچرس کالج کے پیچھے اور نور نگر کے قریب ایک پرانا فلیٹ ہے جس میں پروفیسر **محبّ الحسن صاحب** کی رہایش تھی، وہاں **مجیب باغ اسٹاف کوارٹرس**، **جامعہ برات گھر** اور کینٹین کی عمارتیں تعمیر کرا دی گئی ہیں۔

۱۹۵۵ء میں جب رورل انسٹی ٹیوٹ قایم ہوا تو کالج کے کمروں اور خیموں میں **رورل سروسز** اور **رورل انجینیرنگ کی کلاسز** ہوتی تھیں، ڈائرکٹر **ہاشم امیر علی صاحب** نے منسٹری آف ایجوکیشن سے عمارت کے لیے گرانٹ منظور کرائی۔ مگر گرانٹ بہت قلیل تھی اور ضرورت فوری تھی اس لیے انھوں نے ایزبیسٹو شیٹس کے متعدد ہٹ مینٹس تعمیر کرا دیے جن کو ہم عام زبان میں ڈمپو کہتے ہیں۔ انھی ڈمپوؤں میں کلاسز، آفسز اور اسٹاف کی رہایش تھی۔ ڈمپوؤں کی دو وِنگس کے درمیان ایک کشادہ ورکشاپ ہے جس میں اکثر فنکشنز منعقد ہوتے تھے۔ اب اِن ڈمپوؤں کو مسمار کر کے نئی عمارتیں بنوادی گئی ہیں۔

دراصل **ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب** اور پروفیسر **محمد مجیب صاحب** کے تعلیمی اصولوں میں خاصی مماثلت تھی۔ دونوں ہی مصلح اور معلم تعلیمی نصاب میں انسانی قدروں کو ملحوظِ خاطر رکھنے میں یقین رکھتے تھے، یہی وجہ تھی کہ وہ جامعہ کی توسیع کی بابت بہت محتاط تھے۔ **مجیب صاحب** کا خیال تھا کہ جامعہ کو اسناد تقسیم کرنے کی ورکشاپ نہیں بنانا چاہیے، بلکہ جامعہ میں طلبہ کو اچھے انسان پیدا کرنے کا ادارہ بنایا جائے۔ حسنِ اتفاق ہے کہ **مجیب صاحب** ہی نے جامعہ کی توسیع کا سلسلہ شروع کیا۔ چنانچہ رورل انسٹی ٹیوٹ اور اعلیٰ تعلیم کے شعبہ جات قایم کرنے میں اخلاقی قدروں، خدمتِ خلق اور قومی جذبے جیسی صفات کا ہر اعتبار سے خیال رکھا گیا۔ ۱۹۶۳ء میں **مجیب صاحب** نے جب **انڈین ہسٹری اینڈ کلچر** کا شعبہ قایم کیا تو **جامعہ کالج** کی عمارت میں کلاسیں شروع کیں۔ بعدازاں **مجیب صاحب** نے کالج کیمپس ہی میں فیکلٹی آف ہیومنٹیز کی ایک کشادہ عمارت تعمیر

کروادی۔ چنانچہ **شعبہ تاریخ** کو اس نئی عمارت میں منتقل کر دیا گیا۔ دیگر شعبے بھی اسی عمارت میں منتقل کر دیے گئے۔ پرانے ہوسٹل کی عمارت کو بھی **شعبہ جغرافیہ** کے آفس اور کلاسوں کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ نئی فیکلٹی کی عمارت کے گیٹ کے دونوں طرف **مجیب صاحب** نے گلاب کے پودوں کی بڑی بڑی کیاریاں بنوادی تھیں، جن میں طرح طرح کے گلاب کے پھول کھلتے رہتے تھے۔ **کالج** کے گیٹ کے سامنے آرٹسٹ **تیاگی صاحب** کا تراشا ہوا **مرزا غالب** کا اسٹیچو ہاتھ میں دیوان لیے ہوئے نصب کیا گیا ہے۔ اس کے چاروں طرف سرسبز وشاداب لان بنادیے گئے ہیں، جہاں طلبہ خالی اوقات میں بیٹھتے ہیں۔ اس طرح یہ کالج کیمپس خاصا خوبصورت ہوگیا ہے۔ **مجیب صاحب** ہی کے زمانے میں **لائبریری** کی عمارت تعمیر کرائی گئی جو طلبہ کے ہوسٹل کی عمارت کے قریب ہے۔ اس عمارت کے پسِ پشت **جامعہ** رسائل کے آفیسز کے لیے ایک چھوٹی سی عمارت بھی تعمیر کرائی گئی ہے۔

جب **اے جے قدوائی صاحب وائس چانسلر** مقرر ہوئے تو انھوں نے **ماس کمیونیکیشن** کا ادارہ قایم کیا۔ جنوب مشرق میں **وی سی آفس** کے قریب اس کی عمارت تعمیر کرائی گئی۔ اسی کے ساتھ ایک کشادہ آڈیٹوریم اور ایک **نہرو گیسٹ ہاؤس** بھی بنوایا۔ اسی زمانے میں **ایس آر کے ہوسٹل** کی تعمیر ہوئی، **بی ایس سی انجینیرنگ** کا جب شعبۂ قایم ہوا تو اس کی عمارت بھی بنوائی گئی۔ مذکورہ بالا تمام عمارتیں **محمد علی جوہر روڈ** کے جنوب مشرق میں واقع ہیں۔ **فیکلٹی آف ہیومنٹیز** میں جب **شعبہ تاریخ** کے لیے جگہ تنگ ہوگئی تو **وائس چانسلر بشیر الدین صاحب** سے گزارش کر کے جنوب مشرق میں **اردو ڈپارٹمنٹ** کے قریب ایک دو منزلہ عمارت تعمیر کرائی گئی۔ اس عمارت میں **ہسٹری** کے شعبے کے علاوہ **عربی، فارسی، ہندی** اور **اسلامک اسٹڈیز** کے ڈپارٹمنٹ شفٹ کر دیے گئے ہیں۔ **انگلش** کے شعبے کو **اردو شعبہ** کے قریب ایک **کینٹین** کی عمارت میں شفٹ کر دیا گیا ہے۔

پروفیسر مشیر الحسن صاحب جب **وائس چانسلر** مقرر ہوئے تو انھوں نے **جامعہ** کی پرانی عمارتوں کو مسمار کرا کے نئی عمارتیں بنوائیں اور کئی دیگر کورسز کے لیے بھی نئی عمارتیں تعمیر کرائیں۔ اِن عمارتوں کے نام مشہور شخصیتوں کے نام پر رکھے گئے ہیں۔ اور نئے تعمیر شدہ بلند دروازوں کے نام اور نمبر شستہ **اردو** میں لکھ کر انھیں پہچان دے دی گئی ہے۔ اِن عمارتوں میں **جامعہ کالج** کی عمارت بھی مسمار کر کے نئی عمارت بنادی گئی ہے۔ جنوب مشرق میں ایک پرانی رہایش گاہ تھی، جس میں سینٹرل بینک تھا، اس کی جگہ ایک نئی عمارت تعمیر کر دی

گئی ہے جس میں **فزیوتھراپی** کا شعبہ قایم کیا گیا ہے۔ **مکتبہ جامعہ** کی پرانی عمارت کی جگہ نئی عمارت تعمیر کرادی گئی ہے۔ اس عمارت کو **ڈسٹینٹ ایجوکیشن** کے ادارے کے سپرد کردیا گیا ہے۔

ایک طرف جہاں جامعہ کی توسیع کا سلسلہ شروع ہوا، نئے نئے کورسز اور شعبے قایم ہوئے اور متعدد عمارتیں تعمیر ہوئیں تو دوسری جانب جامعہ کے چاروں طرف نئی نئی بستیاں وجود میں آنا شروع ہوگئیں۔ اِن بستیوں میں دھلی شہر کے قرب وجوار میں مختلف پیشوں سے وابستہ لوگوں کا بڑی تعداد میں بسنا شروع ہوگیا۔ جامعہ کی محدود سڑکوں پر اب ہر طرح کے ٹریفک حتیٰ کہ میٹرو تک کا ایک ہجومِ بے پناہ نظر آتا ہے۔ طلبہ اور اساتذہ کی تعداد میں بھی کثیر اضافہ ہوا ہے۔ آج بھی جب ہم جامعہ کی پرانی عمارتوں اور نئی عمارتوں کا موازنہ کرتے ہیں تو پرانی عمارتیں مضبوطی اور اپنی آن بان و شان کے لیے یکتا و یگانہ نظر آتی ہیں۔

موجودہ حالات میں جامعہ میں پہلے جیسی روایتیں کم یاب ہیں۔ نہ اب پہلے کی طرح ثقافتی مشاغل ہیں، نہ ادبی نشستیں۔ البتہ مشاعرے بالخصوص جامعہ کے میلے کے حوالے سے برائے نام رہ گئے ہیں۔ جامعہ میں رواداری، ہمدردی، خلوص ومحبت اور شایستگی جیسی روایتیں عنقا ہو چکی ہیں۔ آج کی جامعہ کے ماحول میں پرانے دنوں جیسا سکون بھی ندارد ہے۔ جامعہ اب دیگر یونیورسٹیوں کی طرح سرکاری احکامات کی پابند رہتے ہوئے عام ڈگر پر گامزن ہے۔ دراصل جامعہ کی یادوں کی پرواز کو بہ مشکل تمام قابو کیا گیا ہے، ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ متعدد خوش گوار لمحوں کی یادیں نوکِ قلم پر آنے کی دہائی دیتی رہ گئی ہیں۔ بقول **اکبرالہ آبادی**:

کل واقعات دہر کہاں ہسٹری میں ہیں
فوٹو ہے صرف سطحِ پیشِ نگاہ کا
وہ بھی فقط خیال مصنف بہ قید خود
کیا بن سکے چراغ صداقت کی راہ کا

ماضی کے جھروکوں سے جھانک کر دیکھو تو یادوں کا ایک امڈتا طوفان اور ایک بحرِ بیکراں نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔ وہ بھی کیا دن تھے، کیا محفلیں تھیں، کیا صحبتیں تھیں، کیا رونقیں تھیں، صبح سویرے طلبہ چھوٹے چھوٹے گروپ، سادہ اور شفاف لباس میں ملبوس مختلف گزرگاہوں سے خراماں

خراماں جوق در جوق ہنستے بولتے اپنی اپنی جماعتوں میں جاتے نظر آتے تھے۔ اساتذہ اپنے طلبہ کو پڑھانے کے لیے منتظر اور اپنے مضمون کے عمیق معنی و مطلب ان کے ذہنوں میں اتارنے کے لیے بے چین۔ اساتذہ کا اپنے طلبہ کے ساتھ شفیقانہ برتاؤ اور طلبہ کا اپنے اساتذہ کے لیے بے انتہا عزت و احترام کا جذبہ بے مثال ہوتا تھا۔ روز و شب کچھ نہ کچھ سیکھنے کے شوق میں طلبہ استادوں کو ہر دل عزیز بناتے تھے۔ اساتذہ میں ہر لمحہ طلبہ کو زندگی کا سلیقہ سکھانے کی دُھن لگی رہتی تھی۔ طلبہ اور اساتذہ ہمدردی اور خلوص کے رشتے میں بندھے ہوتے تھے۔

مجھ جیسے معمولی پتھر میں چمک پیدا کرنے میں میرے شفیق اساتذہ بالخصوص پروفیسر **محمد مجیب صاحب**، پروفیسر **محبّ الحسن صاحب**، پروفیسر **اقتدار صدیقی** صاحب، **سید صاحب** اور پروفیسر **امبا پرشاد صاحب** کی مہربانیاں شاملِ حال رہیں۔ میرے دماغ میں ان حضرات کی یادوں کی انمٹ چھاپ تاحیات رہے گی۔ جب جب مجھے اپنے محسنوں کی یاد آتی ہے تو میری پلکوں پر آنسو اِن جاودانی یادوں کی امانت میں خیانت کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔ اِن محسنوں کی یاد میں میرے لب پر یہ شعر بے محابا آجاتا ہے:

اب یادِ رفتگاں کی بھی ہمت نہیں رہی
یاروں نے کتنی دور بسائی ہیں بستیاں

◆

جامعہ ملیہ اسلامیہ

ایک خاموش دیدہ ور

ڈاکٹر عرفات ظفر

خطّۂ اعظم گڑھ ہمیشہ سے علم وادب کا گہوارہ رہا ہے۔علوم وفنون کے مختلف میدانوں میں یہاں کے مشاہیر نے خاصے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ان بزرگوں میں **علامہ شبلی نعمانی**، **مولانا حمیدالدین فراہی**، **مولانا اسلم جیراجپوری**، **مولانا عبدالسلام ندوی** اور **اقبال سہیل** وغیرہ کے نام خاصی اہمیت رکھتے ہیں۔اعظم گڑھ کے جن شعراوادبا نے اردو زبان وادب کے دامن کواپنی گراں قدر خدمات سے مالا مال کیا ہے ان میں **شمیم کرہانی**، **ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی**، **سید احتشام حسین**، **کیفی اعظمی**، **سید علی جواد زیدی**، **معین احسن جذبی** اور **مولانا ضیاء الدین اصلاحی** کے نام خاص طور پر لیے جاسکتے ہیں۔ **عبداللطیف اعظمی** (۲۰۰۲-۱۹۱۷ء) کا شمار بھی اسی دوسری نسل کے لکھنے والوں میں ہوتا ہے۔

پیدائش اور پرورش

عبداللطیف اعظمی یکم مارچ ۱۹۱۷ء کو پیدا ہوئے۔ان کا آبائی وطن موضع بندی کلاں ہے جو

مشہور قصبہ محمد آباد گھنہ سے چار پانچ کیلومیٹر جنوب مشرق میں واقع ہے۔ پہلے تو یہ گاؤں اور قصبہ ضلع اعظم گڑھ کا حصہ تھا لیکن مئو کے ضلع بن جانے کے بعد یہ نئے ضلع میں شامل ہوگیا۔ **لطیف صاحب** نے اسی گاؤں کے ایک کھاتے پیتے زمین دار گھرانے میں آنکھ کھولی۔ ان کے والد کا نام **عبدالصمد** اور دادا کا نام **حاجی برکت اللہ** تھا۔ **عبداللطیف اعظمی** کی پیدایش سے چند ماہ قبل ان کے والد طاعون کے مرض میں فوت ہو چکے تھے۔ جب ان کی عمر چار پانچ برس کی ہوئی تو والدہ بھی انتقال کر گئیں۔ **لطیف صاحب** کی پرورش اور تعلیم و تربیت ان کے بڑے ابا **حاجی عبدالحئی** نے اس طرح کی کہ **عبداللطیف** کو کبھی اپنی یتیمی کا احساس نہیں ہوا۔

تعلیم و تربیت

قدیم رواج کے مطابق مکتب کی تعلیم گھر رہ کر حاصل کی۔ ۷؍جولائی ۱۹۲۷ء کو انھیں مشرقی اتر پردیش کی قدیم اور مشہور دینی درسگاہ مدرسۃ الاصلاح (سرائے میر) کے درجہ عربی اول میں داخلہ دلایا گیا۔ مدرسۃ الاصلاح میں ان کا قیام ۱۹۲۷ء سے ۱۹۳۰ء کے درمیان رہا۔ یہ زمانہ مدرسۃ الاصلاح کا عہدِ زریں تھا۔ اس مدرسے میں **مولانا فراہی**، **مولانا شبلی متکلم ندوی**، **مولانا محمد سعید ندوی**، **مولانا عبدالصمد ندوی**، **مولانا اختر احسن اصلاحی** اور **مولانا امین احسن اصلاحی** جیسے فاضل اور یگانۂ روزگار اساتذہ تھے۔ **لطیف صاحب** جب تک مدرسۃ الاصلاح میں رہے سب سے زیادہ **مولانا امین احسن اصلاحی** سے قریب رہے۔ انھوں نے بولنے اور لکھنے کا سلیقہ انہی استاد سے سیکھا اور بقول **عبدالرحمٰن ناصر اصلاحی جامعی**: ''آج اردو ادب میں لطیف صاحب کو جو مقام حاصل ہے وہ مولانا امین احسن اصلاحی کا رہینِ منت ہے۔''[۱]

مدرسۃ الاصلاح میں چند سال گزار کر یہ ندوۃ العلماء لکھنؤ آ گئے۔ یہاں ان کا قیام ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۶ء تک رہا۔ ندوہ پہنچنے کے بعد لفظ 'اعظمی' ان کے نام کا حصہ بن گیا جو عمر بھر قایم رہا۔ ندوہ سے عالمیت کی سند لینے کے بعد ان کا ارادہ جامعہ ازھر (مصر) جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا تھا۔ لیکن **مولانا محمد اسلم جیراجپوری** کے مشورے پر انھوں نے مصر کا ارادہ ترک کر کے ۲۹؍اگست ۱۹۳۶ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ (نئی دھلی) کے **بی اے** [سال اول]

میں داخلہ لے لیا جو اس وقت قرول بارغ میں تھی۔[۲]

۱۹۴۱ء میں **عبداللطیف اعظمی** نے جامعہ سے (بی اے) مکمل کیا اور تقریر و تحریر کے میدان میں اپنی دھاک جمادی۔ جامعہ سے فراغت کے بعد **مولانا اسلم جیراجپوری** کی کوشش وسفارش سے ان کو انجمن ترقی اردو (دھلی) میں تقرری مل گئی۔ مگر مکتبہ جامعہ کے منیجر جناب **حامد علی خاں صاحب** کے اصرار پر مکتبہ جامعہ کی پیش کش کو قبول کر لیا اور اس طرح ستمبر ۱۹۴۱ء سے مکتبہ جامعہ سے وابستہ ہو گئے۔ وہاں کام کرنے کے ساتھ ہی انھوں نے **ڈاکٹر ذاکر حسین** کے خطبات اور ریڈیو کی تقریریں جمع کرنا شروع کیں جو مارچ ۱۹۴۳ء میں 'تعلیمی خطبات' کے نام سے شائع ہوئیں۔[۳] اس کے بعد ان کی ذمہ داریاں تبدیل ہوتی رہیں مگر جامعہ سے جو رشتہ قایم ہو گیا تھا وہ تا عمر رہا۔ جامعہ اور **لطیف صاحب** ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہو گئے تھے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ جامعہ کے بارے میں گفتگو ہو اور **لطیف صاحب** کا ذکر نہ آئے۔

ایک مدت گزر جانے کے بعد (۱۹۵۷-۱۹۵۵ء) انھوں نے مسلم یونیورسٹی میں ایم اے (عربی) میں داخلہ لے کر پڑھائی شروع کی مگر عین امتحان کے وقت اہلیہ کی علالتِ ناگہانی کے باعث امتحان میں شریک نہ ہو سکے۔ پھر ایک طویل عرصے کے بعد (۱۹۷۵-۱۹۷۳ء) انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ہی اردو میں (ایم اے) کیا اور اس کے بعد 'جامعہ کے مصنفین کی علمی وادبی خدمات' کے موضوع پر (پی ایچ ڈی) میں داخلہ لے لیا۔ مگر **اعظمی صاحب** کی گوناں گوں مصروفیات کے باعث یہ کام پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔

وفات

تقریباً نصف صدی تک جامعہ ملیہ اسلامیہ سے مختلف حیثیتوں سے وابستہ رہنے کے بعد وہ بالآخر ۱۹۸۴ء میں جامعہ کی ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ سبکدوشی کے بعد انھوں نے اپنے ادبی و تحقیقی کاموں کی طرف خصوصی توجہ کی تا کہ وہ اپنے پروگرام کے مطابق اپنے علمی منصوبوں میں رنگ بھر سکیں۔ آخری عمر میں خاصے کمزور ہونے کی وجہ سے انھیں طرح طرح کی عارضے لاحق ہو گئے تھے۔ ۱۱ رمئی ۲۰۰۲ء بروز شنبہ ایک بجے دن میں تقریباً ۸۵ برس کی عمر میں انھوں نے جان جانِ آفریں

کے سپرد کردی۔ اس طرح خیابانِ جوہر میں ہر وقت چہکنے والا یہ بلبلِ ہزار داستاں ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون.

عبداللطیف اعظمی اور مدرسۃ الاصلاح

اس بات کا تذکرہ ہو چکا ہے کہ **اعظمی صاحب** ۱۹۲۷ء میں بحیثیت طالب علم **مدرسۃ الاصلاح** میں داخل ہوئے اور ۱۹۳۵ء تک یہاں کے اساتذہ سے اخذ و استفادہ کرتے رہے۔ مدرسے کی بزمِ خطابت میں پابندی کے ساتھ شریک ہوتے اور پوری تیاری کے ساتھ تقریر کرتے تھے۔ ان کی مضمون نگاری کا آغاز بھی اسی مدرسے سے ہوا۔ خود **اعظمی صاحب** کا بیان ہے:

> میں نے گیارہ بارہ سال کی عمر میں لکھنے کا جو سلسلہ
> شروع کیا تھا وہ اب بھی جاری ہے۔[۲۴]

انھوں نے جس وقت مدرسۃ الاصلاح چھوڑا، اس وقت تک وہ مضمون نگار کی حیثیت سے معروف ہو چکے تھے۔

۱۹۳۰ء میں ندوہ منتقل ہو جانے کے باوجود ان کا دل کبھی مدرسۃ الاصلاح اور اپنے محبوب استاد **مولانا امین احسن اصلاحی** کی یادوں سے غافل نہیں رہا۔ شاید اسی لیے تو کسی شاعر نے کہا ہے:

> نَقِّلْ فُؤَادَکَ حَیْثُ شِئْتَ مِنَ الْهَوَیٰ
> مَا الْحُبُّ إِلَّا لِلْحَبِیْبِ الْأَوَّلِ

> تو چاہت سے مجبور ہو کر اپنے دل کو جہاں مرضی
> منتقل کر لے لیکن جو محبت تجھے پہلے محبوب سے تھی
> وہ کہیں اور نہ پا سکے گا۔

ندوۃ العلماء میں بھی انھوں نے تحریر و تقریر کے میدان میں اپنے خوب خوب جوہر دکھائے اور وہاں طلبہ کی انجمن 'الاصلاح' کے سیکرٹری منتخب ہوئے۔

جنوری ۱۹۳۶ء میں جب مدرسۃ الاصلاح پر 'دائرہ حمیدیہ' کا قیام عمل میں آیا اور **مولانا امین احسن اصلاحی** نے دائرہ کا ترجمان مجلّہ: الاصلاح ، جاری کیا تو **عبداللطیف صاحب** نے

دور رہتے ہوئے بھی ان کاموں میں بھرپور دلچسپی لی اور مجلّے کے لیے مضامین لکھتے رہے۔ مجلّہ الاصلاح، میں ان کے جو مضامین شائع ہوئے ان کے عنوانات اس طرح ہیں:

- عربی شاعری پر اسلام کا اثر۔
- اسلامی فتوحات اور قوموں کے اختلاط کا اثر– عربوں پر۔
- عربوں اور ترکوں کے اختلاط پر ایک تاریخی نظر۔
- یورپ اور امریکہ کے عجیب وغریب مدرسے۔
- مدرسة الاصلاح، افلاس کا اثر دماغ پر۔
- ڈکٹیٹر کی نفسیات۔ وغیرہ۔[۵]

مذکورہ بالا عنوانات سے **لطیف صاحب** کی ذہنی وقلمی اٹھان کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اگر وہ یکسو ہوکر اسلامیات اور عربی ادبیات کو موضوع بناتے تو وہ ان میدانوں میں بھی اپنے بیش قیمت نقوش چھوڑ جاتے۔

۱۹۳۹ء کے آخر میں جب مجلّہ: الاصلاح، بند ہوگیا تو انھوں نے دائرہ حمیدیہ کی ایک شاخ قرول باغ (دھلی) میں قایم کی، جہاں سے اپنے اہتمام میں اپنے استاذ **مولانا اصلاحی** کی کتاب حقیقتِ نماز، پہلی بار شائع کی۔ اس کتاب کے دیباچہ میں **مولانا عبداللطیف صاحب** کا شکریہ ادا کرتے ہوئے **مولانا اصلاحی** نے ان کے لیے یہ دعا بھی کی: "اللّٰہ تعالیٰ انھیں میرے دینی خیالات میں بھی میرا ہم نوا بنادے۔"

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ **مولانا امین احسن اصلاحی** کی خدمات کو بنیادی طور پر تین خانوں میں بانٹا جاسکتا ہے۔ (۱) صحافتی خدمات (۲) قرآنی خدمات (۳) تحریکی ودعوتی خدمات۔ **مولانا اصلاحی** کے بیشتر شاگردوں نے ان کی مؤخرالذکر دونوں خدمات میں حصہ لیا اور اسے آگے بڑھایا۔ **عبداللطیف اعظمی** ھندوستان میں **مولانا اصلاحی** کے اکلوتے شاگرد ہیں جنھوں نے ان کی صحافتی وراثت کو سنبھالا اور اسے اپنا میدانِ عمل قرار دیا اور مختلف مجلّوں اور رسالوں کی ادارت واشاعت میں پوری سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا۔ **مولانا اصلاحی** ھندوستان سے پاکستان جانے والوں سے اپنے جن چند شاگردوں کے احوال دریافت کرتے ان میں سے ایک **عبداللطیف صاحب** بھی ہوتے۔

مدرسة الاصلاح اوراس کی درودیوار سے اسی عقیدت ومحبت کی بنا پر **لطیف صاحب** جب بھی وطن تشریف لاتے تو کئی کئی روز یہاں گزارتے اور مدرسے میں قیام کرتے۔ بعد کے زمانے میں جو شخصیت انھیں کھینچ کر مدرسے میں لے آئی وہ تھی ان کے صدیق حمیم **مولانا عبدالرحمٰن ناصر اصلاحی جامعی** کی شخصیت، جن سے ان کا اخوت ومودت کا رشتہ تھا۔ **مدرسة الاصلاح** سے ان کے اسی تعلقِ خاطر کی بنا پر وفات کے بعد **لطیف صاحب** کی خواہش کے مطابق ان کے ذاتی کتب خانے کا معتد بہ حصہ **مدرسة الاصلاح** (سرائے میر) کی لائبریری کو منتقل کردیا گیا۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ

عبداللطیف اعظمی ۱۹۳۶ء میں **جامعہ ملیہ اسلامیہ** (نئی دہلی) سے بحیثیت طالبِ علم وابستہ ہوئے اور سلسلۂ تعلیم مکمل کرنے کے بعد بقیہ زندگی اسی جہانِ علم وادب کی خدمت میں گزاردی۔ سبکدوشی کے بعد بھی اس در کو چھوڑنے پر کسی طور پر آمادہ نہ ہوئے۔ **جامعہ** کے پڑوس میں **ذاکر نگر** نامی بستی میں ریٹائرمنٹ سے پہلے ایک چھوٹا سا مکان بنالیا تھا۔ جہاں وہ تادمِ آخر رہے اور وفات کے بعد **جامعہ ملیہ اسلامیہ** کا قبرستان ان کی ابدی آرام گاہ قرار پایا۔ **لطیف صاحب** ہمیشہ **جامعہ** کے انتظامی اور غیر تدریسی شعبوں سے وابستہ رہے۔ کبھی **مکتبہ جامعہ** کے ملازم رہے تو کبھی **جامعہ** کے **شعبۂ تصنیف وتالیف** کے انچارج مقرر ہوئے اور کبھی **جامعہ کے کتب خانہ** کے مہتمم بنائے گئے۔ لیکن جو ذمہ داری بھی انھیں سونپی جاتی اسے پوری توجہ، دلچسپی اور خلوص ولگن کے ساتھ انجام دیتے۔ آخر میں **شیخ الجامعہ** کے پرسنل اسسٹنٹ اور سیکرٹری مقرر ہوئے۔ اس حیثیت سے انھوں نے **پروفیسر محمد مجیب**، **پروفیسر مسعود حسین خاں** اور کچھ دنوں **انور جمال قدوائی صاحب** کے ساتھ کام کیا اور اس عہدے سے اپنی وفاداری کا حق ادا کردیا۔ تاہم اس دوران اہلِ **جامعہ** کو یہ شکایت رہی کہ وہ **شیخ الجامعہ** کے سیکرٹری کی حیثیت سے نہایت سخت ہیں اور **وائس چانسلر** سے کسی کو ملنے نہیں دیتے۔ لیکن یہ سخت رویہ وہ اس لیے اختیار کرتے تھے کہ **شیخ الجامعہ** پوری یکسوئی وانہماک کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے سکیں۔ علاوہ ازیں **مجیب صاحب** وغیرہ نے اپنی **وائس چانسلری** کے زمانے میں جو مضامین اور کتابیں وغیرہ لکھیں وہ **لطیف**

صاحب کی اس سخت گیری کے بغیر ممکن نہیں تھا۔

لطیف صاحب جامعہ اور اقدارِ جامعہ کے سچے عاشق تھے۔شہر دھلی کے علمی، ادبی وثقافتی جلسوں میں شریک ہوکر وہ جامعہ کی نمائندگی کرتے تھے۔جامعہ کے اساتذہ میں وہ **ڈاکٹر ذاکرحسین** اور **پروفیسر محمد مجیب** سے بے حد متاثر تھے۔وہ ہر اس مسئلے کو اپنا مسئلہ بنا لیتے جس کا تعلق جامعہ، **ذاکر صاحب** اور **مجیب صاحب** سے ہوتا۔اسی لیے جب کوئی ان پر نکتہ چینی کرتا تو اس کے مقابلے کے لیے **لطیف صاحب** فوراً میدان میں آجاتے۔**ڈاکٹر ذاکرحسین** کی **بنیادی قومی تعلیم** سے متعلق واردھا اسکیم پر جب **مسلم لیگیوں** اور **غلام احمد پرویز** کے ماہنامہ رسالہ: طلوعِ اسلام (دھلی) نے اعتراض کیا تو **ذاکر صاحب** کی ہدایت کے علی الرغم پوری جامعہ برادری کی طرف سے **لطیف صاحب** نے اس کا جواب لکھا اور **جوش ملیح آبادی** کے ماہنامہ رسالہ: کلیم (دھلی) میں اسے شائع کروایا۔اسی طرح ایک زمانے میں **مولانا عبدالماجد دریابادی** اپنے ہفتہ وار رسالے: صدقِ جدید، میں **مجیب صاحب** اور ان کے تعلق سے جامعہ پر اپنے خاص انداز میں تنقیدی نوٹ لکھا کرتے تھے۔**مجیب صاحب** کی ممانعت اور **مولانا دریابادی** کے عمر و مرتبہ کی پروا کیے بغیر **لطیف صاحب** پابندی سے ہر نوٹ کے جواب میں ایک مراسلہ روانہ کردیا کرتے تھے۔[۶]

اس کے علاوہ **لطیف صاحب** کو **مولانا ابوالکلام آزاد** سے بڑی عقیدت ومحبت تھی۔**مولانا** کے انتقال کے بعد جب **ہمایوں کبیر** نے انڈیا ونس فریڈم، شائع کی تو **مولانا** کے ایک پرانے عقیدت مند **غلام رسول مہر** نے بعض داخلی وخارجی شواہد کی بنیاد پر اسے **مولانا** کی باقاعدہ تصنیف ماننے سے انکار کردیا۔اس کے جواب میں **لطیف صاحب** نے مضامین اور مراسلوں کی بھرمار کردی اور بالآخر **مہر صاحب** کو خاموشی اختیار کرنی پڑی۔[۷]

جامعہ چونکہ اس وقت قومی تحریک اور آزادی کی جدوجہد کا مرکز تھی اور اس کا پورا وجود ہی تحریکِ خلافت اور نان کوآپریشن مووومنٹ کا رہینِ منت ہے، اس لیے **لطیف صاحب** بھی جامعہ کے ماحول اور اربابِ جامعہ کی صحبت میں پکے نیشنلسٹ اور کانگریسی ہوگئے تھے۔**گاندھی جی، جواہر لال نہرو، مولانا آزاد، بابو راجندر پرشاد** اور **مولانا محمد علی جوہر** سے دلچسپی شاید اسی کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔

غرض کہ جس طرح **رشید احمد صدیقی** علی گڑھ کے عاشق اور مسلم یونیورسٹی

ان کا اوڑھنا بچھونا تھی اسی طرح **لطیف صاحب جامعہ** کے عاشق وشیدائی اور **جامعہ** ان کی ساری سرگرمیوں کا مرکز تھی۔ **لطیف صاحب جامعہ** کے عاشق بھی تھے اور مجاہد بھی۔ **جامعہ** پر جب بھی کوئی وقت پڑا یا کسی نے اس پر کیچڑ اچھالا تو **جامعہ** کا یہ عاشق ومجاہد اس کے مقابلے کے لیے سینہ سپر ہو گیا۔

اخلاق وعادات

عبداللطیف اعظمی بڑی باغ وبہار اور مرنجاں مرنج شخصیت کے مالک تھے۔ چونکہ ان کے اجداد راجپوت تھے اس لیے ان میں راجپوت مسلمانوں کی آن بان پائی جاتی تھی۔ اپنے لباس، چال اور کج کُلاہی کے باعث دور ہی سے پہچان لیے جاتے تھے۔ **لطیف صاحب** کبھی افسردہ نہیں دیکھے گئے۔ وہ خود بھی ہنستے اور دوسروں کو بھی ہنساتے تھے۔ اپنے آپ پر ہنسنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ نوجوان طلبہ وطالبات کے ہجوم میں آتے ہی آؤ مجھے چھیڑو کی زندہ تصویر بن جاتے۔ اپنے اسی وصف کے باعث وہ ہمیشہ تازہ دم نظر آتے۔ نہ کسی کی بات کا برا مانتے اور نہ ہی روٹھتے۔ ہر جگہ وہ ہمیشہ نیچرل نظر آتے۔ **لطیف صاحب** بالکل بے ضرر انسان تھے۔ تواضع، خاکساری، سادگی، رواداری، ایمان داری اور بے نیازی کے ساتھ مہمان نوازی ان کی شخصیت کے نمایاں اوصاف تھے۔ غیرت وخودداری کا یہ حال تھا کہ طالبِ علمی کے زمانے میں گھر والوں سے اخراجات طلب کرنے میں انھیں تأمل ہوتا۔ (بی اے) کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ملازمت کے سلسلے میں **ذاکر صاحب** سے ملنے سے انکار کر دیا۔

جامعہ میں ان کے بعد کے لوگوں نے خاصی ترقی کی لیکن **لطیف صاحب** اپنی جگہ قانع ومطمئن رہے اور اپنے فرائضِ منصبی پورے انہماک سے انجام دیتے رہے۔ انھوں نے کبھی قسمت اور مقدر کا شکوہ نہیں کیا۔ ان کی مصاحبت **جامعہ** کے اربابِ حل وعقد سے رہی لیکن نہ تو خود کبھی کوئی فائدہ اٹھایا اور نہ دوسروں کو فائدہ اٹھانے دیا۔ انھوں نے **جامعہ** کے دوسرے کارکنوں کی طرح بہت سخت زندگی گزاری مگر ہر حال میں خوش وخرم اور اپنے کام میں لگے رہے۔ زندگی میں نام ونمود اور صلے کی خواہش کبھی نہیں کی۔

صحافتی خدمات

عبداللطیف اعظمی علمی، ادبی اور صحافتی حلقوں میں ایک **ممتاز صاحبِ قلم** اور کہنہ مشق صحافی کی

حیثیت سے مشہور و معروف رہے۔ لکھنے کا مشغلہ مدرسۃ الاصلاح میں طالب علمی کے زمانے ہی سے جاری تھا۔ چنانچہ جب وہاں سے مجلّہ: الاصلاح، نکلنا شروع ہوا تو اس کے مستقل مقالہ نگاروں میں شامل ہوگئے۔ اصلاح اور ندوہ میں طالبِ علمی کے دوران انھوں نے کوئی قلمی رسالہ نکالا یا نہیں؟ اس کا کوئی ثبوت تو نہیں ملتا، البتہ جامعہ ملیہ آنے کے بعد وہ طلبائے جامعہ کے رسالہ: جوہر، کے مدیر بن گئے اور ۱۹۴۰ء میں اس کا **مولوی عبدالحق (نمبر)** شائع کیا جس کی ملک بھر میں پذیرائی ہوئی۔ ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۴ء کے درمیان وہ ماہنامہ رسالہ: جامعہ، کے اسسٹنٹ ایڈیٹر رہے۔ ۱۹۴۸ء میں جب **ڈاکٹر عابد حسین** کے زیرِ ادارت ہفتہ وار اخبار: نئی روشنی، نکلنا شروع ہوا تو **لطیف صاحب** اس کے اسسٹنٹ و منیجنگ ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۲ء میں جب یہ بند ہوا تو ہمدردِ جامعہ، کے نام سے ایک ماہنامہ جامعہ ملیہ اسلامیہ سے خود **لطیف صاحب** کی ادارت میں نکلنا شروع ہوا۔ ۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۷ء تک وہ انجمن ترقی اردو (ھند) کے معیاری ادبی رسالے: صبح، کے مدیر رہے۔ اس کی مدیرِ اعلیٰ **حمیدہ سلطان صاحبہ** تھیں۔ **لطیف صاحب** نے صبح، کا روش (نمبر) بڑی محنت و لگن سے مرتب کیا تھا۔

رسالہ: جامعہ، ۱۹۴۷ء میں بند ہوگیا تھا۔ اس کے نشأۃ ثانیہ میں **لطیف صاحب** کا بہت بڑا حصہ ہے۔ نومبر ۱۹۶۰ء میں جامعہ کے جشنِ چہل سالہ کے موقع پر رسالہ: جامعہ، کے دورِ ثانی کا پہلا شمارہ **لطیف صاحب** ہی کی ادارت میں منظرِ عام پر آیا۔ چند برس تک وہ تنِ تنہا بڑی محنت اور دلچسپی سے اسے مرتب کرتے رہے۔ اس عرصے میں انھوں نے جامعہ، کے دو تین خصوصی شمارے بھی نکالے۔ ان ہی کی محنت و کاوش سے ملک کے کئی معروف اہلِ قلم جامعہ، کے قلمی معاونین میں شامل ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد **پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی** اس کے مدیر اور **اعظمی صاحب** نائب مدیر ہوگئے۔ **پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی** نے مجلّہ: جامعہ، کے تعلق سے **عبداللطیف اعظمی** کی کاوشوں کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

> اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر لطیف صاحب
> کی محنت ومشقت، دوڑ بھاگ، مضمون نگاروں
> سے مضمون حاصل کرنے کے لیے ان کی مسلسل

خط کتابت کی عادت اور کاتبوں اور پریس سے
نبٹنے اور کام لینے کا برسوں کا تجربہ میرے
شاملِ حال نہ ہوتا تو رسالہ جامعہ، کے ایسے
شاندار خصوصی نمبر میرے دورِ ادارت میں نکل
نہ سکتے۔ آخر کوئی بات تو ہے کہ جامعہ میں
اور جامعہ کے باہر بھی لوگ لطیف صاحب کے
بغیر رسالہ کا تصور بھی نہیں کرسکتے، خواہ
اس کا مدیر کوئی بھی ہو۔[۸]

مذکورہ بالا رسائل ومجلّات میں شائع **لطیف صاحب** کے مضامین ومقالات اور اداریوں کی تعداد خاصی ہے۔ علاوہ ازیں اخبارات ورسائل میں استدراک اور مراسلہ نویسی **عبداللطیف اعظمی** کا محبوب مشغلہ تھا۔ ان کے مراسلے اگر جمع کر کے شائع کردیے جائیں تو ایک دلچسپ کتاب تیار ہو جائے گی۔ اس طرح نصف صدی سے زائد عرصے تک انھوں نے لوح وقلم کی خدمت کی۔ اپنے خریداروں اور ملنے جلنے والوں کو ہمیشہ کچھ نہ کچھ لکھنے پر اکساتے رہتے تھے۔ اور انھیں **شبلی، آزاد** اور **مولوی عبدالحق** کی تحریروں کو گھول کر پی جانے کا مشورہ دیتے۔

تصانیف کی روشنی میں

زمانۂ طالب علمی کی اسی مشق وممارست نے آگے چل کر انھیں ایک عمدہ قلم کار اور صاحبِ طرز انشاپرداز بنادیا اور صحافت کے راستے سے وہ ادب کے میدان میں آگئے۔ **جامعہ** آکر انھوں نے **اردو ادب** اور تحقیق کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا۔ تحقیق میں وہ بڑی دقتِ نظر اور عرق ریزی سے کام لیتے، جزئیات پر پوری نظر رکھتے اور تفصیلات فراہم کرنے میں کوئی گوشہ اوجھل نہ ہونے دیتے۔ شعرا وادبا سے متعلق معلومات ماہ وسال کی تحقیق کے ساتھ جمع کرتے۔ سنجیدہ تحقیق وتصنیف کے ساتھ بچوں کے مسائل اور **بچوں کے ادب** سے متعلق تحریریں بھی **لطیف صاحب** کے ادبی سرمایے کا حصہ ہیں۔ بزرگوں اور قومی رہنماؤں پر ان کی تصنیفات اسی ضرورت کے پیشِ نظر حیطۂ تحریر میں لائی گئی ہیں۔ وہ

اردو میں تقریباً دو درجن کتابوں کے مصنف ومرتب ہیں۔ انتظامی مناصب سے وابستہ رہتے ہوئے ان کی تصنیفی وتالیفی سرگرمیاں مطالعہ وتحقیق سے ان کے گہرے شغف کا ثبوت ہیں۔ ان کی بیش تر تصنیفات ہندوستان کی اہم علمی وسیاسی شخصیات کی حیات وافکار سے تعلق رکھتی ہیں۔

عبداللطیف اعظمی کی کتابوں میں مولانا شبلی کا مقام ومرتبہ اردو ادب میں، ایک اہم تصنیف مانی جاتی ہے۔ اس کے ذریعہ انھوں نے ادب وتحقیق کے میدان میں اپنی جگہ بنانے میں کامیابی حاصل کی۔ اس کتاب کا شمار **شبلیات** پر اولین تصانیف میں کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی تصانیف میں سوشلزم، امریکی عدالتِ عالیہ کے شاندار کارنامے (ترجمہ) بھارت: آج اور کل (**پنڈت نہرو** کی کتاب کا ترجمہ) بابائے اردو مولوی عبدالحق، یہ کتاب **بابائے اردو** کے انتقال کے بعد سب سے پہلے **اعظمی صاحب** نے مرتب کی تھی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین سیرت وشخصیت، جواہر لال نہرو —ایک مطالعہ، گاندھی جی اور ان کے خیالات، سرسید احمد خان اور ان کی معنویت موجودہ دور میں، مولانا محمد علی جوہر– ایک مطالعہ، مشاہیر کے خطوط اور ان کے مختصر حالات، ہیں۔ مؤخرالذکر کتاب خطوط کا مجموعہ ہے، اس کتاب میں گیارہ مشاہیر کے پیغامات اور ۱۳۲، ادیبوں اور شاعروں کے خطوط ان کے مختصر حالاتِ زندگی کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔

عبداللطیف اعظمی کی کتاب اقبال دانائے راز بڑی تلاش وتحقیق کے ساتھ لکھی گئی ہے اور **اقبالیات** میں ایک اہم اضافہ ہے۔ اس کے علاوہ ان کی تصانیف میں ڈاکٹر راجندر پرشاد– عظیم رہنما اور پہلے راشٹرپتی، تیسرے راشٹر پتی ذاکر حسین، اردو شعراء وادباء کی ڈائرکٹری، جسے انھوں نے **پروفیسر گوپی چند نارنگ** کے اشتراک سے تیار کیا ہے۔ جدید دور کے اردو خطوط – ایک جائزہ، جواہر لال نہرو اپنی تحریروں کی روشنی میں، جسے انھوں نے **کشمیری لال ذاکر** کے ساتھ ترتیب دیا ہے اور معترضینِ ابوالکلام آزاد بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ معترضین **ابوالکلام آزاد** کا تعارف کراتے ہوئے مرحوم **مالک رام** نے لکھا ہے:

> آزاد صدی کے زمانہ میں انھوں (لطیف صاحب) نے چار کتابیں مرتب کی ھیں۔ ان میں پھلی کتاب آپ کے ھاتھ میں ھے۔ امید واثق ھے کہ باقی کتابیں (۱) ابوالکلام آزاد– سوانح اور خدمات، (۲) مولانا آزاد ماہ وسال اور خطوط کی روشنی میں (۳) آزاد شناسی، یہ ان مقالات کا مجموعہ ھے جو آزاد صدی کے مختلف سیمیناروں میں پڑھے گئے، انشاء اللّٰہ بھت جلد منظرِ عام پر آجائیں گی۔[۹]

محترمہ بیگم لطیف صاحبہ نے بھی اعظمی صاحب کی وفات پر اپنے ایک تأثراتی مضمون میں لکھا ہے:

> مولانا حسرت موھانی، اردو ادیبوں کے خطوط اور مولانا آزاد پر آخر عمر میں کافی مواد اکٹھا کیا تھا اور شاید کچھ کے مسودے بھی مکمل کرلیے تھے، غالباً نظرِثانی کررھے تھے۔[۱۰]

ان کے علاوہ کچھ کتابیں انھوں نے بچوں اور نوخواندہ حضرات کے لیے لکھی تھیں جن کے نام اس طرح ہیں: لڑائی کے ھتھیار، تین سوال اور سویڈن کے عوامی کالج وغیرہ۔

عبداللطیف اعظمی کی تصنیفی اور تحقیقی خدمات کا اعتراف قومی اور صوبائی ہر سطح پر ہوا۔ اترپردیش حکومت (یوپی) اردو اکیڈمی؛ آل انڈیا میر اکیڈمی (لکھنؤ) اور اردو اکیڈمی (مغربی بنگال) کی طرف سے انھیں متعدد انعامات واعزازات سے نوازا گیا۔

۱۹۸۵ء میں جشنِ لطیف کے موقع پر اپنے ایک انٹرویو میں عبداللطیف اعظمی نے اپنی کتاب

 'کواپنی اہم اور پسندیدہ تصنیف قرار دیا تھا۔ اس کتاب کے ذریعہ ان کا نام **شبلی** کے اولین ناقد وسوانح نگار میں ہونے لگا۔ یہ دراصل **لطیف صاحب** کا (بی۔اے) کا مقالہ ہے جو انھوں نے ۱۹۴۱ء میں **ڈاکٹر سید عابد حسین** کی زیر نگرانی مکمل کیا۔ اس وقت تک **علامہ شبلی** پر کوئی مستقل تصنیف منظرِ عام پر نہیں آئی تھی۔ البتہ **اقبال سہیل** 'سیرتِ شبلی' کے عنوان سے چند مضامین ضرور قلم بند کر چکے تھے۔ حیاتِ شبلی ' بھی اس وقت تک منصّۂ شہود پر نہیں آئی تھی۔ تاہم اپنے مقالے کی اشاعت سے پہلے **لطیف صاحب** کو اس کے مسودات کے کچھ اوراق دیکھنے کا موقع ضرور مل گیا تھا۔

۱۹۴۵ء میں **عبداللطیف اعظمی** کی یہ کتاب زیورِ طباعت سے آراستہ ہوکر منظرِ عام پر آئی **ڈاکٹر سید عابد حسین** اس کتاب کے پیشِ لفظ میں رقم طراز ہیں:

> اعظمی صاحب شبلی کے بے لاگ نقاد نہیں بلکہ پُرجوش معترف ہیں۔ اس لیے اگر شبلی اور ان کے معاصرین میں مقابلہ کرتے وقت ان کی تحریر میں وکالت کی جھلک نظر آئے تو وہ معذور ہیں۔ پھر بھی کتاب اپنے موضوع اور لکھنے والے کے خلوص کی وجہ سے دلچسپی اور افادے سے خالی نہیں۔

ڈاکٹر عابد حسین نے اپنے پیشِ لفظ میں دبے لفظوں میں **لطیف صاحب** پر وطنی عصبیت کا الزام لگایا اور **شبلی** کے معاصرین کے ساتھ ان کی ناانصافی کا شکوہ کیا ہے۔ لیکن **پروفیسر آلِ احمد سرور** نے اس کتاب پر مبسوط مقدمہ لکھ کر **لطیف صاحب** کی جی بھر کر داد دی اور جس طرح داد دی اس کے بعد انھیں شاید کسی اور سند کی ضرورت نہیں تھی۔ **پروفیسر آلِ احمد سرور** نے فرمایا:

> شبلی پر کچھ لکھنے کے لیے کسی اعتذار کی ضرورت نہیں، وہ ہماری ذہنی زندگی کے معماروں میں سے ہیں، ... مؤلف نے جس طرح

شبلی کے علمی وادبی کارناموں پر عام اردو داں
طبقے کے لیے روشنی ڈالی ہے وہ لائقِ تحسین ہے۔

اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے **پروفیسر انور صدیقی مرحوم**، استاذ شعبۂ انگریزی، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے لکھا ہے:

کام طالب علمی کے زمانے کا ضرور تھا مگر طالبِ
علمانہ ہرگز نہیں تھا۔[۱۱]

کتاب کا انتساب **لطیف صاحب** نے **مدرسۃ الاصلاح** (سرائے میر) میں اپنے مشفق استاذ اور نامور **مفسرِ قرآن مولانا امین احسن اصلاحی علیہ الرحمہ** کے نام کیا ہے۔ کتاب کا پہلا اِڈیشن ۱۹۴۵ء میں شبلی اکیڈمی قرول باغ میں (دهلی) سے شائع ہوا تھا۔ اس کی دوسری اشاعت ۱۹۸۵ء میں (لکھنؤ) سے ہوئی۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ دار المصنفین شبلی اکیڈمی کے نام سے ایک ادارہ قایم کر دیا تھا جہاں سے یہ کتاب شائع ہوئی۔ اس کتاب کی اشاعت پر نصف صدی سے زائد کا عرصہ گزر چکا ہے، تاہم جو پذیرائی اور مقبولیت اسے اس وقت حاصل ہوئی وہ آج **شبلی** پر سیکڑوں کتابیں آجانے کے بعد بھی برقرار ہے۔ اسی طرح **علامہ شبلی** کے ادبی مقام و مرتبہ کے متعلق **لطیف صاحب** نے جو رائے دورانِ طالبِ علمی قایم کی تھی وہ آخر عمر تک برقرار رہی۔[۱۲]

اسلوب نگارش

عبداللطیف اعظمی کا شمار اپنے عہد کے صاحبِ طرز ادیب اور ممتاز اہلِ قلم میں ہوتا ہے۔ علومِ مشرقیہ کے فاضل ہونے کے ناطے ان کی نگاہ قدیم وجدید علوم اور ادبیات پر تھی۔ وہ نہایت صاف اور سادہ زبان لکھنے کے عادی تھے جسے انھوں نے اپنی بعض تحریروں میں 'روکھی اور پھیکی' زبان سے تعبیر کیا ہے۔ انھوں نے عبارت آرائی اور انشاپردازی کو کبھی پسند نہیں کیا۔ ان چیزوں کو وہ تنقید و تحقیق کے لیے سمِ قاتل تصور کرتے تھے۔ ان کے اسلوب نگارش میں ایک قسم کی ہم واری، تہہ داری اور صلابت ملتی ہے جو **دبستانِ شبلی** کی دین ہے جس میں وہ پلے بڑھے ہیں۔[۱۳] اسی وجہ سے ناقدین نے انھیں **دبستانِ شبلی** کا ہیرو

تسلیم کیا ہے۔ لیکن خود **لطیف صاحب** کا کہنا ہے کہ میری زبان اور اسلوب پر جامعہ کا اثر زیادہ ہے۔[۱۴]

یہ بات انتہائی افسوس کے ساتھ کہنی پڑتی ہے کہ علمی دنیا نے **اردو زبان و ادب** کے اس سچے عاشق اور بے لوث خادم کو بہت جلد بھلا دیا۔ ادبی و ثقافتی حلقوں اور تحقیقی و تصنیفی اداروں میں نہ تو ان کی وہ پذیرائی ہوئی جس کے وہ مستحق تھے اور نہ ہی ان کی ادبی و تحقیقی کاوشوں کی قدر و قیمت کے تعین کے سلسلے میں کوئی قابلِ ذکر کام یا پروگرام ہوا۔ حتیٰ کہ ان اداروں اور دانش گاہوں نے بھی انھیں نظر انداز کیا جن کی حیثیت **لطیف صاحب** کے نزدیک 'دیارِ شوق اور شہرِ آرزو' کی تھی۔ **عبداللطیف اعظمی** جہاں بھی رہے **مدرسۃ الاصلاح** اور دار المصنفین کی یادوں سے ان کا دل ہمیشہ آباد رہا۔ **جامعہ ملیہ اسلامیہ** اور **ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ** کا تصور بھی **لطیف صاحب** کے بغیر ادھورا رہے گا۔ جامعہ سے بچھڑ کر جینے کا خیال ان کے لیے امرِ محال تھا۔ لیکن افسوس کہ یہاں سے وابستہ افراد کے پاس بھی **لطیف صاحب** کو یاد کرنے کا وقت اور بہانہ نہیں ہے۔ **پروفیسر شباب الدین**، **صدر شعبۂ اردو شبلی نیشنل کالج (اعظم گڑھ)** نے ایسے ہی کسی موقعے پر کہا تھا: "ہم اپنے مرحومین کی تدفین کے ساتھ ہی ان کی یادوں کو بھی دفن کردیتے ہیں۔"

مرحوم **پروفیسر کبیر احمد جائسی** نے **پروفیسر انور صدیقی** مرحوم، استاذ شعبۂ انگریزی جامعہ ملیہ اسلامیہ، پر اپنے خاکے کے اخیر میں لکھا ہے:

> گزشتہ بیس برسوں میں رسالہ جامعہ نے بہت اچھے اچھے خاص نمبر نکالے ہیں۔ چند کو چھوڑ کر یہ تمام نمبرات ان اصحاب کے لیے وقف ہیں جن کا کبھی بھی جامعہ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ کیا ہی اچھا ہوگا اگر رسالہ جامعہ اپنے وابستگان کو بھی یاد رکھے اور ان پر اگر نمبر نہیں تو 'گوشے' ہی شائع کردے تاکہ کل کے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے طالب علم یہ جان سکیں کہ ان کی مادرِ علمی سے کیسے کیسے اصحابِ

> فکر ونظر اور ادیب ومفکر وابستہ رہے ہیں۔
> مرنے والے مرجاتے ہیں ان پر نمبر یا گوشہ نکلے
> یا نہ نکلے وہ اس سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ یہ تو
> زندوں کا فرض ہے کہ جانے والوں کو اس طرح
> یاد رکھیں کہ بعد کے آنے والے بھی ان سے واقف
> رہیں۔[۱۵]

حواشی

۱۔ ماہ نامہ: کتاب نما (خصوصی شمارہ) عبداللطیف اعظمی حیات وخدمات ،جامعہ نگر، (نئی دھلی)، مارچ ۱۹۸۵ء، ص: ۴۸

۲۔ حوالۂ سابق، ص: ۵۸

۳۔ ماہ نامہ: ایوانِ اردو [جلد: ۱۶، ش: ۳] جولائی ۲۰۰۲ء، اردو اکادمی (دھلی)، ص: ۴۴

۴۔ عبداللطیف اعظمی حیات وخدمات، ص: ۶۳

۵۔ الاصلاح (ایک تعارف) مؤلف: ضیاء الدین اصلاحی، دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر، اعظم گڑھ (یوپی) سال اشاعت: ۲۰۰۷ء، ص: ۱۵

۶۔ حوالۂ سابق: ملاحظہ ہو ص: ۲۰، ۲۱ اور ۲۶

۷۔ حوالۂ سابق، ص: ۲۴-۲۱

۸۔ حوالۂ سابق، ص: ۱۸

۹۔ معترضین ابوالکلام آزاد / مرتبہ: عبداللطیف اعظمی، علمی ادارہ، ذاکر نگر، (نئی دھلی)، ملاحظہ ہو: کتاب کا بیک کور۔

۱۰۔ ماہ نامہ: ایوانِ اردو (دھلی)، جولائی ۲۰۰۲ء، ص: ۳۵

۱۱۔ عبداللطیف اعظمی حیات وخدمات، ص: ۳۰

۱۲۔ حوالۂ سابق، ص: ۶۸

۱۳۔ حوالۂ سابق، ص: ۱۴-۱۳

۱۴۔ حوالۂ سابق، ص: ۷۰

۱۵۔ نقوشِ جاوداں — پروفیسر کبیر احمد جائسی، تقدیم وترتیب ڈاکٹر شباب الدین، شعبۂ اردو، شبلی نیشنل کالج (اعظم گڑھ)، سال اشاعت: مارچ 2013ء، ص: ۶۷

شعری دریچہ

اکرم نقّاش

تعارف : پروفیسر کوثر مظہری

اکرم نقاش ۱۸/ فروری ۱۹۶۱ء کو گلبرگہ (کرناٹک) میں پیدا ہوئے۔ بی ای (سول) اور ایم اے (اردو) کی ڈگریاں حاصل کیں۔ شاعری کی ابتدا ۱۹۸۳ء میں کی۔

اردو شاعری میں ۱۹۸۰ء کے بعد والی نسل میں **اکرم نقاش** کا نام محتاجِ تعارف نہیں۔ انھوں نے زندگی کے اتار چڑھاؤ، سیاسی وسماجی اُتھل پتھل کو تو پیشِ نظر رکھا ہی، ساتھ ہی انھوں نے اپنے اندرون میں بھی جھانکنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے اس کے لیے بھی کوشش نہیں کی کہ قارئین ان کے اشعار سن کر یا پڑھ کر فوراً واہ واہ کرنے لگ جائیں۔ بلکہ ان کے شعری متن کی تفہیم وتعبیر کے لیے قدرے توقف

اور غور وفکر کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ ان کی فکر یا طرزِ اظہار میں کسی طرح کی پیچیدگی اور ژولیدہ بیانی ہے۔ بلکہ وہ اپنے قارئین کو تدبر اور ٹھہر کر پڑھنے کی دعوت دیتے ہیں۔ شاعری کے اس موجودہ عہد میں جو انتشار دیکھنے کو ملتا ہے، اس دُھند میں **اکرم نقاش** کا شعری جمال ایک پُرکار اور پُرنور تناظر خلق کرتا ہے۔ ان کی تخلیقیت کے دامن میں روایت بھی ہے، زمانے کی آگہی بھی ہے اور شعورِذات سے مل کر سفر طے کرتی ہوئی اپنے عہد کی کرب آمیز حسّیت بھی۔ اس کرب آسافکری اساس میں کسی طرح کا تناؤ یا تشنج نہیں ہے جس سے ان کی تخلیقی ہنر مندی کے مستحکم اور پختہ ہونے کا اندازہ بھی ہوجاتا ہے۔ انھیں‌تیس پینتیس برسوں کی غزلیہ اور نظمیہ شاعری میں ایک اعتبار حاصل ہے۔ انھوں نے خوبصورت اور اثر انگیز رباعیاں بھی کھی ہیں۔ ان کی تخلیقی کتب اس طرح ہیں:

۱۔ شعر [۱۹۹۵ء]

۲۔ حشر سی یہ برسات (رباعیات) [۲۰۰۹ء]

تخلیقات کے علاوہ کچھ مرتب کردہ کتب بھی ہیں:

ترتیب کردہ کتب:

۱۔ افلاک [۲۰۰۳ء]

۲۔ خانۂ تکلم (۱۱ ادیبوں سے انٹرویوز) [۲۰۱۶ء]

۳۔ محمود ایاز کی تحریریں [۲۰۱۸ء]

۴۔ غزل کے رنگ [۲۰۱۴ء]

♦

سلگتی راتوں میں چاندنی پر، ترے بدن کے عذاب دیکھوں
برستے موسم میں، بجلیوں سا سرا پا شعلہ بہ آب دیکھوں

صدائے تشنہ لبی ہے ہر سو، صدائے نوحہ گراں ہر اک سمت
سسکتے خوابوں کی انجمن میں، میں اپنے خوابوں کے خواب دیکھوں

مری بَصارت گماں کی زد پر مرا تخیل بھی بے یقینی
تجھے کبھی میں کتاب دیکھوں، تجھے کبھی میں سراب دیکھوں

کہیں قفس کی صدا ہے روشن، کہیں پہ نغمہ سرا ہے صحرا
کہیں قفس کی طلب کا نوحہ، کہیں رہائی کا باب دیکھوں

مرے نگر کی اداسیوں میں، وہ چاند جب بھی چمک اٹھا ہے
میں ہر نظر آفتاب دیکھوں، ہر ایک چہرہ گلاب دیکھوں

♦

ہراک آواز پر لپکے یہ ہر سائے کو چھب جانے
عجب دیوانہ دل ہے یہ تری عادت کو کب جانے

عذابِ کہکشاں کیا ہے ،ہے کیا بے خوابیوں کا زہر
فقط میں جانتا ہوں یا مری ہمراہ شب جانے

میں کیا مخفی رہوں تجھ سے میں کیاظاہرکروں تجھ پر
تو میری روح میں دائم مرے اسرار سب جانے

ترے ہونے سے کیا کیا رنگ تھے بے رنگیوں میں بھی
نہیں ہے تو تو دکھلائے ہے کیا رنگ طرب جانے

کسی کو درد بانٹے ہے کسی کو چین بخشے ہے
یہ کیا طرزِ عنایت ہے یہ تو ہی میرے رب جانے

بدن سادہ ورق ہے جب تلک نظروں سے ہے محروم
نگہ پاتے ہی کتنے رنگ اور کتنے ہی ڈھب جانے

♦

تو ساتھ ہے مگر کہیں تیرا پتا نہیں
شاخوں پہ دور تک کوئی پتا ہرا نہیں

خاموشیاں بھری ہیں فضاؤں میں ان دنوں
ہم نے بھی موسموں سے ادھر کچھ کہا نہیں

تو نے زباں نہ کھولی سخن میں نے چن لیے
تو نے وہ پڑھ لیا جسے میں نے لکھا نہیں

یہ کون سی جگہ ہے یہ بستی ہے کون سی
کوئی بھی اس جہان میں تیرے سوا نہیں

چلیے بہت قریب سے سب دیکھنا ہوا
اپنے گماں سے ہٹ کے کہیں کچھ ہوا نہیں

چھوڑا ہے جانے کس نے مجھے بال و پر کے ساتھ
یہ کن بلندیوں پہ جہاں پر ہوا نہیں

رنگِ طلب ہے کون سی منزل میں کیا کہیں
آنکھوں میں مدعا نہیں لب پر صدا نہیں

پیچھے ترے اے راحتِ جاں کچھ نہ پوچھیو
کیا کیا ہوا نہیں یہاں کیا کچھ ہوا نہیں

♦

کوئی الزام میرے نام میرے سر نہیں آیا
وہ جو طوفان اندر تھا مرے باہر نہیں آیا

یہ کس کی دید نے آنکھوں کو بھر ڈالا خلا سے یوں
کہ پھر آنکھوں میں کوئی دوسرا منظر نہیں آیا

جنوں بردار کوئی روئے صحرا پر نہیں دیکھا
کنار آب جو پیاسا کوئی لشکر نہیں آیا

ہوئی بارش درختوں نے بدن سے گرد سب جھاڑی
کوئی ساون کوئی موسم مرے اندر نہیں آیا

کہیں پتھرا گئی آنکھیں کہیں شل حوصلوں کے پاؤں
کہیں رہ رو نہیں پہنچا کہیں پر گھر نہیں آیا

کبھی کشتی پہ کوئی بادباں میں نے نہیں رکھا
اڑانوں کے لیے میری کوئی شہ پر نہیں آیا

نہیں ہو کر بھی ہے ہر سانس میں شامل مقابل بھی
مگر ذی ہوش کہتے ہیں کوئی جا کر نہیں آیا

◆

میں کوئی خواب بنتا جا رہا ہوں
سمندر میں اترتا جا رہا ہوں

کھنڈر آباد ہوتے جارہے ہیں نگر ویران کرتا جا رہا ہوں

پرندے گھونسلوں میں آرہے ہیں میں تنہائی سے بھرتا جا رہا ہوں

بساطِ رنج کے مہروں کے آگے خوشی کی چال چلتا جا رہا ہوں

مزاحم ہے صدائے عہدِ رفتہ و گر نہ میں تو مرتا جا رہا ہوں

کوئی آواز دیتا جا رہا ہے
کسی کے ساتھ بہتا جا رہا ہوں

◆

ہمارے قدموں سے ہے راستہ بندھا یوں ہی
کہاں تلک ہے سرابوں کا سلسلہ یوں ہی

زباں تھی گنگ نظر میں خموشیوں کے چراغ سو میں بھی بت سا مقابل کھڑا رہا یوں ہی

دریچے بند نہیں ہو سکے کسی صورت کہ بابِ خواب کھلا تھا کھلا رہا یوں ہی

بجھائے دیتی ہے ہر اک چراغ حسرت کو تو کیا رہے گی مرے ساتھ یہ ہوا یوں ہی

ترے خیال کو تجسیم کر نہیں پایا میں رنگ و نور کہاں تک سمیٹتا یوں ہی

یہ بازگشت اگر ہے تو پھر کہاں تو ہے
میں کب تلک تجھے دیتا رہوں صدا یوں ہی

♦

ہوا جو بدلی تناظر سبھی بدلنے لگے
پرانے رنگ نئے منظروں میں ڈھلنے لگے

جو فاصلہ ہے وہ کم ہو تو کس طرح کم ہو ہمارے ساتھ اگر راستہ بھی چلنے لگے
اک ایسی بستی میں اُترا ہے قافلہ دل کا تھکن اُتارنا چاہوں زمین جلنے لگے
نواحِ دل پہ کس آسیب نے کیا سایہ کہ ہم فقیر بھی دنیا کے ساتھ چلنے لگے
ابھی تو چاند نے چاہی تھی دو گھڑی رخصت ابھی سے رات کی وحشت کے پر نکلنے لگے

وہ قرب ہے کہ فقط خود کو ڈھونڈ نے لگ جاؤں
وہ لمس ہے کہ بدن برف سا پگھلنے لگے

♦

دشت کو ڈھونڈنے نکلوں تو جزیرہ نکلے
پاؤں رکھوں ہوں جو ویرانے میں دنیا نکلے

آنکھ جھکتی ہے تو ملتی ہے خموشی کو زباں بند ہونٹوں سے کوئی بولتا دریا نکلے
عشق اک ایسی حویلی ہے کہ جس سے باہر کوئی دروازہ کھلے اور نہ دریچہ نکلے
ایک بپھرا ہوا دریا ہے مرے چار طرف تو جو چاہے اسی طوفاں سے کنارہ نکلے
ایک موسم ہے دل وجاں پہ فقط دن ہو کہ رات آسماں کوئی ہو دل پر وہی تارا نکلے
اس سے پہلے یہ کبھی دل نے کہا ہی کب تھا رات کچھ اور بڑھے چاند دوبارہ نکلے

سحر نے تیرے عجب راہ سجھائی ہم دم
ہم کہاں جانے کو نکلے تھے کہاں آ نکلے

♦

جس طرف پاؤں دھروں تیری گلی آتی ہے
تیرے دریا پہ مری تشنہ لبی آتی ہے

کس طرف جائے گی پانی ہی بتا سکتا ہے
یہ کہ کسی سمت سے یہ خشک ندی آتی ہے

چاک پر تیرے پڑی ہے مری مٹی یوں ہی
یہ خبر تھی کہ تجھے کوزہ گری آتی ہے

رات ڈھل جاتی ہے لیکن کسی ویرانے میں
ساتھ سورج کے وہی تیرہ شبی آتی ہے

سبز موسم سرِ ویرانہ کہاں آتے ہیں
لُو کے جھکّڑ لیے آشفتہ سری آتی ہے

ابر برسے تو میں بھیگوں تری بوندوں میں کبھی
ابر کے پاؤں میں کیوں در بدری آتی ہے

اب تصور ہی ہواؤں کا پتہ دے شاید
حبس وہ ہے کہ نزع ساتھ چلی آتی ہے

جب سلگ اُٹھنے کو ہوتا ہے حمیت کا الاؤ
برف کی باڑھ ہواؤں میں گھلی آتی ہے

کارِ دنیا میں جو گزرے ہیں شب و روز انھیں
سوچتا ہوں تو بہت دیر ہنسی آتی ہے

ایران میں چار سال

اختر حسین رائے پوری*

[۱۰]

مسلمانانِ ہند کو ان کا مذہب عربوں نے، حکومت ترکوں نے اور تہذیب ایرانیوں نے عطا کی۔ ہمارے بچپن تک ہندوستانی مسلمانوں کے پرانے خاندانوں میں ایران کا ذکر اس طرح ہوتا تھا گویا ہمارا، اصل وطن وہی ہے۔ جسم ہند میں پلتا تھا تو ذہن کی پرورش ایران میں ہوتی تھی اور روح عرب میں بھٹکتی تھی۔ رستم و سہراب کا قصہ ہماری نوکِ زباں پر تھا اور ابتدائی درس میں شیخ سعدی کی گلستان و بوستان، کو ضرور شامل کیا جاتا تھا۔

جب ۱۹۵۹ء میں مجھے پہلی بار یونسکو کے کام سے تہران جانا پڑا تو یہ گمان بھی نہ تھا کہ ہر سال وہاں جانے کا موقع ملے گا حتیٰ کہ ۱۹۶۷ء سے ۱۹۷۰ء تک مسلسل وہیں قیام بھی رہے گا۔ اپنے پہلے دورے کی یاد مجھے آج بھی نہیں بھولی۔ چند سال قبل ڈاکٹر مصدق نے تیل کو قومی ملکیت میں لے کر خوش حالی اور ترقی کے جس دور کا ڈول ڈالا تھا ابھی اس کی ابتدا ہوئی تھی۔ اب تو شمال میں شمران کی

---

* معروف اسکالر، صحافی اور لغت نویس

پہاڑیوں سے لے کر جنوب میں **شاہ عبدالعظیم** کے مقبرے تک آبادی ہی آبادی ہے، لیکن اس وقت شہر کے تین حصے الگ الگ سے لگتے تھے اور ان کے بیچ میں خاصا فاصلہ تھا۔ **جنوب** میں اس قدیم شہر 'رے' کے آثار تھے جسے **چنگیز خان** نے تباہ کر دیا تھا اور اب غریب طبقے کا مسکن تھا۔ وسط میں **تہران** تھا جسے دو سو سال پہلے **قاچار** بادشاہ نے اصفہان سے منتقل ہو کر اپنا دارالخلافہ بنایا تھا۔ **شمران** میں امیروں اور رئیسوں کی کوٹھیاں تھیں جہاں خاص طور پر موسمِ گرما میں رونق رہتی تھی۔ ان تینوں آبادیوں کے بیچ میں دور دور تک خالی میدان پڑے ہوئے تھے جو دیکھتے ہی دیکھتے آباد ہو گئے۔

یہ تھا ایران کا نقشہ ۱۹۵۹ء میں **اصفہان** اور **شیراز** کی ویرانی نہ پوچھیے۔ بچپن سے سنتے آئے تھے کہ **اصفہان** 'نصف جہان' ہے۔ فرطِ شوق وہاں لے گیا تو یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ پرانی وضع کا چھوٹا سا شہر ہے جہاں ہر طرف خاک اُڑ رہی ہے۔ یہی حال چالیس سال پہلے **آگرہ** کا تھا۔ البتہ **آگرہ** کی طرح **اصفہان** کی تاریخی عمارتیں بھی لاجواب ہیں۔ **شیراز** میں تو اس وقت ایک ایر پورٹ بھی نہ تھا۔ ہوائی جہاز نے ہمیں شہر کے پاس ایک میدان میں اُتار دیا اور سوٹ کیس ہاتھ میں لیے سڑک کے کنارے ٹیکسی کا انتظار کرنا پڑا لیکن چند سال کی قلیل مدت میں صرف اُنہی شہروں نے نہیں بلکہ سارے ملک میں ایسی تیز رفتار ترقی ہوئی جس کا اقرار کرنا چاہیے۔

اُسی وقت **پیرس** سے میرا تبادلہ **کراچی** **یونسکو** کے اس علاقائی دفتر کے ناظم کی حیثیت سے ہوا جس کا دائرہ کار **جنوبی ایشا** کے ممالک سے تھا۔ اس میں توسیع کی تجویز ہوئی تو سب سے پہلے **ایران** اور بعد ازاں **افغانستان**، **نیپال**، **تھائی لینڈ**، **ملایا** وغیرہ کو شامل کیا گیا۔ مجھے ان سارے ملکوں میں جانے کا بارہا اتفاق ہوا، لیکن **ایران** سے پرانا ذہنی تعلق تھا وہاں جلد ہی کئی لوگوں سے ایسی دوستی ہوئی جو مرورِ ایام کے باوجود اب تک باقی ہے۔ یہی وہ کشش تھی جو مجھے ۱۹۶۷ء میں **صومالیہ** سے وہاں کھینچ لائی۔ یہاں مجھے ایک دن کے لیے بھی اجنبیت محسوس نہ ہوئی۔ **فارسی شاعری** و تاریخ کے مطالعے کے ساتھ ملک کے گوشے گوشے کی سیر نے ایک خاص لطف بخشا۔

اُس وقت کون قیاس کر سکتا تھا کہ **پہلوی بادشاہت** کا شیرازہ اتنی جلدی بکھر جائے گا۔ یوں تو ہر آمریت فوج اور پولیس کے بل پر مسلط رہتی ہے، لیکن اگر ملک میں دولت آفرینی کے وسائل ہوں تو ظاہری خوش حالی کا غازہ معاشی خرابیوں کو عارضی طور پر ڈھک لیتا ہے۔ چنانچہ اُس وقت

کسی کو اندازہ نہ تھا کہ زیرِ زمین لاوا، اُبل رہا ہے جو انقلاب کے کوہِ آتش فشا کی شکل اختیار کرلے گا۔ البتہ شاہ نعمت اللہ ولی کی کلیات کے سب سے پرانے نسخے میں جو ان کی رحلت کے فوراً بعد مرتب ہوا تھا یہ پیش گوئی دیکھنے میں آئی کہ چودھویں صدی ہجری کے اختتام کے ساتھ ایران کی آخری بادشاہت ختم ہوجائے گی جو صرف دو حکمرانوں پر مشتمل ہوگی۔ یہ بات اس مشہور نظم میں کہی گئی ہے جو گزشتہ پانچ سو سال کے اہم واقعات کی پیش گوئی سے متعلق ہے اور گو وقت کے ساتھ اس میں ردوبدل ہوتا رہا ہے لیکن اس کا سب سے مستند نسخہ وہی ہے جس کا ذکر اوپر آیا جو آج سے بارہ سال پہلے تک مشہد میں روضۂ امام رضا کے قدیم کتب خانے میں موجود تھا۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ پہلوی دورِ حکومت میں پرانے شاعروں کی عظمت کو باقی رکھنے کا ایسا اہتمام کیا گیا گویا ملک کے تہذیبی ورثے کے اصل نشاں بردار وہی تھے۔ ہر چھوٹے بڑے شہر میں فردوسی، سعدی، حافظ وغیرہ کے نام کے خیابان ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ہر مشہور شاعر کی خستہ وخراب قبر پر جیسے شاندار مقبرے تعمیر ہوئے ان کی مثال دنیا میں نہیں ملتی۔ اس کا خیال رضا شاہ (اول) کو آج سے پچاس سال پہلے آیا جب فردوسی کی ہزار سالہ تقریب منائی گئی۔ تیمور لنگ نے، جو فردوسی کا مداح تھا، چھے سو سال قبل اس کی شکستہ قبر کو اپنی نگرانی میں درست کیا، لیکن پھر کسی نے اس کی خبر نہ لی۔ رضا شاہ نے فردوسی کا جو عالی شان مقبرہ طوس میں بنایا اس احاطے میں فردوسی کے پُرانے گھر کی دیوار کو بھی باقی رکھا گیا ہے۔

تیمور لنگ کی طرح رضا شاہ کو بھی فردوسی کے علاوہ اور کسی شاعر سے دل چسپی نہ تھی۔ ایک بار وہ دورے پر شیراز گیا تو اس طرف سے گزرا جہاں حافظ کی پرانی قبر تھی۔ اس کی نظر 'دیوانِ حافظ' کے ایک نسخے پر پڑی جو قبر کے دروازے پر زنجیر سے آویزاں تھا۔ شاہ کے ہم راہ وزیرِ تعلیم آقائے علی اصغر حکمت تھے اور یہ واقعہ میں نے ان ہی سے سنا تھا۔ رضا شاہ کو یقین ہی نہ آیا کہ 'دیوانِ حافظ' سے فال نکالی جاسکتی ہے لیکن امتحاناً آنکھیں بند کرکے اس نے اس مسودے کا کوئی ورق اُلٹا تو انگلی اس شعر پر پڑی:

بلبل ز شاخ سرد بہ گل بانگ پہلوی
می خواند روشن درس مقامات معنوی

اس شعر میں **پہلوی** کا ذکر پڑھ کر **رضا شاہ** اتنا متاثر ہوا کہ اسی وقت **مزارِ حافظ** کو درست کرنے کا حکم دے دیا۔ چنانچہ اب یہ مزار ایک خوش نما باغ کی زینت ہے اور اس سے کچھ دور آگے **شیخ سعدی** کے مقبرے کی بھی ایسی جلا ہوئی کہ اس کے احاطے میں وہ **نہر رکنا باد** گزرتی ہے جس کا ذکر کلامِ **حافظ** میں ملے گا۔ اس کے بعد **عمر خیام** اور دیگر شعرا کی قسمت بھی جاگی اور ان مقبروں کی از سرِ نو تعمیر ہوئی۔ اس سلسلے میں مجھ سے بھی ایک کارِ ثواب انجام پایا ۱۹۵۹ء میں پہلی بار ایران کا سفر درپیش ہوا تو میرے **بھائی شمیم** (مرحوم) نے ارشاد فرمایا: "اصفہان جاؤ تو صائب کی قبر پر حاضری دینا اور میری طرف سے فاتحہ پڑھنا۔" وہ **صائب** کے بڑے مداح تھے۔ میں جب وہاں کی خاص خاص عمارتوں کی سیر کر چکا تو اپنے رہنما **آقائے کربلائی** سے **مزارِ صائب** چلنے کی فرمایش کی۔ اس نے تعجب سے کہا: "صائب یہاں دفن نہیں ھیں" میرے اصرار پر وہ اُس گم شدہ قبر کی تلاش میں نکلا اور دوسرے دن بتلایا کہ شہر کے باہر پھلوں کے ایک دور افتادہ باغ میں **صائب** کی قبر ہنوز محفوظ ہے، گو اُس کا نام بہت کم نے سنا ہے۔ **کربلائی** کے ساتھ میں بہ مشکل تمام اس جگہ پہنچا اور اس عظیم شاعر کو نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔ تہران لوٹ کر یہ واقعہ وزیرِ تعلیم **ڈاکٹر مہران** کو سنایا تو انھیں تعجب بھی ہوا، اور افسوس بھی، پھر مجھے مشورہ دیا کہ یونسکو کی طرف سے خط لکھو تو **صائب** کے شایانِ شان مقبرہ بن جائے گا۔ میں نے فوراً ہی ایک مناسب خط اُن کی خدمت میں بھیج دیا۔ چند سال بعد جب اصفہان جانے کا اتفاق ہوا تو دیکھ کر خوشی ہوئی کہ حکومت نے اس باغ کا نصف حصہ حاصل کر کے **مزارِ صائب** پر ایک خوبصورت عمارت تعمیر کر دی ہے اور اسی کے ساتھ ایک کتب خانہ بھی قایم ہو گیا ہے۔ اسی زمانے میں سنا کہ وسط شہر میں تہران کے کسی پرانے مکان کے احاطے میں مشہور شاعرہ **قرۃ العین طاہرہ** کی قبر کا نشان ملا ہے۔ جب **ناصر الدین شاہ قاچار** کے دربار میں اسے بھائی مذہب کی تبلیغ کے الزام میں پیش کیا گیا تو بادشاہ نے اُسے یہ کہہ کر رہا کر دیا: "در گزریم که رخِ زیبا داری" لیکن بادشاہ کی والدہ نے اسے قتل کرا کے کسی گوشے میں دفن کر دیا۔ اب **قرۃ العین طاہرہ** کی ہڈیاں وہاں سے منتقل کر کے شہر کے شمالی محلے یوسف آباد میں پیوندِ خاک کر دی گئی ہیں۔ **بھائی شاعروں** کے مطبوعہ تذکرے میں یہ پڑھ کر مجھے مایوسی ہوئی کہ جن **فارسی غزلوں** نے **قرۃ العین طاہرہ** کو شہرت بخشی وہ دراصل اس کی تخلیق نہیں ہیں۔

پہلوی خاندان کو دینِ اسلام تو کجا ملک کی تہذیبی میراث کا بھی احساس نہ تھا، یہی وہ بنیادی کمزوری تھی جس نے اسے مغرب کی کورانہ تقلید پر اس حد تک مائل کیا کہ ملک کے عوام اور دانش ور سب ہی اس سے متنفر ہو گئے۔ شاہ کی چھوٹی بہن **فاطمہ** نے ایک امریکن سے بیاہ رچایا۔ اس کی بڑی بہن **شمس** نے ایک آرمینین ڈاکٹر '**بہل بوذ**' سے شادی کر لی۔ یہ سالہا سال وزیرِ فرہنگ (ثقافت) کے عہدے پر مامور رہے۔

وزیرِ اعظم **عباس ہویدا** کی طرح **شاہ** کی جڑواں بہن **شہزادی اشرف** کے متعلق عام طور پر مشہور تھا کہ وہ **بہائی** ہے۔

بادشاہوں کے تذکروں میں ہم نے مرشد زادوں کا ذکر سنا ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کا دور کا تعلق بادشاہ سے ہوتا تھا۔ میں ایک بار دوستوں کے ساتھ اصفہان میں 'دریائے زندہ رود' کے پل '**خاجو**' پر ٹہلتا جا رہا تھا کہ کسی نے ایک **کباب فروش** کی طرف اشارہ کیا۔ وجاہت اس کے چہرے پر عیاں تھی چلتے چلتے میرے دوست نے یہ دل چسپ واقعہ سنایا کہ **پہلوی خاندان** کے بانی **رضا خان** جب جنرل کے عہدے پر قزدین میں مامور تھے تو انھوں نے کسی عورت سے متعہ کر لیا۔ اس رشتے نے ایک لڑکے کو جنم دیا۔ جب متعہ کی میعاد ختم ہوئی تو مہر کی رقم ادا کر کے اس سے بے تعلق ہو گئے۔ پھر وہ تہران منتقل ہو گئے جہاں انھوں نے تخت پر قبضہ کر کے ایک نئی بادشاہت کی بنیاد ڈالی۔ ماں کے انتقال کے بعد وہ لڑکا بے سہارا ہو گیا۔ نہ تعلیم ہوئی نہ تربیت، ناچار یہاں **کباب فروش** بن کر بیٹھ گیا۔ **رضا شاہ کبیر** کے انتقال کے بعد ان کے جانشین نے اس کی مدد کی کوشش کی تو اس نے اسے لینے سے انکار کر دیا۔

غیر مسلم اقلیتوں اور غیر ملکیوں کو **شاہ** نے ایسا سر چڑھایا کہ اہلِ ملک اپنے کو بے خانماں سمجھنے لگے۔ خفیہ پولیس کے جبر و تشدد نے **پہلوی دور** کے کیے دھرے پر پانی پھیر دیا۔ شاہی خاندان کے افراد کی فرعونیت عوام تو کیا خواص کو بھی نہ بخشتی تھی۔ کئی واقعات کا تو میں خود شاہد ہوں اور "مشتے نمونے از خروارے" کے بطور یہ واقعہ بیان کرتا ہوں۔ ایک وزیر **ڈاکٹر ہدایتی** اور اُن کی **بیگم** نے **شاہ** کی بڑی بیٹی **شہزادی شہناز** کے اعزاز میں عشائیہ دیا اور اس میں کئی سفیروں اور منصب داروں کے ساتھ مجھے اور میری بیوی کو بھی مدعو کیا۔ دعوت نامے کے مطابق ہم ساڑھے آٹھ بجے شب 'وانگ ہوٹل' پہنچ

گئے جس کی نچلی منزل ضیافت کے لیے مخصوص کرلی گئی، کیونکہ آدابِ شاہی کا تقاضا تھا کہ **شہزادی** کسی کو بیٹھا ہوانہ پائے۔ دیوان خانے سے تمام کرسیاں ہٹادی گئیں اور سامنے کے دروازے پر میزبان استقبال کے لیے کھڑے تھے اور پیچھے کے دروازے میں خفیہ پولیس نے قفل جڑ رکھے تھے۔اب سب مہمان خالی دیوان خانے میں کھڑے ہوئے **شہزادی** کا انتظار کرنے لگے حتیٰ کہ پاؤں شل ہوگئے، پسینے چھٹنے لگے اور وہ نیک بخت آدھی رات سے پہلے نہ آئی اور جب آئی تو نہ وزیر **ہدایتی** سے معذرت کی، نہ تھکے ماندے مہمانوں کے سلام کا جواب دیا بلکہ دڑاتی ہوئی **طعام خانے** میں گھس گئی۔یہ ضیافت میزبان ومہمان سب کے لیے کیسی بدمزہ رہی اس کا اندازہ بھی اس بے حس خاتون کو نہ ہوا۔دراصل نو دولتیوں سے تمیز وشائستگی کی توقع عبث ہے بقول **صائب**:

اُمیدِ مہر زنو دولتاں مکن صائب
کہ نونہال کجا طاقتِ ثمر دارد

انقلابِ زمانہ کے باوجود انصاف کا تقاضا ہے کہ اس ضمن میں اپنے ذاتی مشاہدے کے اظہار سے تکلف نہ برتوں۔**شاہ** کی دل چسپی کے باعث **یونسکو** نے ایران میں تعلیم بالغان، سپاہِ دانش، آثارِ قدیمہ کے تحفظ پر خاصی توجہ دے رکھی تھی اور اس سلسلے میں چند بار **شاہ** نے بنفسِ نفیس مجھے باریابی بخشی اور کئی مرتبہ **شاہ بانو فرح** اور **شاہزادی اشرف** سے بھی ملنا ہوا۔

۱۹۴۹ء میں جب **شاہ** پہلی مرتبہ ہمارے ملک کے سرکاری دورے پر آئے تو ان سے اپنی ملاقات کا ذکر یہاں کرتا چلوں۔گورنرِ سندھ **دین محمد** کو ایک شب **شاہ** کی دعوت کا انتظام کرنا تھا۔انھیں خیال آیا کہ دعوت محض رسمی نہ ہو بلکہ اسے **شاہ** کے شایانِ شان ایک ثقافتی تقریب کا رنگ دیا جائے۔چنانچہ انھوں نے مجھ سے فرمائش کی کہ **فارسی** آمیز **اردو** میں ایک سپاس نامہ تیار کروں اور کسی خوش نویس سے لکھوادوں اور دعوت کے بعد ثقافتی پروگرام مرتب کروں۔میں نے یہ خدمت بحسن وخوبی انجام دی۔جب گورنر نے سپاس نامہ پڑھ کر **شاہ** کو پیش کیا تو وہ دیر تک تعجب سے اسے دیکھتے رہے۔ جب میرا، ان سے تعارف کرایا گیا تو کہنے لگے، مجھے معلوم نہ تھا کہ **اردو فارسی** سے اس قدر مشابہ ہے۔پھر پوچھا: "کیا تمھیں ایران جانے کا اتفاق ہوا" میں نے نفی میں جواب دیا تو شاہ نے کہا: "اس کا موقع تمھیں ضرور ملے گا۔" مدتوں بعد جب تہران میں شاہ کی خدمت میں باریابی

ہوئی تو یاد دلاتے ہی شاہ کو وہ پرانا واقعہ یاد آ گیا۔ کچھ دیر وہ اس دعوتِ شب کے بعد کی محفل کا ذکر کرتے رہے، جس میں عمر خیام کی رباعیوں کو رقص و موسیقی کے روپ میں پیش کیا گیا تھا۔

ایران اور جاپان یہی دو ملک ہیں جہاں تہذیب صحیح معنوں میں عوام کی سطح تک جا گزیں ہو چکی ہے۔ رفتار و گفتار نیز نشست و برخاست کا ایک ہی معیار عالموں، جاہلوں، غریبوں اور امیروں میں ملے گا۔

ایران کی دوسری بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے عرض و طول میں شاید ہی کوئی ایسا مقام ملے جو کسی نہ کسی اعتبار سے دل چسپی کا حامل نہ ہو۔ بے برگ و گیاہ پہاڑوں میں گزرتے گزرتے جب آنکھیں تھکنے لگتی ہیں تو یک بہ یک کوئی چشمہ یا مرغزار سامنے آ جاتا ہے اور یا ویران ریگستان میں کسی پرانے قلعے یا ٹوٹے ہوئے محل کے آثار کسی بھولی ہوئی داستان کو دہرانے لگتے ہیں۔ اگر ایک طرف بحرِ کاسپین کا دور تک پھیلا ہوا ساحل پہاڑوں اور جنگلوں کو آغوش میں سمیٹے ایک عظیم المثال نظارہ پیش کرتا ہے تو دوسری طرف اصفہان و مشہد میں اسلامی عمارتوں کے بہترین نمونے نظر آتے ہیں۔

ایران کا چپہ چپہ میرا دیکھا ہوا ہے۔ ملک کا سب سے خوبصورت حصہ تو وہ ہے جو بحرِ کاسپین کے کنارے کوہ البرز کی پشت پر سیکڑوں میل دور تک پھیلا ہوا ہے۔ شیراز اور مشہد خاصے تاریخی شہر ہیں جن کی کشش سے سبھی سیاح اور زائرین واقف ہیں، البتہ چند ایسے دور افتادہ مقام ہیں جو ہنوز اپنی روایتی دل نوازی کو محفوظ رکھے ہوئے ہیں۔ ان میں ہمدان، خرم آباد اور کرمان کا نام خاص طور پر یاد آتا ہے۔ کرمان کی نسبت سے ہماری سرزمین اس شہر سے نا آشنا نہیں۔ اہلِ کرمان یہاں کیسے وارد ہوئے۔ یہ واقعہ قابلِ عبرت ہے۔ تقریباً دو سو سال قبل جب خاندانِ قاچار کے بانی آغا محمد نے حاکمِ اصفہان لطف اللہ خاں کو بے دخل کر کے تخت و تاج پر قبضہ کیا اور اس کے تعاقب میں فوج لے کر چل پڑا تو لطف اللہ کو کرمان کے سوا کہیں پناہ نہ ملی۔ آغا محمد اپنی سفّا کی اور بے رحمی کے لیے بدنام تھا۔ اس نے اہلِ کرمان کو خبردار کیا کہ وہ اگر لطف اللہ خاں کو اُس کے حوالے نہ کریں گے تو ان کی جان بخشی نہ ہوگی۔ اہالیانِ شہر نے اطاعت سے انکار کر دیا تو قاچار فوج شہر میں گھس آئی۔ آغا محمد نے حکم دیا کہ شہر کے بالغ مردوں کو اندھا کر دیا جائے۔ اس حکم پر ایسی بے دردی سے عمل ہوا کہ کرمان مدتوں 'شہرِ کور' کہلاتا رہا۔ چند سو افراد جان بچا کر ھندوستان کی طرف بھاگ آئے۔ اُن میں سے

ایک کا نام لیوا، اپنے اجداد کا انتقام تا ایں دم لے رہا ہے۔

کرمان کے نام سے مجھے یہ بھی یاد آیا کہ اتفاق سے وہاں ایک ایسے **اسمٰعیلی خانوادے** سے ملاقات ہوئی جو اپنے کو مرحوم **آغا خان محمد شاہ** کا رشتے دار بتلاتا تھا۔ ان کے دادا **فتح علی قاچار** کے بہنوئی صوبہ کرمان کے گورنر تھے۔ کسی بات پر **بادشاہ** سے لڑکر کراچی اس وقت بھاگ آئے جب **انگریز** نے سندھ کو فتح کیا تھا۔ **پہلوی خاندان** سے جب مرحوم **آغا خان** کے تعلقات استوار ہوئے تو انھیں اپنے اجداد کی جائیداد کرمان میں واپس کردی گئی، لیکن اپنے مقامی رشتے داروں کے حق میں وہ اس سے دست بردار ہوگئے۔ اس کے حصے بخرے کے لیے مقدمے بازی شروع ہوئی وہ اس وقت بھی جاری تھی جب میں کرمان میں تھا۔

مرحوم **آغا خان** نہایت بالغ نظر مدبر تھے انھیں خیال آیا کہ اپنے فرقے کو از سرِ نو ملتِ اسلامیہ سے وابستہ کریں اور اس کے متعلق جو بدگمانیاں ہیں انھیں **قدیم اسمٰعیلی مسودے** کی اشاعت کے وسیلے سے دور کریں۔ اس کام کے لیے ان کی نظرِ التفات تاریخ اسلام کے ایک **روسی نژاد** ماہر **ایوانوف** (Avanov) پر پڑی جو انگستان میں قیام پذیر تھا۔ **آغا خاں** کی دعوت پر اس نے بمبئی میں ایک ادارہ قایم کیا۔ ۱۹۳۰ء کے بعد اُس نے **اسمٰعیلی فلسفے** کی تاریخ پر بڑا کام کیا جس کی شہرت مغربی ممالک میں ہوئی۔ **آغا خان** کے انتقال کے بعد یہ کام بند ہوگیا۔ **ایوانوف** اپنے کتب خانے کے ساتھ تہران آ گیا۔ ظاہر ہے کہ ایران یا اور کسی اسلامی ملک میں اس تحقیق سے کسی کو دل چسپی نہ تھی۔ وہ تہران یونیورسٹی کے ایک گوشے میں گمنامی کی زندگی بسر کررہا تھا، جب مجھے اس کی موجودگی کا علم ہوا کبھی کبھی میں اس کے پاس بیٹھ کر اس سے **اسمٰعیلی تاریخ** کی دل چسپ حکایتیں سنا کرتا تھا اور اس اندیشے سے باخبر تھا کہ آگے چل کر اس بیش قیمت ذخیرۂ علم کا خدا جانے کیا حشر ہوگا۔ دنیا میں **ایوانوف** کا نہ کوئی رشتے دار تھا نہ کوئی دوست، چنانچہ جب اس کا انتقال ہوا تو کتب خانہ مہر بند کردیا گیا۔ خدا جانے اب کس حال میں ہو۔ **اسمٰعیلی تحریک** اسلامی تاریخ کا ایک اہم باب ہے اور جو لوگ تحقیق میں تعصب سے کام نہیں لیتے ان کا فرض ہے کہ اس سرمائے کو دوبارہ گم نہ ہونے دیں اور اس سے استفادہ کریں۔

ایران میں ذوقِ سخن شہروں میں ہی نہیں بلکہ دیہاتوں میں بھی ہے تاہم یہ حقیقت ہے کہ اس

صدی میں فارسی شاعری کا مزاج یکسر بدل گیا اور وہ کلاسیکی روایت سے ہٹ کر پہلے انقلابی نظم گوئی اور اب آزاد نظم کی طرف مائل ہوگئی ہے۔ کہنے کو نظم گو بہتیرے ہیں لیکن اُن میں سے کوئی بڑائی کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

خوش وقتی اور آسودگی کے باوجود کبھی کبھی مجھے روحانی اور ذہنی خلا کا احساس شدت سے ہوتا تھا۔ کوئی ایرانیوں سے مجھے قربت حاصل تھی لیکن بھول کر بھی دورانِ گفتگو ملک کی سیاست کا ذکر نہ آتا تھا۔ اس کا اشارہ ملتے ہی وہ معنی خیز انداز سے کہہ دیتے تھے: "دیوار هم گوش دارد" میں نے کئی بار کوشش کی کہ شہر کے جنوبی علاقے میں جہاں مزدوروں اور مسکینوں کی بستی تھی جاؤں مگر سب نے منع کیا کہ کسی غیر ملکی کے لیے یہ قرینِ مصلحت نہیں۔ سواک (خفیہ پولیس) کے ایجنٹ ہر طرف سرگرمِ عمل تھے اور مجھے معلوم تھا کہ ان میں سے ایک میرے دفتر کے ایرانی عملے میں بھی شامل تھا۔ اُس وقت تک مجھے کسی خفیہ انقلابی تحریک کا سراغ نہ ملا تھا۔ ڈاکٹر مصدق کا احترام دل میں باقی تھا اور جی چاہتا تھا کہ ان کے رفیقوں اور پرستاروں سے ملوں۔ سب کو معلوم ہے کہ اُنھی کے دورِ وزارت میں ایران میں تیل پر غیر ملکی اجارہ داری ختم ہوئی تھی۔ اس کی پاداش میں امریکن سی آئی اے نے شاہ سے مل کر اُن کا تختہ اُلٹ دیا اور بڑی خوں ریزی کے بعد گھر پر انھیں عمر بھر کے لیے نظر بند کرادیا گیا۔

۱۹۶۷ء کے آغاز میں وہ مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو علاج کے لیے اپنے فرزند غلام مصدق کے گھر پہنچا دیے گئے۔ ہر روز دفتر آتے جاتے، میں حسرت سے اس مکان کو دیکھتا تھا جس کے اردگرد پولیس کا سخت پہرا تھا۔ انتقال کے بعد اُن کی لاش اُن کے گاؤں میں چپکے سے دفن کر دی گئی۔ دل میں سب اُن کی عزت کرتے تھے مگر ڈر کے مارے کوئی نام نہ لیتا تھا۔ جیسے جیسے میرے تعلقات کا دائرہ وسیع ہوتا گیا مجھے ایسے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا جو ان کے معاون اور مددگار رہ چکے تھے۔ ان کے وزیرِ خارجہ اور دستِ راست ڈاکٹر حسن فاطمی کے چھوٹے بھائی سعید فاطمی میرے عزیز دوست تھے۔ موجودہ حالات کے مدِنظر نہ میں اس خفیہ انقلابی تنظیم کا نام لکھوں گا اور نہ اس دوست کا جس نے مجھے اس کی خبر دی۔ انھیں میں آقائے تکریمی کے فرضی نام سے یاد کروں گا۔ مدتوں قبل دلّی میں جب کچھ عرصہ آل انڈیا ریڈیو سے میرا تعلق رہا تو ماتحت ہونے کے باوجود یہ میرے ہم نشیں اور ہم خیال ہوگئے۔ عرصۂ دراز تک ہم ایک دوسرے سے بےخبر رہے تاوقتیکہ تہران میں راہ چلتے یکایک ان سے

آمنا سامنا ہوگیا۔ کسی دیرینہ ہمدم سے اچانک ملاقات سے جو مسرت ہوتی ہے اس کا اندازہ اہلِ دل لگا سکتے ہیں۔ **آقائے تکریمی مشاق** انجینئر تھے اور مختلف ملکوں میں کام کرنے کے بعد کسی یورپین عورت سے شادی کرکے اب تہران میں رہنے لگے تھے۔ وہ تنہا **ایرانی** تھے جن سے ملک کی اندرونی سیاست پر بے تکلفی سے گفتگو ہوسکتی تھی۔ اتنے میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ وہ ایک رات ایسے وقت میرے گھر آئے جب ملازم جا چکا تھا اور میں تنہا مطالعے میں مصروف تھا۔ **تکریمی** کچھ مضطرب تھے اور رازدارانہ لہجے میں کہا: "تمھاری مدد کی ضرورت ھے۔" تفصیل دریافت کی تو کہا کہ ایک مفرور انقلابی کو دو تین دن کے لیے پناہ کی ضرورت ہے اور تمہارے گھر سے زیادہ محفوظ جگہ اسے نہیں مل سکتی۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ میں یہ خطرہ کیسے مول لوں مگر ایسے موقعے زندگی میں پہلے بھی آ چکے تھے۔ **برطانوی دورِ حکومت** میں تین چار بار ایسے ہی لوگوں کو مجھے اپنے گھر میں چھپانا پڑا۔ گو کہ ان سے میرا براہِ راست تعلق نہیں تھا۔ میں ان معاملوں میں فقط اسی اصول پر کاربند رہا ہوں کہ جو لوگ کسی بڑے مقصد کی خاطر اپنی جان ہتھیلی پر لیے پھرتے ہیں وہ ہمدردی کے مستحق ہیں۔

کسی خفیہ تنظیم سے واسطہ پڑے تو دستور یہ ہے کہ اپنی طرف سے کرید نہ کی جائے اور اُتنی ہی بات پوچھیں جتنی کی سنائی دے۔ چنانچہ میں نے **آقائے تکریمی** سے صرف یہ پوچھا کہ وہ شخص کہاں ہے؟ جواب ملا کہ نیچے کار میں بیٹھا ہے۔ میرے اجازت دینے پر اُسے اوپر لا کر خالی کمرے میں لٹا دیا گیا۔ حسنِ اتفاق کہ وہ صورت شکل سے بالکل یورپین لگتا تھا اور فرانسیسی زبان سے پوری طرح واقف تھا۔ میں نے اسے ہدایت کی ہرگز مجھ یا ملازم سے فارسی میں بات نہ کرے اور پلنگ پر بیمار بن کر لیٹا رہے۔ اس کے سرہانے دواؤں کی چند بوتلیں اور فرانسیسی کی دو تین کتابیں رکھ دیں۔ **تکریمی** تو یہ کہہ کر چلے گئے کہ دو تین دن میں اسے ملک سے باہر بھیجنے کا انتظام ہوتے ہی لے جائیں گے اور کھڑکی سے بار بار جھانک کر دیکھتا رہا کہ کوئی مخبر تو سڑک پر نظر نہیں آ رہا ہے۔ بارے انتظار اور وسوسے کے وہ تین دن خیرت سے گزر گئے اور **آقائے تکریمی** اسے لے کر کہیں چلے گئے۔ اس کے بعد مجھے تھوڑا سا اندازہ اس تنظیم کا ہوا جو جان پر کھیل کر بادشاہت کی بیخ کنی میں سرگرم تھی۔

۱۹۷۰ء کے اواخر میں میرا تبادلہ **پیرس** ہوگیا۔ **ایران** کے دورانِ قیام میں ہر طرح کا آرام ملا البتہ وہاں سے چلتے چلتے ناگاہ مجھ پر دُہری بپتا ٹوٹی۔ طویل علالت کے بعد میرے بھائی نے

کراچی میں اس دارِفانی کو خیر باد کہا۔ اُن کی جدائی کا غم میں آج تک محسوس کر رہا ہوں۔ انتقال سے قبل انھوں نے برِصغیر کے فارسی گو شعرا کے کلام کا انتخاب 'شعر فارسی در هندوپاکستان' کے نام سے کیا تھا جو تہران کے چاپ خانۂ اقبال سے شائع ہو کر اہلِ نظر میں مقبول ہوا۔ اُسی وقت میری داہنی آنکھ کی بصارت اس طرح متاثر ہوئی کہ مقامی معالجوں کی ساری کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔ اس محبوب ملک کو الوداع کہنے کے بعد امید وبیم کی حالت میں ایک بار پھر اس شہر کی طرف چل پڑا جس سے میری زندگی کی بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔

فلسطین میں چند ہفتے

جولائی ۱۹۷۱ء میں مجھے یونسکو کی اس جماعت کے ساتھ پیرس سے مقبوضہ فلسطین جانے کا اتفاق ہوا جو اقوامِ متحدہ کے ادارہ برائے فلاح مہاجرین UNRAWA (United Nations Refugees and Works Agency) کے اشتراک سے عرب مدارس کی کارکردگی کا جائزہ لیتی ہے۔ آخری درجۂ تدریس (بارہویں کلاس) کے سالانہ امتحان کی نگرانی کرتی ہے اور ان کی درسی کتابوں کی فراہمی پر نظر رکھتی ہے جو مصر میں تیار ہوتی ہیں۔ یہ انتظام حکومتِ **اسرائیل** کے تعاون سے کیا جاتا ہے جس کا اصل مقصد یہ ہے کہ تعلیم یافتہ نوجوان اعلیٰ تعلیم یا روزگار کی تلاش میں ملک سے باہر چلے جائیں مبادا یہاں رہ کر مجاہدوں کی صف میں شامل نہ ہو جائیں۔

جون ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد اس علاقے میں قدم رکھنے والا میں پہلا پاکستانی تھا ماسوا، ایک اور صاحب کے جو بیروت میں عالمی ادارۂ صحت سے وابستہ تھے۔ اقوامِ متحدہ سے مجھے ایک خاص پروانۂ راہ داری ملا تھا۔ جس پر حکومتِ **اسرائیل** کا ویزا حاصل کیا گیا تھا۔

میرے دورہ کی مدت دو ہفتہ تھی، جس میں سے دس دن غزہ اور اس کی اطراف میں گزرے۔ باقی تین دن یروشلم اور دریائے اردن کے مغربی علاقے میں، آخری دن واپسی کے طیارہ کے انتظار میں تل ابیب میں بسر ہوا۔

اس یادگار سفر کا تاثرِ قلم بند کرنے کا موقع اب ملا۔ اس میں آرام اور تفریح کی نہ طلب تھی نہ توقع۔ میرے لیے یہ ایک قربان گاہ کی زیارت تھی جہاں ابراہیمؑ اور عیسیٰؑ سے لے کر آج تک کا انسان

شکست وفتح سے بے نیاز کسی نصب العین کی خاطر اپنے کو قربان کیے جاتا ہے۔

تل ابیب کے مشرق میں لگ بھگ سو میل یروشلم ہے اور ان دونوں شہروں کے درمیان 'لود' نامی ایرپورٹ ہے۔ پیرس سے میں نے قصداً اسرائیل ایرلائن ال آل کے طیارہ سے سفر کیا۔ مگر یہ تجربہ کچھ خوش گوار ثابت نہ ہوا۔ ہم ابھی جنیوا ہی پہنچے تھے کہ طیارہ کو بم سے اڑانے کی دھمکی مشتہر ہوئی اور ہمیں ایک طولانی زمین دوز راستے سے نکال کر ایک دوسرے ہوائی جہاز میں بٹھا کر بلا اطلاع زیورخ پہنچا دیا گیا۔ ال آل کا خالی طیارہ وہاں لایا گیا جو کہ سب کو لے کر منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہوا۔ اقوام متحدہ کے نمائندے نے مجھے بلا دقّت ایرپورٹ سے نکال کر یروشلم کے نیشنل پیلس ہوٹل پہنچا دیا اور سرِ راہ سمجھا دیا کہ حالات حاضرہ پر کوئی تبصرہ نہ کرنا اور یہ نہ بھولنا کہ مقامی عربوں میں بہتیرے جاسوس ہیں۔ ہوٹل کے منتظم عرب تھے مگر اس میں مغربی سیاحوں کا ہجوم تھا اور اس کے دیوان خانے میں شام کو موشے وایان جیسے یہودی اکابر بھی پائے جاتے تھے۔

یروشلم کی جملہ آبادی تین لاکھ ہوگی اور اسے تین شہروں کا مجموعہ سمجھنا چاہیے۔ سب سے نئی آبادی یہودیوں کی ہے جو مغربی سرے پر بڑی تیزی سے اوندھے سیدھے گھر بنا رہے ہیں۔ یروشلم کے حسین اور تاریخی پس منظر میں یہ ایسے بدنما لگتے ہیں جیسے اطلس پر ٹاٹ کا پیوند۔ مغربی ملکوں نے اس بدنمائی پر بہت حرف زنی کی لیکن ناخلف اولاد بدچلن والدین کی بات کب سنتی ہے۔ پرانا عرب شہر پہاڑیوں کے دامن میں بسا ہوا ہے اور اس کے باغوں اور مکانوں میں ایک ناقابلِ فراموش کشش ہے۔ یہ ترکوں کے عہدِ حکومت میں بنا تھا اور اس کا طرزِ تعمیر استنبول اور قدیم قاہرہ کی یاد دلاتا ہے۔ اس کی نرم اور سبک ہوا میں ایک خاص کیفیت ہے اور گو ان دنوں یورپ میں گرمی تھی لیکن یہاں ہلکی سی خنکی تھی۔ اس سے ملا ہوا وہ فصیل بند تاریخی شہر ہے جسے مسلمان اور عیسائی بیت المقدس کہتے ہیں اور یہودی بیت اللہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہاں ہر ماہ وموسم میں دور دور سے زائرین اور سیاح جوق در جوق آتے ہیں۔

اس جگہ زمانے کی رفتار بظاہر رک گئی ہے، پرانے گھروں کے در و بام جنگِ صلیب سے لے کر اب تک جوں کے توں کھڑے ہیں۔ ہر سنگ ریزہ پر چشم بینا کو تاریخ کا نقشِ پا نظر آتا ہے۔ گلی کوچوں میں یہودی ربی، عیسائی راہب اور عرب درویش اپنے اپنے رسم ورواج پر کاربند نظر آتے

ہیں۔

گھنٹوں میں نے **حرم شریف** پر صرف کیے جہاں **صخریٰ** اور **مسجد اقصیٰ** ایک دوسرے کے مقابل کھڑے مسلمانوں کو عزم وعبرت کا درس دے رہے ہیں۔**خلیفہ عبدالولید** کے ذوق کی داد کس طرح دی جائے کہ **صخریٰ** جیسی شاندار عمارت کی نظیر دنیا میں بہت کم ملے گی۔ **حکومتِ اسرائیل** سیاحوں کو پرچانے کے لیے **صخریٰ** کا ذکر اسی انداز سے کرتی ہے جس طرح بھارت کی حکومت **تاج محل** کا۔

مسجد اقصیٰ کے اندر اس جگہ جانا منع ہے جہاں کچھ عرصے قبل منبر کو نذرِآتش کردیا گیا تھا۔ محافظوں نے کہا کہ ادھر مرمّت کا کام ہورہا ہے۔ یہاں احاطے کی پشت کے پاس جہاں فصیل گزرتی ہے وہاں **یہودیوں** کی '**دیوارِ گریہ**' ہے۔ان کے عقیدے کے مطابق یہ **حضرت سلیمانؑ** کی اس عبادت گاہ کے مہندم آثار میں سے ہے جسے دو ہزار قبل **رومنوں** نے مسمار کردیا تھا اور اس سانحے کے غم میں وہ آج بھی پسِ دیوار آہ وزاری کرتے ہیں۔ **ہیکلِ سلیمانی** کی تجدید کو وہ اپنا فرضِ عین تصور کرتے ہیں اور اس کے زمین دوز خزانوں کی تلاش میں وہ یہاں کھدائی کررہے ہیں۔**مسجد اقصیٰ** کو عرفِ عام میں **مسجد عمرؓ** بھی کہتے ہیں کیوں کہ فتحِ **یروشلم** کے بعد **حضرت عمرؓ** نے یہاں اس تصور کے تحت نماز ادا کی تھی کہ **آنحضرتؐ** اسی جگہ سے معراج کے لیے تشریف لے گئے تھے۔**صخریٰ** کے اندر صدر میں گھیرے کے اندر وہ چٹان ہے جس پر کھڑے ہوکر **حضرت ابراہیمؑ** نے **خدا** سے قربانی کا وعدہ کیا تھا۔

فصیل کے اندر دوسرے سرے پر وہ احاطہ ہے جہاں **حضرت عیسیٰؑ** کی خالی قبر اس مشہور **کلیسا** میں ہے جو **عیسائیوں** کی سب سے مقدس زیارت گاہ ہے۔اس **کلیسا** کی تعمیر کا کام پانچویں صدی عیسوی میں **مشرقی رومن سلطنت** کے **بانی شاہ قسطنطین** کی ماں کے حکم پر شروع ہوا تھا۔**کلیسا** کے چوبی پھاٹک کی چابی **سلطان صلاح الدین ایوبی** نے ایک **عرب** امیر کے سپرد کردی تھی اور اب تک اسی خاندان کے وارث کی تحویل میں موجود ہے۔ یہ بزرگ صبح شام پھاٹک کو کھولتے اور بند کرتے ہیں اور عصا لیے چوب داروں کے ساتھ نہایت مستعدی سے آنے جانے والوں کا محاسبہ کرتے ہیں۔ میرے سامنے انھوں نے دو **مغربی عورتوں** کو اندر جانے سے روک دیا کیوں کہ ان کی کمر کے اردگرد کوئی قابلِ ذکر پوشش نہ تھی۔اچھا ہوا کہ وہ **عربی** سے واقف نہ تھیں کیوں کہ موصوف نے انھیں قحبہ اور فاحشہ کے القاب سے یاد کیا، معلوم نہیں یہ الزام صحیح تھا یا غلط۔ جب میں اَھلاً وَسَھلاً کی تبریک کے

ساتھ ان سے بغل گیر ہوا، اور 'انا پاکستانی' کا مژدہ سنایا تو وہ بہت خوش ہوئے اور کان میں چپکے سے کہا: "تم جس گائڈ کے ساتھ ہو وہ جاسوس ہے اس سے ہوشیار رہنا۔"

جدید تحقیق کے مطابق حضرت عیسیٰؑ کے نیم جان اور بظاہر مردہ جسم کو ان کے حواری رات کے اندھیرے میں قبر سے نکال کر شہر سے باہر لے گئے اور انھیں صحت مند کرنے کے بہت جتن کیے لیکن جب حضرت عیسیٰؑ دراصل انتقال کر گئے تو ان کے جسدِ خاکی کو ایک گمنام باغ میں دفن کر دیا۔ وَاللّٰہُ أَعْلَم.

زائرین کے ساتھ میں بھی تاریخی کوچۂ غم میں زینہ بہ زینہ عیسیٰ کے نقشِ قدم پر چلا اور میں نے اپنی روح پر اُس صلیب کے بار کو محسوس کیا جو مظلوم انسانیت کے غم میں مدتوں سے اٹھائے پھرتا ہوں۔ اس صلیب کی گراں باری سے میرے منکر نکیر بھی گھبراتے ہیں تاہم اپنی چارہ جوئی کے لیے میں نے کسی حواری کو آواز نہیں دی:

تا کجا اماں یا بداز ہجوم جاں بازاں
گوشہ گیر فانوسی بہر سوختن تنہا

یروشلم سے مشرق کی طرف خشک پہاڑیوں، خوشنما بستیوں اور ویران میدانوں کا سلسلہ دریائے اردن تک چلا گیا ہے۔ وہاں سے اردن کی مملکت شروع ہوتی ہے۔ فلسطین کی تقسیم کے وقت ۱۹۴۸ء میں اس علاقے پر اردن کا قبضہ ہو گیا تھا جو ۱۹۶۷ء کی جنگ تک باقی رہا۔ غلبہ حاصل کرنے کے بعد اسرائیل نے یہاں کے لاکھوں باشندوں کو دریا پار کھدیڑ دیا اور یہودی ان کے مال پر قابض ہو گئے۔ جن عربوں سے ہوسکا وہ یہیں رک گئے اور ہمیں اندازہ ہوا کہ ان کی نبض سست پڑ گئی ہے۔ جا بجا اسرائیل کے فوجی مورچے اور نو وارد یہودیوں کے ٹھکانے نظر آتے ہیں۔ نبلس اور رملہ وغیرہ وغیرہ کئی چھوٹے چھوٹے شہر ہیں جن کی تنظیم اور ترتیب جنوبی یورپ کی یاد دلاتی ہے اور اسرائیل کے اس دعویٰ کی تردید کرتی ہے کہ اس کے وجود سے پہلے فلسطین ترقی وتہذیب سے بیگانہ تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ صلاحیت وحوصلہ مندی میں فلسطینی عرب یہودیوں سے کچھ کم نہیں اور اگر آزاد ملک میں ان کی شیرازہ بندی ہو جائے تو وہ دوسرے عرب ممالک کے رہبر بن سکتے ہیں۔

ہمارا اصل کام غزہ میں تھا جو یروشلم سے ۶۵ میل دور جنوب میں ہے۔ مقبوضہ علاقوں میں فوجی قانون نافذ ہے اور ان کا انتظام فوجیوں کے ہاتھ میں ہے۔ غزہ کی سڑک پر صرف سرکاری اور

فوجی موٹریں چلتی ہیں۔خاص اجازت نامے کے تحت ہم اقوامِ متحدہ کی موٹر میں چلے اس کے آگے مسلح یہودی سپاہی جیپ پر ہم رکاب تھے۔دائیں بائیں ہمیں کوئی آبادی نظر نہیں آئی۔البتہ درختوں کے جھنڈ اور باغوں کے نشان موجود تھے۔ہمارے ساتھ یروشلم میں مقیم جو غیر ملکی چلے تھے انھوں نے بتایا کہ یہ زرخیز خطہ پہلے آباد تھا،لیکن اس کے عرب باشندوں کو بھگا دیا گیا جواب غزہ کے اردگرد کیمپوں میں بے کسی کی زندگی گزار رہے ہیں۔دوربین سے دیکھا تو میدان میں مکانوں کے آثار نظر آئے،جنھیں بل ڈوزر سے ہموار کر دیا گیا تھا۔شام ہونے لگی تھی کہ غزہ میں داخل ہوئے۔ اس قدیم شہر کی آبادی ڈیڑھ لاکھ کے قریب ہے۔وہ سمندر کے کنارے ایک سرسبز وادی میں بسا ہوا ہے۔وادی کی جملہ آبادی پانچ لاکھ ہوگی جس میں کثیر آبادی مہاجرین کی ہے جو ۱۹۴۸ء کی جنگ کے بعد یہاں آ گئے تھے۔ ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد سے یہاں مسلسل شام سے صبح کا کرفیو لگا ہوا ہے۔ مقبوضہ فلسطین میں جنگِ آزادی کا سب سے اہم مرکز غزہ تھا۔ہر مہاجر کیمپ ایک طرح خود مختار قلعہ تھا جس کی پُر اسرار فضا میں چھاپہ ماروں کی تربیت ہوتی تھی اور ساتھ ساتھ بیکاری، مایوسی اور انتقام پروری کے ماحول میں ایک بے وطن نسل کی پرورش ہو رہی تھی۔

ظہورِ اسلام سے قبل عرب جن دیویوں کی پوجا کرتے تھے ان میں سے ایک کا نام غزہ تھا، جس سے اس جگہ کا نام عبارت ہے۔حجاز، مصر اور شام کے درمیان قافلوں کی آمد و رفت کا یہ مرکز تھا اور کسی زمانے میں اس کی خاص اہمیت تھی۔پھر اس پر زوال کا ایسا دور آیا کہ مدتوں کے لیے ایک چھوٹی سی بستی میں سمٹ آیا۔البتہ اسرائیل کے قیام کے بعد جب یہ مصر کے دائرۂ اختیار میں آیا تو اس کے دن پھرے۔ایک شہرِ نو کی تعمیر شروع ہوئی اور سڑکوں، اسکولوں، بازاروں کا سلسلہ دور تک چلا گیا۔ اسرائیل کے قبضے کے بعد شہر پر مردنی سی چھا گئی ہے۔

غزہ میں فقط ایک آرام دہ ہوٹل ساحلِ سمندر پر تھا جسے اب اسرائیل کے فوجی افسروں کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے۔وہاں سے ایک میل دور کسی ترک بیوہ ناہید ہادم کا مہمان خانہ تھا جس میں اقوام متحدہ کے کارکنوں کی رہایش کا انتظام تھا۔ستر سال کی عمر کے باوجود ناہید ہادم نہایت مستعد خاتون تھیں اور یہودیوں کو ترکی بہ ترکی سنانے سے باز نہ آتی تھیں۔ غزہ میں ان کی آدھی عمر گزر چکی تھی اور جب موقع ملتا وہ مجھے انگریزوں اور یہودیوں کی زیادتیوں کا آنکھوں دیکھا

حال سنایا کرتی تھیں۔ اپنے ہم کاروں کے ساتھ دس دن میں اُنہی کے ہوٹل میں مقیم رہا۔ ہمارا روزانہ معمول تھا کہ صبح سویرے اقوامِ متحدہ کے دفتر میں میٹنگ میں شرکت کے بعد تعلیم گاہوں کے معائنے پر نکل جاتے جہاں بارہویں جماعت کے امتحان ہو رہے تھے۔ دو بجے لوٹتے تو کھانے کے بعد جس کا جی جہاں چاہتا چلا جاتا۔ باقی لوگ تو عموماً نہانے کے لیے سمندر کا رُخ کرتے اور میں شہر کی طرف چل پڑتا کہ وہاں کی زندگی سے واقف ہونے کا یہی وقت تھا ورنہ کرفیوں کی وجہ سے سرِشام سب کا کاروبار بند ہو جاتا تھا۔

غزہ نے ہزاروں سال کی عمر پائی اور اس دوران کئی بار اجڑا، اور بسا۔ جو چند ایک تاریخی آثار بچ رہے وہ قابلِ ذکر ہیں۔ **شارع ھاشم** پر ایک چہار دیواری کے اندر زمانۂ قدیم کے ہیرو **سمسون** (Samson) کی قبر ہے جس کی فلم آپ سب نے دیکھی ہوگی۔ وہاں سے تھوڑی دور ایک مسجد کے صحن میں **رسول اللہؐ** کے دادا **حضرت ہاشم** کا مزار ہے۔ پرانے محلے کے ایک بوسیدہ مکان کو **امام شافعی** کا مسکن بتایا جاتا ہے۔ اس کے پاس **جامع مسجد** ہے جو کسی کلب کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ پہلے یہ **غزہ دیوی** کا مندر ہوگا کیوں کہ مسجد کی دیوار میں کہیں کہیں اس کی مورت باقی رہ گئی ہے۔ سڑکوں پر سخت فوجی پہرا تھا۔ ذرا ذرا دیر میں جیپ یا ٹرک پر مسلح سپاہی گردش کرتے نظر آتے تھے۔ ان میں کوئی کوئی صورت شکل میں **عرب** لگتا تھا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ **دروز فرقے** کے لوگ ہیں جو **فاطمی خلیفہ حکیم** کے پرستار ہیں اور کیوں کہ **اسمٰعیلی فرقے** سے بھی عقیدے میں دور ہیں اس لیے یہ نہیں معلوم کہ وہ مسلمان ہیں یا کچھ اور یہ **جنگِ صلیب** کے وقت انھوں نے عیسائیوں کی مدد کی تھی اور اب (کم از کم اس علاقے میں) **اسرائیل** کے ہم نوا ہیں۔ کیوں کہ یہ لوگ نسلی اور لسانی اعتبار سے **عرب** ہیں، **یہودی** ان سے خوب کام لیتے ہیں۔

شہر میں جگہ جگہ مکان توپ دم کر دیے گئے تھے۔ **یہودیوں** کو جب کسی **عرب** کو سزا دینا ہوتا ہے تو اس کے گھر پر بُل ڈوزر چلا دیتے ہیں۔ چنانچہ شہر کی حالت اس شکل کی سی ہوگئی ہے، جس پر چیچک کے داغ نکل آئے ہوں۔ کہیں کہیں سنیما یا بار کا نام نظر آتا تھا لیکن اس پر تالے پڑے ہوئے تھے۔ میں سمجھا کہ **اسرائیلی حکام** کی کارستانی ہے۔ لیکن **عربوں** نے بتایا کہ ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد انھوں نے خود ساری تفریح گاہوں کو بند کر دیا۔ جب کوئی قوم حیات و ممات کی جنگ میں مبتلا ہو تو اسے سیر

تماشے کی مہلت کہاں۔ میں نے غور کیا کہ کوئی عرب کسی یہودی سے مخاطب نہ ہوتا تھا۔ مسلسل ظلم وتشدد کے باوجود اس کا حوصلہ بلند اور ایمان راسخ تھا۔ میں نے اس جذبے کی کئی مثالیں دیکھیں۔

شارع ہاشم پر الزہرہ نامی زنانہ اسکول تھا جس میں کئی سو لڑکیاں امتحان دے رہی تھیں۔ عمارت کے ارد گرد چار دیواری تھی اور پھاٹک پر چند فوجی مشین گنیں لیے بیٹھے رہتے تھے۔ احاطے میں ترکوں کے زمانے کا چھوٹا سا بنگلہ تھا جس میں اسکول کے ناظم کا دفتر تھا۔ **نپولین بونا پارٹ** نے اٹھارہویں صدی کے آخر میں مصر کو فتح کیا تو **مرادبے** کا تعاقب کرتے ہوئے غزہ تک آیا اور چند روز اسی بنگلہ میں ٹھہرا۔ اس کے ایک کمرے میں بیٹھ کر میں کبھی نصاب کی تنقیح اور درسی کتابوں کی ورق گردانی کرتا، اور کبھی اسکول کے گشت پر نکل پڑتا جہاں طالبات بڑے انہماک سے پرچوں کا جواب لکھ رہی تھیں اتنے میں شور اٹھا کہ سپاہی احاطے میں گھس آئے ہیں۔ لڑکیوں نے برآمدے میں آکر انھیں بُرا بھلا کہنا شروع کیا اور امتحان دینے سے انکار کر دیا تاوقتیکہ وہ باہر نہ چلے جائیں۔ اسکول کے عرب ناظم سے میری خاصی ملاقات ہوگئی تھی۔ اس نے بتایا کہ گزشتہ سال انہی حالات میں فوجیوں نے لڑکیوں کو زدو کوب کیا تھا جس کی وجہ سے شہر میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ یہ سن کر میں نے **اسرائیلی انسپکٹر آف اسکول** کو فون کیا۔ وہ فوراً آیا اور عبرانی زبان میں فوجیوں کو کچھ نصیحت کی، جس کا اثر یہ ہوا کہ وہ احاطہ چھوڑ کر عمارت کی چھت پر چلے گئے۔

ہمارے دورانِ قیام غزہ میں روز دستی بم پھٹتے اور دو چار آدمیوں کے زخمی یا گرفتار ہونے کے واقعات ہوتے رہتے۔ وہاں کی زندگی کا یہ ہی معمول تھا۔

کبھی کبھی شام کو میں سمندر کے کنارے اقوامِ متحدہ کے کلب میں جا بیٹھتا تھا۔ **اسرائیلی تسلط** سے پہلے یہاں کی چھوٹی سی بندرگاہ میں خوب چہل پہل رہتی تھی۔ مصر کے سیکڑوں سیاح سیر کے لیے آتے تھے اور کشتیوں کا ہجوم ہوتا تھا لیکن اب کشتی رانی کی قطعاً ممانعت تھی اور ہر طرف ہُو کا عالم تھا۔ اندھیرا ہوتے ہی ہر شام کو ایک فوجی جیپ ٹریلر سے ریت کو ہموار کرنے لگتی تھی۔ اس حرکت کا مقصد یہ تھا کہ رات کو اگر کوئی سمندر سے ساحل پر اُترے تو ریت پر اس کے پاؤں کے نشان سے سراغ لگ سکے۔

کلب کے پاس کے ہوٹل میں **یہودی فوجیوں** کا جمگھٹ رہتا تھا۔ ایک شام انھوں نے

بندوق سے ٹریسر گولیاں داغنا شروع کیں جس سے تاریک فضا دور دور تک روشن ہوگئی۔ساتھ ہی ساتھ مشین گن چلانے لگے گو یہ چاند ماری کا وقت نہ تھا۔میرے جرمن ساتھی نے کہا کہ آج رات کوئی معرکہ ہونے والا ہے۔مناسب ہے کہ یہاں سے چل پڑیں۔چند سال سے وہ اقوامِ متحدہ کے پروگرام کے تحت غزہ میں ایک ٹیکینکل اسکول کا نگراں تھا اور یہاں کے نشیب وفراز سے خوب واقف تھا۔گولیوں کا رُخ شمال میں هبالیه کیمپ کی جانب تھا۔اس جرمن کے قیاس کے مطابق یهودی وہاں کے باشندوں کو کسی خطرے سے ہوشیار کر رہے تھے۔یہ گمان صحیح ثابت ہوا کیوں کہ آدھی رات کے بعد بموں اور گولیوں کے مسلسل شور نے ہوٹل میں ہمیں سوتے سے جگا دیا۔یہ معرکہ صبح تک جاری رہا۔اس کی تفصیل اس وقت معلوم ہوئی جب ایک اسپتال کے سامنے ہم نے لوگوں کی بھیڑ دیکھی۔معلوم ہوا کہ چند چھاپہ ماروں نے اپنے دو رفیقوں کو ایک ویران عمارت میں چھپا رکھا تھا۔پچھلے دن جب اسرائیلی فوجیوں کو خبر ملی تو انھوں نے مکان کو گھیر لیا اور چھاپہ ماروں کو ڈرا دھمکا کر خودسپردگی کا مطالبہ کرتے رہے۔جب وہ نہ مانے تو رات کو عمارت پر حملہ ہوا،اور گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ان میں سے کچھ شہید اور زخمی ہوئے باقی اندھیرے میں فرار ہوگئے۔ہمیں یہ نہ معلوم ہوسکا کہ کتنے یهودی مارے گئے۔ایک مفرور چھاپہ مار نوجوان کو میں نے کسی تعلیم گاہ میں معائنہ کے وقت دیکھا۔ایک کمرہ باہر سے بند تھا،لیکن اندر کسی کی جھلک نظر آئی۔ایک ہفتہ کی مدت میں،میں غزہ کے عربوں میں مقبول ہو چکا تھا کیوں کہ انھیں میری ہمدردی کا یقین تھا چنانچہ اسکول کے ایک عرب نے رازدارانہ بتایا کہ رات کے معرکہ میں اس نوجوان کا بھائی شہید ہوگیا اور اس نے بھاگ کر یہاں پناہ لی ہے۔اس نو عمر مجاہد کا زخمی ہاتھ پٹی میں بندھا ہوا میز پر ٹکا ہوا تھا اور وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے خلا میں کسی کو ڈھونڈ رہا تھا۔میری سمجھ میں نہ آیا کہ اسے کس طرح دلاسا دوں۔

غزہ کی جیل میں تقریباً ڈیڑھ سو طلبہ اور طالبات کے امتحان کا مرکز قایم کیا گیا تھا۔یوں تو مقبوضہ علاقوں کے اسکولوں میں مدرسوں، کتابوں اور سائنٹفک تجربہ گاہوں کا عام فقدان تھا،تو پھر جیل میں یہ سامان کون مہیا کرتا۔ان میں سیاسی الزام میں سزا یافتہ طالب علم بھی تھے اور نظر بند بھی۔ان سب کی اخلاقی جرأت سبق آموز تھی لیکن وہ لڑکی مجھے کبھی نہ بھولے گی جسے چھاپہ ماروں کی کمک کی پاداش میں طویل قید کی سزا دی گئی تھی اور اب تک ایک تنگ کوٹھری میں تنہا امتحان دے رہی تھی۔میرا مقصد مقبوضہ

علاقوں کے چشم دید حالات بیان کرنا ہے، **حکومت اسرائیل** کے مظالم کی فہرست گنوانا نہیں۔ اس کے لیے **اقوام متحدہ** کی اس خصوصی کمیٹی کی رپورٹ سے رجوع کرنا چاہیے۔ جو **نیو یارک** سے وقتاً فوقتاً شایع ہوتی رہتی ہے۔ **فلسطینی عربوں** پر **اسرائیل** کے مظالم کی خونیں داستان یہ کمیٹی سالہا سال سے مرتب کرہی ہے، البتہ اس کا ذکر کم سنا جاتا ہے۔

غزہ میں اپنا کام ختم کر کے ہم واپسی کی تیاری کررہے تھے کہ یک بہ یک **اسرائیلی فوجیوں** نے **مہاجر کیمپوں** کے اندر زبردستی سڑکیں بنانے کی مہم شروع کردی۔ اس طرح **اقوام متحدہ** کے فیصلوں کی خلاف ورزی کر کے **کیمپوں** کے انہدام اور مہاجروں کی جمعیت کے انتشار کی کارروائی کی ابتدا ہوئی۔ حالیہ اطلاعات سے معلوم ہوتا ہے کہ **وادیِ غزہ** کی زرخیز زمینوں پر **نووارد یہودی** قابض ہونے لگے ہیں۔

مجھے **غزہ** کے **جنوب** میں سو میل تک جانے کا اتفاق ہوا جہاں **دشتِ سینا** کا ڈانڈا ملتا ہے اور اس کے آگے کسی غیر فوجی کو جانے کی اجازت نہیں۔ میں نے **سرِ طور** کوئی برق لہراتی نہ دیکھی صرف لن ترانی کی صدائے بازگشت سنی۔

روانگی سے پہلے ایک مقامی مخلص نے ظہر کے وقت میری الوداعی دعوت کی جس میں ان کے چند رفیق شریک تھے۔ تعارف کے بغیر میں سمجھ گیا کہ وہ مجاہدوں کی خفیہ تنظیم کے ارکان ہیں۔ چھوٹتے ہی انھوں نے **مشرقی پاکستان** کی بغاوت کا ذکر چھیڑا۔ اس سلسلے میں ان کی معلومات یک طرفہ تھیں اور **پاکستان** سے ہمدردی کے باوجود ان پر **ہندوستانی پروپیگنڈہ** کا اثر واضح تھا۔ ایک مشکل یہ تھی کہ اس وقت **اردن** کے **شاہ حسین** سے **اہلِ فلسطین** کو سخت نفرت تھی اور **جنرل یحییٰ خاں** کی حکومت سے موصوف کے خاص تعلقات تھے۔ ان کے سوالوں کے جواب میں، میں **پاکستانی عوام** کے جذبات کی ترجمانی کرسکا۔ حاکموں کی مصلحتوں کا جواب میرے پاس نہ تھا۔ اس کے بعد **فلسطین** کا ذکر چھیڑا تو بات **اول جنگِ عظیم** سے شروع ہوئی۔ **عیسائی سامراج** اور **یہودی سرمایہ** کے اتحاد پر مجھے **علامہ اقبال** کے چند شعر یاد آگئے جن کے ترجمے نے انھیں بہت محظوظ کیا:

تاریک ہے افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے
یہ وادیِ ایمن نہیں شایانِ تجلی

ہے نزع کی حالت میں یہ تہذیبِ جواں مرگ
شاید ہوں کلیسا کے یہودی متوّلی
تاک میں بیٹھے ہیں مدّت سے یہودی سُود خوار
جن کی روباہی کے آگے ہیچ ہے زورِ پلنگ
خود بخود گرنے کو ہے پکّے ہوئے پھل کی طرح
دیکھیے پڑتا ہے آخر کس کی جھولی میں فرنگ

فلسطین کے عربوں کو مخاطب کر کے **اقبال** نے کہا تھا:

زمانہ اب بھی نہیں جس کے سوز سے فارغ
میں جانتا ہوں وہ آتش ترے وجود میں ہے
تری دوانہ جنیوا میں ہے نہ لندن میں
فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے
سنا ہے میں نے غلامی سے امتوں کی نجات
خودی کی پرورش و لذتِ نمود میں ہے

ہمارے میزبان نے کہا کہ یہ اشعار چالیس سال پہلے ارشاد ہوئے تھے اور ان کی دونوں پیش گوئیاں صحیح ثابت ہوئیں۔ **مغربی ممالک** میں صنعتی کثافت نے ایسی افراتفری پیدا کردی ہے کہ یہ مسئلہ ان کے سلجھائے نہیں سلجھتا۔ علاوہ بریں **پاپائے اعظم** نے فتویٰ دے دیا کہ **حضرت عیسیٰ** کی شہادت کی ذمہ داری **یہودیوں** پر نہیں، کالے چوروں پر ہے تو گویا **یہودی کلیسا** کے متولّی ہوگئے یعنی دو ہزار سال تک **یہودی** کو **عیسائی** جس جرم کی سزا دے رہے تھے وہ بے بنیاد تھا۔ اب اس غلطی کا کفارہ ادا کرنے کے لیے وہ **عربوں** کے استحصال میں **یہودیوں** کا ہاتھ بٹا رہے ہیں۔ اس تبصرے پر ایک صاحب نے انتباہ کیا کہ **مغربی مدبروں** کی فراست کی داد دیجیے کہ **یہودیوں** کے سینے میں دو ہزار سال سے جو آتشِ انتقام سلگ رہی تھی اس کا رُخ یکبارگی **عربوں** کی طرف کر دیا جنھوں نے ان سے ہمیشہ رواداری کا سلوک کیا تھا۔

رخصت کے وقت میرا دل غزہ کے **عربوں** کے لیے احترام سے لبریز تھا۔ ایک لحاظ سے وہ

سامراج سے نبرد آزما تھے اور دوسرے لحاظ سے وہ جنگِ صلیب کے دورِ جدید میں ہراول دستے تھے۔

واپسی پر ہمیں موٹر سے دوپہر کو تل ابیب پہنچا دیا گیا تاکہ رات کو لود کے ایرپورٹ پہنچنے میں آسانی ہو۔

اس شہر کی داغ بیل سمندر کنارے سپاٹ میدان میں ۶۵ سال پہلے رکھی گئی تھی اور اب اس کا حلیہ امریکن شہروں سے ملنے لگا ہے۔ یہاں کسی عرب کو رہنے کی اجازت نہیں اور غیر یورپین یہودی بھی خاکروب، موچی اور چپراسی کے بھیس میں نظر آتے ہیں۔ گرانی کا حال نہ پوچھیے۔ ہوٹل میں کمرے کا کرایہ تیس ڈالر تھا۔ جس میں جملہ آسایش کے علاوہ دیوار میں ایک خفیہ مائیکروفون بھی نصب تھا۔ مسافروں کو تحریری تاکید کی گئی تھی کہ سڑک کی طرف کھڑکی نہ کھولیں ورنہ جان و مال کی خیر نہیں۔

سڑکوں پر گہما گہمی اور دکانوں میں سامان کی فراوانی تھی۔ ایک تو یہودی تجارت میں یوں ہی کائیاں ہوتے ہیں اور پھر مغربی ملکوں سے چندے کی ایسی موٹی رقم وصول ہوتی ہے کہ وارے نیارے ہیں۔ دورِ حاضر کی یہ واحد مثال ہے کہ ایک قوم سمندر پار کر کے دوسرے ملک پر قبضہ کر لے، اس کے باشندوں کو مار کر نکال دے اور ان کا مال اسباب چھین لے۔ اس کے صلے میں اس پر انعام و اکرام کی بارش ہوتی ہے حتیٰ کہ مغربی جرمنی سے تاوان بھی وصول ہوتا ہے۔ ملک بدر عربوں سے خفگی کا اظہار ہوتا ہے کہ وہ اس صورتِ حال کو صبر و شکر سے قبول کیوں نہیں کرتے۔

شہر کو ادھر ادھر سے دیکھا تو نئے پن کے سوا کوئی بات قابلِ ذکر نظر نہ آئی۔ جی چاہا کہ حیفہ میں بہاءاللہ کی قبر بھی دیکھ آؤں لیکن وار نہ بیٹھا کیوں کہ یہاں اسرائیل کا بحری اڈہ ہے۔

رات کو سونے کا وقت نہ ملا کیوں کہ صبح سویرے ایرپورٹ پہنچنے کے لیے ہوٹل سے دو بجے چل پڑنا تھا۔ اس کے پُر شکوہ دیوان خانہ میں یہودی سیٹھوں کی بھیڑ تھی اور اس کی رقص گاہ طرب و نشاط سے گونج رہی تھی۔ میرے لیے یہ دور کا جلوہ تھا۔ میرا دل اپنے دور افتادہ ملک کے غم میں ڈوبا ہوا تھا، جو اِن دنوں خانہ جنگی کی آماج گاہ بنا ہوا تھا اور اس غم میں وہ رنج بھی سمویا ہوا تھا جو غزہ کے سفر میں مجھے ودیعت ہوا تھا۔

آج بھی فلسطین اس صلیب کا بار اٹھائے ہوئے ہے جس کی گرانی نے عیسیٰ کو شہادت کا مرتبہ عطا کیا تھا۔ (جاری)

فہرست مراجعین

پروفیسر انور پاشا
(جے این یو)

پروفیسر عبدالحلیم
(جامعہ ملیہ اسلامیہ)

پروفیسر آفتاب احمد آفاقی
(بی ایچ یو، بنارس)

پروفیسر حامد علی خاں
(مظفر پور)

پروفیسر اسلم جمشید پوری
(میرٹھ یونیورسٹی)

پروفیسر ارشد مسعود ہاشمی
(چھپرہ یونیورسٹی)

پروفیسر ابوبکر رضوی
(پاٹلی پترا یونیورسٹی، پٹنہ)

پروفیسر شہاب ظفر اعظمی
(پٹنہ یونیورسٹی)

ڈاکٹر شاہ عالم
(جامعہ ملیہ اسلامیہ)

ڈاکٹر مشتاق صدف
(اے ایم یو علی گڑھ)

ڈاکٹر معید الرحمٰن
(اے ایم یو علی گڑھ)

ڈاکٹر خالد مبشر
(جامعہ ملیہ اسلامیہ)